جلد (۹) اپریل ۱۹۱۵ء نمبر (۱)

تمدن

رجسٹرڈ ایل ۲ نمبر (۸۵۸) ب

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹرز۔ شیخ محمد اکرام بیرسٹرایٹ لا۔ محمد عبدالراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبدالرافع الخیری

قیمت سالانہ قسم اول ۴؎ — تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا — قیمت فی پرچہ ۶؎

کالیخاں پریس

عصمت
دہلی

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین
کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کنواری لڑکیوں
کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت
ان کو بتائیگا کہ کنوار پنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت
بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت انکا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کیلئے
انہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے ساس نند اور
کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پر لطف
با اطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں وہ بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری
گھر کا حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے
عصمت ان کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے فکری سے خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی
گئی ہے جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کیے ہیں ان کی ذمہ داریاں انہیں کیا کیا ہیں کیا طریقہ ہیں جن
سے وہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ وہ عمر رسیدہ ماؤں
کو وہ مائیں دیں گے عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے
خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کی سچ مچ کی بیگم بنائے گا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا
فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بٹھانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عصمت
کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر ماہ میں (۴۸) صفحہ کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں سالانہ قیمت عہ

منیجر عصمت، و تمدن، دہلی

قبل از تمدن

انسان کے دشمن

"میمتھ" ایک خوفناک وحشی درندہ تھا، جو بہت قدیم زمانے میں روئے زمین پر موجود تھا، مگر اب اُسکی نسل دنیا سے ملیامیٹ ہوگئی ہے اُس کا پنجر زمین کے نہایت گہرے طبقات میں پایا جاتا ہے اور علمار ارضیات نے اُسکو زمین کے جوف سے نکالکر عجائب خانوں میں رکھا ہے۔

اب سے پچاس ہزار سال پہلے یہ درندہ شمال یورپ کی دلدلی زمینوں میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔ اسکے جسم پر لمبے لمبے بال تھے۔ دانت بڑے بڑے اور نہایت تیز تھے۔ ہاتھی کی طرح ایک سونڈ آگے نکلتی تھی اُس میں بلا کی طاقت تھی۔ یہ خوفناک وحشی درندہ جب اپنے شکار پر حملہ کرتا تھا، تو اُس کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی۔

دم بھر کے لئے اُس زمانے کی تصویر آنکھوں کے سامنے لاؤ! جبکہ

اِن خوفناک درندوں کے غول سطح زمین پر پھرا کرتے تھے۔ وہ دیکھو سامنے ایک جھیل ہے، جس میں ایک وحشی انسان کمر کمر تک پانی میں کھڑا ہے۔ اُسکے سلمبے سُرخ بال کمر تک لٹک رہے ہیں۔ اُسکے موٹے موٹے ہونٹ غصّے سے ہل رہے ہیں۔ آنکھیں سُرخ ہوگئی ہیں۔ وہ دیکھو دانت کو ستا ہے اور دایاں ہاتھ بائیں کندھے پر بار بار مارتا ہے۔

یہ کیوں؟

یہ اسلئے کہ جھیل کی سطح پر مچھروں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ وہ بار بار اُسکے کندھوں اور جسم کے دیگر حصّوں پر بیٹھتے اور کاٹتے ہیں جب کوئی مچھر اُسکا ہاتھ پا جاتا ہے [illegible] تاک کر ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے کہ مچھر فوراً مر جاتا ہے۔

اگر تم حقیقت میں اُس زمانے میں ہوتے اور اُس زمانے کے سُرخ بالوں والے انسان اور خوفناک میمتھ اور مچھروں کو دیکھتے، تو اس انسان سے خطاب کرکے ضرور یہ کہتے:۔

"میرے دوست! تم مچھر کو بہت آسانی سے مار سکتے ہو اور شاید کسی زمانے میں مچھروں کی نسل کو دنیا سے غارت کر دوگے۔ مگر خوفناک میمتھ کے پنجے سے نجات پانا مشکل ہے۔ اُسپر غالب آنا دشوار ہے۔ اگر تم نے فتح پائی بھی، تو اس کے سلئے ہزاروں سال درکار ہیں۔

مگر تم حیران ہوگے اور دیکھو گے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں تھا جو بات تم نے اُس زمانے کے وحشی انسان سے کہی تھی، وہ غلط تھی۔ میمتھ کی نسل دنیا سے معدوم ہوگئی اب ایک میمتھ بھی روئے زمین پر نہیں پایا جاتا۔ میمتھ کی طرح اُس زمانے میں اور بھی بہت سے خوفناک درندے تھے۔ اُن کی نسلیں

بھی غارت ہوگئیں۔ تند اور خونخوار تیند وے جو یورپ کے شمال میں پھرا کرتے تھے، اب ناپید ہوگئے۔ بھیڑیوں کے غول کے غول تھے، جو برفانی منطقے سے نیچے تمام جنگلوں میں گھوما کرتے تھے۔ اب اُنکا نام ونشان بھی نہیں رہا؟ مگر مچھر بدستور موجود ہیں۔ وہ اُسی جوش وخروش کے ساتھ یورپ کی دلدلی زمینوں پر حکمراں ہیں۔ اُنکی نسلیں بیشمار ہیں۔ اُنکی فوجیں نہایت آزادی سے جھیلوں کے کناروں اور درختوں کے جھنڈ میں پر منڈلاتی پھرتی ہیں۔

یہی مچھر ہیں، جو وبائی بخار اور زرد بخار اور طاعون کے زہریلے مادوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے ہیں اور اُن کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل کرتے ہیں۔ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انسان اُن تمام خوفناک درندوں پر غالب آگیا۔ جو کسی زمانے میں روئے زمین کے بہت بڑے حصے پر مسلط تھے۔ مگر وہ مچھر جیسی کمزور مخلوق کے مقابلے سے عاجز ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عقل انسانی اکثر بڑی بڑی پیچیدہ مشکلوں کو حل کرڈالتی ہے، مگر بعض چھوٹی چھوٹی مشکلوں کو حل کرنے سے عاجز رہتی ہے؟

ایک زمانہ ضرور ایسا آئے گا کہ ہم مچھروں، بھڑوں، مکھیوں اور تمام چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں کو ہلاک کرڈالیں گے اور اُنکی نسلوں کو روئے زمین سے ملیامیٹ کردینگے، پھر اُن موذی جانوروں کے قتل کرنے کے بعد، جو آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں، ہم اُن ظالم جانوروں کے ہلاک کے درپے ہونگے، جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے! مگر انسان کو سب سے زیادہ تکلیف اُنھیں سے پہنچتی ہے۔

بڑے بڑے خوفناک درندوں کو ہلاک کرنے کی کوشش ہماری پہلی جنگ تھی۔ اب دوسری جنگ اُن چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں سے

ہونے والی ہے، جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں۔ پھر تیسری جنگ اُن خوردبینی جانوروں سے ہوگی، جو چپ چاپ ہمارے خون میں اتر جاتے ہیں اور ہماری زندگی کو غارت کر ڈالتے ہیں، یہ دو جنگیں بہت سخت ہونگی اور انکے لئے زمانہ دراز درکار ہوگا۔ مگر کامیابی بنی آدم کے لئے یقینی ہے۔

اسکے بعد ذرا اُن جنگوں کا تصور کرو جو ہم کو بڑے بڑے جرائم سے کرنی پڑتی ہیں۔ اخلاق کے لحاظ سے ہم ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہیں۔ قتل اور زنا اور چوری اور ڈاکہ زنی ایسے جرائم ہیں جن کا ارتکاب برابر ہوتا رہتا ہے۔ ہم ان خوفناک جرائم سے اسی طرح جنگ کر رہے ہیں، جس طرح قدیم زمانے کے انسان چیتے وغیرہ جو خوفناک اور وحشی درندوں سے جنگ کرتے تھے۔ عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ یہ بڑے بڑے انسانی جرائم معدوم ہو جائینگے۔ نہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرینگے۔ نہ عورتوں کی عفت وعصمت پر حملہ کیا جائے گا۔ نہ گھروں میں چوری ہوا کرے گی۔ نہ رہزنی اور ڈاکے کے ہولناک منظر دکھائی دینگے۔ اُس وقت کا انتظام تمدن مکمل ہوگا اسلئے نہ چوری اور ڈاکے کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ قتل و زنا کی۔

مگر اسکے بعد ہی فوراً ہم اُن برائیوں سے جنگ کرنے پر کمربستہ ہونگے جو ظاہر میں نہایت حقیر اور چھوٹی نظر آتی ہیں، تاہم اُن سے خطرے بہت ہیں، مثلاً ریاکاری، غرور، حسد، تعصب وغیرہ۔

یہ اخلاقی جنگ پہلی اخلاقی جنگ سے بہت زیادہ سخت اور طویل ہوگی، مگر اُمید کامل ہے کہ جس طرح ہم چھوٹے چھوٹے موذی جانوروں پر ایک دن غالب آئیں گے، اُسی طرح اِن چھوٹی خطرناک برائیوں پر بھی ضرور فتحیاب ہونگے۔

وحیدالدین سلیم

لنڈن میں پرندوں کی نمایش

اس نمایش میں چار سو اکیس فرات کے مرغ یا مرغیاں تھیں اور کل مرغ یا مرغیاں ملا کر ۴۷۸۰ تھیں۔ اِسی طرح زیادہ قیمتی مرغ یا مرغی اس میں دو ہزار پونڈ یعنی تیس ہزار روپے کی تھی اس سے کم قیمت کی تو سینکڑوں تھیں۔ مگر دو پونڈ یعنی تیس روپیہ سے کم کوئی چڑیا نہیں تھی۔

ہمارے غریب ملک کے رہنے والے تیس ہزار روپیہ ایک مرغ کی قیمت سنکر بہت تعجب کرینگے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک مہربان نے ایک بٹیر کو لکھنؤ میں مبلغ ۵۰ روپیہ کو بیچا تھا تو لوگ سننے والے پر ہنستے تھے کہ آخر اس بٹیر میں کیا صفت ہے جو اتنے روپے دیئے جائینگے۔ کیا یہ روز موتی اُگلیگا۔ مگر یہ سب دولت کے کھیل اور ہر جنس کی قدر افزائی کے شوق کے کرشمے ہیں کہ یہ مرغ اور مرغیاں نہ تو موتی اُگلتی ہیں اور نہ سونے کا انڈا دیتی ہیں (جیسا بچپن میں کہانیوں میں سنا کرتے تھے) لیکن اُن میں ایسی صنعتیں ہیں جن سے اتنی قیمت مانگی جاتی ہے اور شوقین لوگ دیتے ہیں۔ اس نمائش کے چند مرغوں کی حالت لکھتا ہوں۔

نمبر ۴۶۶ نر ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا سپید چتیاں زیادہ ڈیڑھ گز لمبا ہے (سر سے لیکر پنجوں تک) وزن ۷ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۴۷۹ مادہ ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا سپید چتیاں زیادہ ہیں۔ وزن ۳ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۵۰۲ مادہ۔ سرخی مایل۔ وزن ساڑھے پانچ سیر (ایک برس سے بڑی) قیمت ۲۵۰ پونڈ۔ میرے سامنے ایک بڈھی سو پونڈ دیتی تھی۔ مگر مالک نے نہیں بیچا۔

نمبر ۵۷۹ نر سپید بے داغ (جیسا کہ اکثر پیرزادے تذرو وغیرہ کے لیے

تلاش کیا کرتے تھے۔ قد اور وزن معمولی۔ قیمت ۲۰۰ پونڈ۔

جزائر سماٹرا کے بھی مرغ موجود تھے۔ جن کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی

جاپان کی مرغیاں بھی تھیں۔ اُن میں ایک خاص صنعت یہ تھی کہ دُم کے پر سمیٹ لیتی تھیں۔ قیمت ۵ پونڈ ۵ شلنگ تھی۔

ہمارے ہندوستان کے بھی مرغ تھے۔ جنکی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی (ہم کو اس بات سے یہ سبق ملتا ہے کہ وُہی چیزیں جن کی ہم اپنے ہاں قدر نہیں کرتے ہیں۔ اُنکو لوگ یہاں لاکر تھوڑی سی محنت اور توجہ کے ذریعہ سے قدر کے قابل بنا لیتے ہیں)

ملایا کے مرغوں کی قیمت سب سے زیادہ ۲۰۰۰ پونڈ تھی۔ اور وزن میں سب سے زیادہ بھاری مرغ نمائش بھر میں وُہیں کا تھا جسکی تفصیل وزن وغیرہ ذیل میں درج ہے۔

نمبر ۳۲۱۳ نر مرغ۔ ۲ گز لمبا۔ وزن ۷ سیر قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

ہسپانیہ کے مرغ کی سب سے زیادہ قیمت پچاس پونڈ تھی۔

بط سب سے زیادہ قیمتی ہندوستان کی تھی۔ جسکی قیمت ایک سو پونڈ تھی اور جو سفید بیداغ تھی۔ معمولی قد۔ کوئی اور صفت بظاہر اس میں نہیں معلوم ہوتی تھی۔ علاوہ ان کے اور عجیب عجیب مرغ اور مرغیاں تھیں۔ گو اُن کی قیمت کچھ ایسی زیادہ اِن قیمتوں کے مقابلے میں نہیں تھی یعنی سو پونڈ سے لیکر پانچ یا چھ پونڈ تک تھیں۔ سفید مرغی کی ایک قسم تھی جس کے سر پر گوشت کا لبس مگر وُہ لبس بالکل پگڑی کی طرح کا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے طول کی پگڑی باندھ دی ہے ایک چھوٹی مرغی تھی۔ وزن بھی آدھ سیر اندر۔ بالکل تیتر کا رنگ تیتر ہی معلوم ہوتی تھی چند مرغ اور مرغیوں کی حلق پھولے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا کہ گھینگا نکل آیا ہے۔

اب کبوتروں کا حال سُنیں:۔

سب سے قیمتی کبوتر نمائش میں ۵۰۰ پونڈ کا تھا۔
نمائش میں کل ۱۵۵ ذات کے کبوتر تھے (ہمارے ہندوستان میں اس سے زیادہ اقسام کے کبوتر نکلینگے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی قسم میں یکتا ہوگا) تعداد میں ۴۷ اہم کبوتر تھے

نمبر ۳۔ ایک سال کا پٹھا ۲۰ انچ لمبا۔ پاموز۔ دوباز۔ آگے کا پوٹا پھولا ہوا ذات کا لقا نہیں ہے یعنی وہ خود نہیں تنتا ہے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کبوتر کے گھینگا نکل آتا ہو پوٹا اس قدر پھولا ہوا ہے۔ کہ آگے سے منہ نہیں دکھائی دیتا ہے۔ قیمت ۵۰۰ پونڈ (اس قسم کے کبوتر ہندوستان میں نہیں دیکھے)

نمبر ۲۔ صندلی نر سنہ ۱۹۰۷ع کا پٹھا۔ پوٹا اتنا بڑا ہے کہ آگے سے سر نہیں دکھائی دیتا۔ اس کا پوٹا سب سے زیادہ پھولا ہوا ہے۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ

نمبر ۱۹۰۔ سپید بے داغ لقا۔ اس قدر تنتا ہے کہ اس کے سینے پر یمو کھدر اور نہ گرے (جو کہ خاص لقا کی صفت ہے) حالانکہ پر نہیں کٹے ہیں۔ ورنہ شاید بعض وقت الٹ جاتا۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔

نمبر ۲۱۲۔ مادہ۔ سپید بے داغ لقا۔ بجائے اس کے کہ یہ کبوتری تنتی ہو اسکی دُم بہت اُٹھی ہوئی ہے۔ بالکل چھتری کی طرح سے سر پر پھیلی رہتی ہے۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔ اس کے علاوہ دوسرے رنگوں کے کبوتر موجود تھے مثلاً۔ ہرے زاغ۔ کھیارے۔ صندلی۔ کاسنی۔ مُکھی۔ سیاہ دوباز۔ موتی چور۔ چوٹی دار وغیرہ چوٹی دار کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی۔

نمبر ۲۴۸۔ کھیارا کیسی آنکھوں پر۔ خوردنکا۔ چونچ بالکل معلوم ہی نہیں ہوتی ہے۔ چونچ پر کھال کا بہت بڑا گچھا ہے۔ قیمت ۲۵۰ پونڈ۔

نمبر ۵۰۰۔ سپید بے داغ۔ موتی چور۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔

ایک ذات کی کبوتری لقا بھی تھی جسکو یہاں اُلو کہتے ہیں۔ وہ خوردنکی ہوتی ہے۔

آنکھ کے پپوٹے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ صورت میں اُلّو سے بہت مشابہ ہوتے ہیں سب سے زیادہ قیمتی ۱۰۰ پونڈ۔

جرمن کے بھی کچھ کبوتر نمائش میں تھے۔ مگر افسوس ہمارے ہندوستان کے کبوتر نہیں تھے۔ حالانکہ ہندوستان میں اس وقت بھی بہت نایاب کبوتر پائے جاتے ہیں۔ ایک خاص قسم جسکو میں یہاں نہیں پاتا ہوں۔ نہ کہیں نمائش میں دکھائی پڑی۔ ہمارے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ وہ لوٹن کبوتر ہیں جنکی میں خیال کرتا ہوں کہ یہاں بہت قدر ہوتی کیونکہ ہمارے یہاں کے اُڑان کے کبوتر اور گرہ باز کی تو یہاں قدر ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر لوٹن تو ایسی چیز ہے جو ہمیں کے واسطے پیدا کیا تھا۔ جو لوگ کبوتروں کا تماشہ آسمان پر دیکھنے سے محروم ہیں وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر تماشا دیکھ لیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے اچھے لوٹن کبوتر یہاں بھیجے جائیں تو شاید اُن کی قیمت ۵۰۰ پونڈ سے زیادہ ملے۔ اور پھر قلمی لوٹن کی اور بھی زیادہ قدر ہو۔

گو یہ نمائش پرندوں کے لئے تھی۔ تاہم ایک گوشے میں کچھ چوہے اور خرگوش بھی دکھا دیئے گئے تھے۔ ہر رنگ کے چوہے موجود تھے۔ سفید، سیاہ صندلی، کاسنی، خاکی۔ اور ہر قد کے چھوٹے بڑے مچھوسے۔ اس میں خرگوش بھی ہر ذات کے موجود تھے۔ ایک قسم خرگوش کی تھی جس کے چار کان تھے۔

یہ گراں قیمتیں جو ان مختلف جانوروں کی لکھی گئیں۔ یہ محض چڑیوں کی نہیں تھیں بلکہ انکے رکھنے والے اپنی محنت اور نگہداشت کی قیمت بھی لیتے ہیں۔ ان لوگوں سے دریافت کیجئے تو ہر چڑیا کا نسب نامہ اُنکے پاس لکھا ہوا ہے کہ کس طرح سے اُن کی ماں اور باپ کی حفاظت کی گئی ہے۔ وہ یہ بھی بتلائینگے کہ اُن کو کیا کھانا دیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو اس ملک کے تمول کے ساتھ مدنظر رکھکر قیمتوں کی یہ گرانی اُٹھانے کی قابلیت رکھتی ہے۔

رضی الدین احمد (لندن)

ساحل جمن اور ہندو مذہب کی شعریت

یہ مضمون حقیقت میں ایک خط ہے جو مسٹر عبدالرؤف نے اپنے ایک دوست کو کنار جمن کی سیر کے بعد لکھا تھا ہم خوش ہیں کہ وہ ناظرین تمدن کے لئے باعث دلچسپی ہوگا اس سے زیادہ خوشی مجکو اس بات کی ہے کہ مسٹر موصوف،، جو جذبات حسن و عشق کی ہمیشہ تحقیر کیا کرتے تھے" وہی ایک انجام میں سرشار ہو گئے اور انکی پارسائی پر قیامت آگئی دیکھئے آیندہ زمانہ ان کو فلاسفر کرتا ہے یا شاعر اور رند شاہد باز۔

اول تو صبح کا سہانا وقت اور اسکی ٹھنڈی ہوا میں یونہی سینکڑوں رنگینیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہیں جس کے لئے مزید دلفریبیوں کی ضرورت نہیں، ایک سلیم المذاق وجود کی سرشاریت اور کیف پروری کے لئے یہی کافی ہے کہ اسکو صبح دریا کے کسی ساحل پر ہو لیکن اس صبح کا کیا پوچھنا جسکو حسن نسوانی وگلہائے پرستش کی نکہت باریاں معطر کر رہی ہوں۔

یہ رسم کہ صبح اٹھکے حسن کی دیویاں اپنے ہاتھوں میں سامان پرستش لئے دریا کنارے جاتی ہیں خوب ہے، وہ جیسے پانی کے کنارے پہونچتی ہیں اور پانی انکے انتظار میں بیچین ہوتا ہے، اس میں کچھ پھول، نہیں پھولوں کی کچھ پنکھڑیاں ڈالتی ہیں۔ ایک عجیب پر کیف عالم ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ سارا قطرہ قطرہ اسکی پذیرائی کے لئے مستعد و آمادہ ہے پانی کی ایک ایک لہر بلکہ اسکا ایک ایک قطرہ فرط انبساط سے ایک لطف

اضطراب و بےچینی کے ساتھ اُن پنکھڑیوں کو لئے پھرتا ہے اور پھر ہمارے سپرد کر دیتا ہے۔ ہم نہ معلوم اسکو کیا سمجھکر اٹھا لیتے ہیں۔

افسوس ریاض تم نہ ہوئے، جمعہ کا دن تھا صبح کو ہم لوگ گھاٹ کی سیر کو، یا یوں سمجھئے کہ اپنی ہلاکت کی سامان اندوزی کے لئے روانہ ہوئے واللہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ حسن آج نہانے کی رسم اُدا کرنے جا رہا ہے دیکھئے انسان کو جس چیز سے نفرت ہوتی ہے اکثر قدرت اُسکو اُسی چیز کے ذریعہ سے شکست دیکر اپنی اہمیت و پسندیدگی کا اعتراف کرا لیتی ہے، مجھکو مارواڑ کی عورتوں سے نفرت کلی ہے میں سمجھتا تھا کہ اس قوم کی طبقۂ اناث کو جنس لطیف میں شامل کرنا حقیقتاً جنس لطیف کی ایک افسوسناک ہجو کرنی ہے۔ لیکن ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ حسن کسی قوم کا ورثہ نہیں اسکی لطف فرمائیاں عام ہیں جس طرح وہ عمران و بذہبیت پر لطف فرما ہے اسیطرح غیر متمدن اقوام میں بھی اسکا نشیمن ہے اگر وہ اعلیٰ معاشرت ملکوں اور قوموں پر جلوہ فگن ہے تو بھدّے گھونگھٹ کی اوٹ سے بھی برق پاشیاں کر سکتا ہے، میں اس سے بے خبر تھا کہ گردن کی جنبش اور اسکے ساتھ آنکھوں کا اشارہ انسان کو پامال کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے، مجھے علم نہ تھا کہ حسن ہر لباس و وضع میں اپنی شوخ اداؤں سے مسخر کر سکتا ہے، سولہ سترہ برس کی ایک نازک اندام مگر بےچین ہستی ذہن میں لائیے اور یوں تصور قایم کیجئے کہ وہ مصروف خرام ہے جمنا کے کنارہ سے پرستش کر کے واپس آ رہی ہے، جسم کو کسی صورت قرار نہیں، اسکو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ میرے ساتھ ساتھ مگر مودب فاصلہ پر میرے گرفتار کئے ہوئے لوگ کچھ اور بھی ہیں، وُہ ایک دفعہ اپنے

گھونگھٹ کو ایک طرف کرلیتی ہے کہ برق پاشی کے لئے کوئی حجاب باقی نہ رہے، اور اپنی نازک گردن ایک طرف جھکا کر گوشۂ چشم سے ایک اور صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی ہے، اصبر و قرار ہاتھ سے جاتا رہتا ہے دیکھنے والا مسحور و بیخود ہوجاتا ہے، اعضا میں پر لطف تھکن دماغ میں ضعف اور اپنی رفتار میں مخموریت محسوس کرنے لگتا ہے۔ تھوڑا آگے چلنے کے بعد وہ پھر اُسی انداز سے دیکھ لیتی ہے غریب انسان بالکل بے بس ہوجاتا ہے۔

غرض یہ کہ پھر نہ معلوم تمام دن ہم پر کیا گذری اور کس پر کیف بیکیفی میں جمعہ کی نماز پڑھی اور کہاں پڑھی سارا دن ایک عجیب مخموریت و سرشاریت میں گذر گئی۔

دوسرا دن عید کا تھا اول تو مُسافر کی عید ہی کیا، پھر مُسافر بھی کیسا۔ غرضکہ کیسا نہانا کیسا دھونا آفتاب ہمکو دریا کے کنارہ اُنھیں حسن کی دیویوں کے انتظار میں ملا۔ آہ یہ صبح تو نہ معلوم اپنے ساتھ کیسا سامان جراحت لائی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوز بیوگی عورت میں جو شان پیدا کر دیتا ہے وُہ بات دوشیزگی میں نہیں، اِس میں ایک قسم کی دیویت پیدا ہوجاتی ہے اور اُس میں یہ بات نہیں، ایک عجیب اُداسی ہوتی ہے۔ قیامت ہے وُہ عالم کہ عورت ابھی حال ہی میں اپنے مایۂ نشاط محرم راز سے تمام عمر کے لئے جُدا کر دیگئی ہو اسکا وہ مغموم مگر شگفتہ چہرہ نہ معلوم کیا غضب ڈھاتا ہے۔ آہ اسکو جب کبھی اپنا عیش جو اس سے ہمیشہ کے لئے چھن گیا ہے یاد آجاتا ہے تو وُہ صرف دانت سے اپنا نیچے کا نازک ہونٹھ دبا لیتی ہے اور ایک پُرسوز نیاز کے ساتھ اپنے ہاتھ کی کلیاں لیکر مندر پر چڑھاتی

ہے لیکن حقیقتاً وہ ان کلیوں کو کہاں پہنچ سکتی ہے جو آہ کیسی شگفتگی سے گلابی ساری زیب تن کیئے ہوئے، سُرخ مخمل کی نیم آستین، اسپر سُرخ کناری لگی ہوئی اسکی لمبی اور نازک اُنگلیاں باہر نکلی ہوئیں اور سامان پرستش ہاتھ میں تھا۔ ایک عجیب کیفیت تھی جس سے حُسن کا تقدس برستا تھا۔ افضال میں نہیں سمجھتا کہ کس چیز سے اسکو تشبیہ دوں۔ بس یہ سمجھئے کہ حسن و شعر، رنگ و بُو اور موسیقی سے ترکیب پا کر اگر کوئی وجود ہو سکتا ہے تو وہ اُسی شیام رنگ بیوہ کا تھا وہ ایک پھول تھی معطر، ایک حسُن تھی معصوم، ایک شعر تھی پُر کیف، جس سے وہ ایک عالم کو مخمور و بیخود بنا سکتی تھی +

رؤف

اِس درمیان میں ہمارے پاس اکثر کتب و رسائل بغرض ریویو آئے ہیں مگر افسوس ہم ابتک انپر کوئی تنقیدی نگاہ نہیں ڈال سکے لیکن آج ہم اس رسالہ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔

القمر یہ ایک ماہوار صحیفہ ہے جو دہلی سے مولوی عبدالعزیز صاحب کے زیر سرداری شائع ہوتا ہے اسوقت تک اس کے تین نمبر ہماری نظر سے گذرے ہیں، اوّل سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا پرچہ نمایاں امتیاز کے ساتھ نکلا ہے جس سے معلوم ہوا کہ القمر ارتقائے تدریجی کے ماتحت روز افزوں ترقی کر رہا ہے اور اُمید ہے کہ وہ ایک دن بدر کامل ہو کر افق دہلی سے نکل کر اپنی ضیا بخشی سے سارے ہندوستان کو منور کر دے گا۔ حسُن طباعت عمدگی کاغذ وغیرہ سے دیدہ زیبی کی پوری کوشش کی جاتی ہے مضامین کی ترتیب وتہذیب میں بھی سلیقہ شعاری سے کام لیا جاتا ہے اُمید ہے کہ مولانا آیندہ چلکر اس میں بھی اچھی طرح سے کامیاب ہو جائینگے تنوع مضامین کے لحاظ سے اسکو عطر فتنہ کہنا چاہیئے

چند دن بمبئی میں

چند دن بمبئی نقاد کے دو نمبروں میں شائع ہو چکا ہے اُس کی تیسری قسط حضرت نیاز نے تمدن کے لئے عنایت فرمائی چونکہ سلسلہ کے لئے نقاد کا حوالہ دینا ناظرین کرام کے لئے ایک قسم کی تکلیف بیجا تھی اسلئے ہم اسکو بھی نقاد سے نقل کرتے ہیں، جہاں سے نئی قسط شروع ہوگی ایک امتیازی خط کے ذریعہ اس جگہ کو نشان کر دینگے۔ قارئین کرام کو کم خوشی نہوئی کہ حضرت مولانا نیاز کی توجہ پھر تمدن پر مبذول ہوئی ہے جو اس کے دیرینہ عنایت فرما ہیں۔

۲۰ مئی کی شام ہی کیسی مہمک شام تھی، جب میں نے بمبئی کے لئے اپنا اسباب سفر درست کرنا شروع کیا! میرا اسباب ہی کیا تھا کہ میں درست کرتا لیکن کسی محبوب مقام کی تیاریاں کرنا گویا تنہائی میں اُسکا ذکر کرنا ہے، اور میں چاہتا تھا کہ اس ذکر کی تکرار ہو، بستر لپیٹ رہا ہوں۔ اور ٹکٹ بھی لے رہا ہوں، کتابیں اپنے ساتھ لیجانے کے لئے چُن رہا ہوں، اور پلیٹ فارم پر ٹہل بھی رہا ہوں، ہوں ہانسی میں لیکن پھر رہا ہوں بمبئی میں، وقت واحد میں اختر منزل کے بالاخانے پر بھی ہوں اور ساحل اپالو پر بھی ——

اُف رے تخئیل تیری لطف پاشیاں!

"بہ حدِ شوق نفوذ تخئیل" ہمارا روز کا تجربہ ہے، لیکن ہماری یہ اشراقیت کہ کہیں کا نام سُنا اور فوراً اُسکے حدود پیش نظر ہو گئے، وہاں کی سڑکیں، وہاں کی گلیاں، وہاں کے مقاماتِ تفرج کی کیفیتیں، وہاں کے لوگوں کی صورتیں سامنے کھنچ کر رہ گئیں، بسا اوقات زیادہ پُر لطف ثابت ہوتی ہے

اور جب اُس جگہ ہم پہونچ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تخئیل کی وارفتگی خیال کی ربودگی کیسی پاکیزہ چیز تھی کہ ع "حضور گلشن بے اختیاری کردہ رنگینم" اور ہمارا العبتکدۂ دماغ جو "تخئیل" کی بُت سازیوں کا کرشمہ تھا بہت زیادہ پر کیف مناظر سے مملو تھا۔ لکھنؤ، آگرہ، دِلّی وغیرہ جانے سے قبل وہاں کا ذہنی جغرافیہ، وہاں کے مرقعے اپنے پاس تھے اور راتوں کی خلوت میں بارہا ہم وہاں کی گلیاں چھان چکے تھے۔ لیکن جب وہاں پہنچ گئے تو کیا ہوا؟ وہ جغرافیہ جس میں زمین کے بہترین مناظر کا حال درج تھا فراموش ہو گیا، وہ مرقعے جن کی ترکیب بہترین صور سے ہوئی تھی اور وہ ذراتِ حسن جو وہاں کی گلیوں میں نظر آتے تھے یکسر محو ہو گئے۔ افسوس ہوا کہ ناحق زحمتِ سفر اختیار کی۔ پردۂ شب پر، اپنے تخئیل کی مصوّری ہی اس سے اچھی تھی لیکن صرف بمبئی ایک ایسا مقام نکلا جسکو دیکھکر میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا میرے تمام اگلے پچھلے قیاسات و تصوّرات نے جسم اختیار کر لیا ہے اور اوسکا نام باتبے (Bombay) رکھدیا گیا ہے۔

ایک عرصہ سے وہاں جانے کی آرزو قلب میں پرورش پا رہی تھی، لیکن اُس کے شباب کی رنگینیوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا جب میں نے مصمم ارادہ کر کے اُسے اپنے سارے خون میں دوڑا دیا۔

ٹھیک گیارہ بجے شب کو میں ہانسی سے سوار ہوا اور صبح کو دِلّی پہنچکر شام کو ۵ بجے آگرہ اُتر پڑا، مہمان دلگیر ہوا خیال تھا کہ ایکدن یہاں ہونگا لیکن گرمی کی شدت نے اجازت نہ دی اور مجبوراً ۶-۷ گھنٹوں کے بعد ہی مینے رات کی گاڑی سے آخر کار اپنا وہ سفر شروع کر دیا جو اسوقت میرے تمام اعضا پر حکمراں تھا۔

بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

ریل میں بیٹھئے اور سفر طویل ہو، تو سب سے پہلے لطف معیت کی جستجو ہوتی ہے۔ یعنی اگر تنہائی نصیب نہو، جو بہترین ندیم ہے، تو خیر وہاں کی ...... بیٹھنے والی صورتیں تو ایسی ہوں جنکو دیکھکر بینائی مجروح نہو، مگر یہ پہلا شگون نیک تہا کہ میرے ساتھہ کوئی نہ تہا اور اس سلئے جلدی جلدی بستر کھولا اور کھڑکی میں سر ڈاسلکے اُن نقوش پر نظر ثانی کرنے لگا جو اُسوقت میرے دماغ کے تنہا مالک تھے۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر میں اِس لذت میں مستغرق رہا، کیونکہ جب میری آنکھ کہُلی، تو ۲۲ مئی کا سورج بہت بلند ہو چکا تھا۔ اور ایک جوان فرنگن مجھے گھور گھور کر دیکھہ رہی تہی، یعنی مجھے ملامت کر رہی تہی کہ میں کیوں گھنٹوں قبل رات کو اس گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں صبح کو اُسے سوار ہونا تہا لیکن باوصف اِس تحقیر و تذلیل کے میں خوش تھا۔ میں کیا کرتا اگر وہ گھورنے والی آنکھیں کسی فرنگی کی ہوتیں اور وہ نگر پہنے ہوئے اپنے کھلے ہوئے چوڑے چکلے گھٹنے پر ہاکی کھیلنے کے ڈنڈے سے سگرٹ جلانے کے لئے دیاسلائی رگڑتا ہوتا۔ میں اُٹھا اور میں سنے اوس بےہم ملکہ سے معذرت کی کہ "اگر اس وقت تک میرے لیٹے رہنے سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں بہت نادم اور یہ سبےبجے اٹھا جاتا ہوں" خدا معلوم میرے انداز بیاں میں کونسی ایسی بات تہی جو اوسے بھلی معلوم ہوئی بہر حال وہ مُسکرا پڑی اور اپنی ہاں نہیں نہیں اسے اُسنے مجھے یقین دلادیا کہ وہ اگلے اسٹیشن پر پہنچکر وہاں کے اسٹیشن ماسٹر سے سرگوشیاں کرکے مجھے یہاں سے نکلوا دینے کی کوشش نہ کریگی۔ آگے چلکر دو چار مہذب وضع حضرات اور بہی

آکر بیٹھ گئے اور میں خوش ہوا کہ اگر نکالا ہی جاؤں گا تو میرے کرتے کا گریبان انکی قمیصوں کے کالر سے پیچھے ہی رہیگا۔ مگر خیر یہ مصیبت جسکا بارہا مجکو تجربہ ہو چکا ہے اور جو حقیقتاً ہمارے لئے تازیانۂ عبرت ہے، پیش نہیں آئی اور وہ کسی اسٹیشن پر ۹-۱۰ بجے کے درمیان اُتر پڑی۔

میں سفر میں اس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ کوئی مجھسے اسقدر بے تکلف ہو جائے کہ لامحالہ مجھے اسکے ہر سوال کا جواب دینا پڑے خیر یہاں تک تو کوئی ایسا حرج نہیں کہ "کہاں جائیگا"، لیکن اسکے بعد میں "کیوں" نہیں سن سکتا اور خاصکر پھر ایسے سفر میں جس کے متعلق اگر میں خود اپنے سے سوال کروں کہ "کیوں جا رہا ہوں" تو کوئی جواب مجھے نہ ملے۔ چنانچہ ایک صاحب نے میری طرف سوال کرنیکو اپنا چہرہ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے کتاب اُٹھالی اور دیکھنا شروع کیا اور میں کھلی ہوئی اخلاق شکنی سے بچ گیا۔

کسی دور دراز کے مشہور مقام پر جانے والے مسافر سے سوال کیجئے تو وہ نہایت نخوت سے مختصر سا جواب دیتا ہے کہ "کلکتہ" یا "بمبئی" یعنی جس طرح ریل پر سوار ہونے والا پیدل چلنے والونکو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے تئیں بہت بالا و برتر سمجھتا ہے، اسیطرح ایک ہی گاڑی میں سفر کرنیوالے اظہار تفوق کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں اور پھر تماشہ یہ کہ جہاں کسی نے "کلکتہ"، "بمبئی"، یا کسی دوسرے دولتمند شہر کا نام لے دیا تو قریب کے جانیوالے غریب کچھ ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ وہ اُس کے اندر شان امارت محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص کیسا خوش قسمت و قابل رشک ہے!"

مجھ سے اگر کسی نے پوچھا بھی تو ہر آگے آنیوالے اسٹیشن کا نام لیکر کہدیا کہ اسطرف جاتا ہوں۔ میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ "میں بمبئی" کہکر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دوں اور وہ خواہ مخواہ سمجھنے لگے کہ میں اظہار فوقیت کر رہا ہوں ــــــ غرض دن بھر اسی لغویت میں گذرا کہ کون آتا ہے اور کون جا رہا ہے گرمی کا وُہ عالم تھا کہ تالو پیاس سے چٹخا جا رہا تھا اور ریلوے کے انتظام کی یہ حالت تھی کہ۔۔۔۔۔۔ ہر اسٹیشن پر غریب مسافر پروانوں کی طرح "ڈول والے" پر گرتے تھے اور وُہ سب کے سامنے ڈول کو اوندھا کر کے دکھا دیتا تھا کہ پانی نہیں ہے۔ شام ہوئی تو گرمی میں کچھ تخفیف ہوئی اور طبیعت کو کچھ سکون ہُوا۔ اب صرف ۱۲ گھنٹوں کا فصل تھا کہ ریل مسافروں کو بمبئی لیجا کر ڈالدیتی اور اس لئے دو ثلث مسافت طے ہو گئی تھی۔ میں لیٹ گیا اور کوشش کر کے سو گیا۔

۲۳ جون کی صبح کو جو آنکھ کھلی تو سوادِ بمبئی شروع ہو گیا تھا اور سب سے پہلا منظر جو پیش نظر تھا کھجوروں کے درختوں کا تھا جو سبز و شاداب ٹیکروں اور پھیلے ہوئے قطعاتِ آب سے ملکر آنکھوں میں سمائے جا رہے تھے۔ راستہ کے خشک و گرم میدانوں کے دیکھنے کے بعد اچانک یہ سکون نظر خدا جانے کیسی نعمت تھا۔ میں اس منظر کی عربیت سے بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا دشتِ نجد میں قیس اتفاقاً کہیں لیلیٰ کو پا گیا ہے اور صحرا کی وحشت و خشکی جو شاید اسی ملاقات کی منتظر تھی اکبار گی رونق و سرسبزی خنکی اور تری میں تبدیل ہو گئی ہے!! وہ اِدھر اُدھر لانبے لانبے سبز کھجوروں کے جھنڈ، وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا زمردین سلسلہ، اور پھر اسپر قیامت چادرِ آب کی غیر متناہی شکنیں۔

ایک عرب خاتون، ایک مصری دوشیزہ کو ریل میں بٹھاکر اسطرف لیجاؤ، ممکن ہے وہ اپنے جذبات کو چہرہ سے ظاہر نہونے دے ممکن ہے کہ وہ اپنے سانسوں سے نظام میں کوئی فرق نہ آنے دے لیکن اسکی نازک کلائی پر ہاتھہ رکھکر ضربات نبض کا شمار کرو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ وہ یہاں عشق کرنا سیکھہ سکتی ہے، وہ یہاں اپنے اعضا میں خواہش سپردگی محسوس کرسکتی ہے، المختصر یہ کہ راستہ کی ساری خستگی کچھہ عجیب پُر لطف انبساط ہوگئی اور سارے شدائد گرما محو ہوگئے کوئی آدہ گھنٹہ تک ریل انہیں قطعات عرب میں ہوتی ہوئی گذری یہانتک کہ ساڑھے سات بجے آہستہ آہستہ ہوکر اُس سرزمین حسن وعشق، اُس بلدۂ شعر و موسیقی میں پہنچ گئی، جس کی تمنا میری ہستی سے اندر ایک الگ روح بنی ہوئی تھی، اور اس مقام کی وہی خصوصیت جس نے میرے دل کو تڑپا رکھا تھا آخرکار پیش نظر ہوگئی۔ پارسیوں کی جنس لطیف کا حسن گو میرے لئے اجنبی تھا لیکن یہ خیال کہ "بمبئی توان کا مسکن ہے" "یہاں توان کی حکومت ہے" تصور کی ...... فراوانی سے تنگ آکر ہجوم حسن کا آرزومند تھا اور اس پرسش کا کس زبان سے شکریہ ادا کیا جائے کہ دادر اسٹیشن پر پہنچتے ہی اُس حسن کا ایک نہایت پاکیزہ و پُرشباب نمونہ، میری بیخودی و دارفتگی کا ترانۂ خیر مقدم گا رہا تھا میں اس کو اپنا ہی خیر مقدم سمجھوں گا کیونکہ وہ میری گاڑی کے ٹھہرتے ہی اُٹھی اور میں اس کا "ترانہ ہی کہوں گا" کیونکہ اُترتے ہی میں نے اُس کی آواز قدم سُنی۔ آہ، کون جانتا ہے کہ حسن کی اگر کوئی زبان ہے تو صرف "موسیقی" ہے اور ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے وہ ایک

نطق موسیقی ہے جس کا ساز نسائیت اور صرف "نسائیت" ہے وہ ہاتھ ہلاتی ہے گویا ہوا میں نقش ترنم بنا دیتی ہے چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نشان موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔

آہ اے موجد عشق و محبت، صرف تیری ضرورت ہے، اڈیسن کا دماغ یہاں بیکار ہے۔ گراموفون میں سونڈ بکس کی سوئی جب کارڈ کو چھوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارڈ نغمہ منجمد ہے۔۔۔۔۔۔
۔۔۔ آواز حسن کائنات کے ہر ہر ذرہ میں منقوش ہے، دل میں بجائے اُس سوئی کے اک پھانس ہو اور پھر وہ اُس ذرہ سے مس کرے، تو پتہ چلے کہ یہ تمثال نغمہ، یہ نقش بردار موسیقی اک محبت والے دل کا کس قدر محتاج ہے ـــــــ اور اس لئے اے بمبئی میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے میرے خیر مقدم میں اپنے ہاں کے بہتر گیتوں میں سے اک گیت بھیجا۔

ضرورت تھی کہ اس وقت میں تنہا چھوڑ دیا جاتا اور بالکل آزاد، لیکن افسوس ہے کہ مجھے ابھی اور آگے جانا تھا اور یہاں گاڑی بدلنی تھی اسباب سنبھالنے میں مصروف ہوا، لیکن میں نے اپنے ایک دوست کو یہاں پہونچنے کی اطلاع اسی وقت ایک کارڈ لکھکر دیدی۔ کہ ع۔

اے رفیقاں نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام

دادر بمبئی کا لوکل اسٹیشن ہے اور مجھے ماہم جانا تھا جو یہاں سے دو تین اسٹیشن اور آگے ہے خیر، اس دلنشین آفت، اس سکون جان قیامت کو جو پلیٹ فارم پر خراماں تھی "دو زندہ باد" کہتے ہوئے رخصت ہوئے اور آدھ گھنٹہ میں ماہم پہونچ گئے، جہاں مجسمۂ صدق و خلوص،

پیکرِ محبت و صفائی، ہیکلِ حسنِ اخلاق مسٹر لطیف الدین احمد میری پذیرائی کے سلئے موجود تھے۔

پانچ منٹ میں، ہم اُس جگہ پہونچگئے جہاں قیام کرنا تھا، افسوس ہے کہ مسٹر لطیف کی مشغول و منہمک زندگی کو دیکھکر میں خوش نہ ہوا کیونکہ میری راسئے میں حقیقتاً وہ اس کے لئے وضع نہیں ہوئے، لیکن ابہی اس تنقید کا موقع نہ تہا اور میں نے انکو اجازت دیدی کہ وہ جائیں اپنا کام کریں۔ اب مجھ سے اُسنے تین چار گھنٹہ کے بعد ملاقات ہونا تہی۔ اسلئے میں بالکل تنہا رہ گیا اور لگا اطمینان سے بیٹھ کے یہ سوچنے کہ دو میں تو یہاں آکے بہی ویسا ہی زار و خراب رہا،،

یہ مکان اُس سلسلۂ آب کے کنارے ہے جو بمبئی کو جزیرہ نما بناتا ہے اور اس سلئے یُوں کہنا چاہیئے کہ میں ساحل بحر پر تھا جہاں میری نگاہ کی پرواز کے سلئے ایک وسیع رقیق میدان موجود تہا۔ اس مکان کے چاروں طرف بہی کہجوروں کے درخت کثرت سے موجود تھے اور وہی معصومیتِ منظر یہاں بہی پائی جاتی تہی۔

شام کو ہم اور مسٹر لطیف ریل میں بیٹھ کے چرچ گیٹ اسٹیشن گئے اور وکٹوریا میں بیٹھ کے اُس کارگاہِ حسن و جمال پر پہونچگئے جو ساحل اپالو کے نام سے مشہور ہے +

ہاں، میں اُس کارگاہِ جمال و لطافت، اُس نزہت آبادِ حسن و نزاکت میں پہنچگیا جہاں سب سے مجھے اس سے بہت پہلے پہنچنا چاہیئے تہا۔

حسن عام اس سے کہ وہ اک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور

اک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو، یا وہ نوعِ انسان کی ایک خاص جنس میں پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے، فطرۃً اس امر کا مقتضی ہے کہ حسن ہی اُس کا متلاشی ہو، جمال ہی اُس کی جستجو میں سرگرداں ہو جس طرح نزاکت کا بار اُٹھانے کے لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، بالکل اسی طرح حسن کی معیت کے لئے حسن ہی پسندیدہ ہے۔ نازک بیلوں پر ایک تیتری بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ایک حسین وسیع پیشانی پر صندل ہی کا قشقہ کچھہ لطف دیتا ہے۔

معدنی اشیاء میں سونے اور پارے کے خصوصیات مجھے بہت پسند ہیں۔ وہ جاذب ہے اور یہ منجذب، وہ پسندیدہ حسن ہے اور یہ حسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے اور سُنا ہے کہ پارہ بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کوئی حسین لڑکی گردن جھکاکے جھانک نہیں لیتی۔

بچہ اپنے لطف کے لئے بچوں ہی کا ساتھہ ڈھونڈھتا ہے، کوئی بوڑھا اُن میں بیٹھہ ہی جائے تو کیسا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ محفلِ رقص و سرود میں مُغنیہ کی نگاہ وہیں پڑتی ہے جہاں نوجوانوں کا مجمع ہوتا ہے کوئی اُسی کا ہمسن چھیڑ دے تو پھر دیکھئے کیسی مست ہوکر جواب دیتی ہے اور جہاں کسی سن رسیدہ شخص نے کوئی بات کہی اور اُسکی طبیعت سرد ہوئی۔

حسن میں کشش ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر کھنچ جانیوالی چیز مقبول بھی ہوسکتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حسن کا مطلوب معنوی کون ہے، کیونکہ حقیقتاً مطلوبِ حسن ہونے کی اہلیت رکھنا ہی وہ حسن ہے جو ہماری رائے میں حسنِ اول کی معیت کا مستحق ہے موسم برشگال میں

افق کی سیاہی کا سریع نشو و نما ہم بھی دیکھتے ہیں، چاروں طرف جوشِ سبزہ ہمیں بھی اچھا معلوم ہوتا ہے، باغوں کی فصیل پر طاؤس کا خرام ہمارے دل میں بھی گدگدی پیدا کرتا ہے، کویل کی مستیاں ہمارے دماغ پر بھی چھا جاتی ہیں، لیکن ایک رند سے پوچھو وہ کہتا ہے کہ "دس دن ہوتو بادل کا ایک ٹکڑا نظر نہ آئے ہمیشہ خشک سالی کے مصائب رفع کرنے کی کوششیں کیجاتی ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لوگ شراب پینا شروع کر دیں کہ کبھی امساک باراں کی شکایت ہی نہ ہو" غرضکہ وہ اودی اودی گھٹاؤں کو دیکھکر بیتاب ہو جاتا ہے اور جب ہم مکان کی چھتیں دیکھا کرتے ہیں اُسیوقت وہ باہر جنگل میں سبزہ پر بیٹھکر جھوما کرتا ہے قطعاً وہ اس حسنِ موسم کا مطلوب معنوی ہے اور وہی اُس سے لطف اُٹھانے کا اہل ہے، مظاہر قدرت کا محبوب اور حسن مناظر کے نزدیک حسین وہی ہے جو اپنے تئیں اُن میں محو کر سکے۔ کلی سے اگر زبان ہوتی تو وہ کہدیتی کہ "مجھے تو صرف ایک بھونرا چاہئے جو ہر وقت مجھے لپٹائے رہے، مجھے پروا نہیں اگر وہ میرا سارا رس نکال لیتا ہے۔ ہر چند اسکا شوق اُسکے لیئے مایۂ حیات ہے لیکن میں خوش ہوں اگر میری بربادی اُس کی زندگی ہے کیونکہ اعترافِ محبت کا یہی ایک پسندیدہ طریقہ ہے"

اِسی لیئے میں نے کہا کہ

یہاں میرا آنا بعد از وقت ہوا۔ دل میں ولولہ کی وہ فراوانی نہیں کہ حسن مناظر کے لیئے جی کھولکے اپنا وقت صرف کر سکوں، عنفوان شباب کی وہ رعنائی نہیں، حالانکہ غریب مرد کے صحیفۂ حیات میں یہی ایک تنہا عنوان تہدیہ Dedication عورت کے مطالعہ کے قابل ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں آنے کا مجھے بہت شوق تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کا پورا لطف اٹھانے کے لئے صرف اسقدر شوق کافی نہ تھا۔ حسن سے پوری طرح مستفید ہونیکے جذبات عرصہ ہوا کہ میں اپنی تمناؤں کے ساتھ سینہ میں دفن کر چکا ہوں اور اس لئے ضرورت تھی کہ حسیات بقیہ میں خاص تحریک پیدا کرنے کے لئے کسی محرک قابل کی شدید مواصلت نصیب ہوتی اور وہ کہاں؟ لیکن پھر بھی باوصف ان تمام نقصاناتِ طبیعت کے مجھے تباہ اور برباد کر دینا یہاں بہت آسان تھا، لیکن شکر ہے کہ مسٹر لطیف کی عدیم الفرصتی میری حیات کی ضامن ہو گئی اور میں زندہ وطن واپس آیا۔

جس وقت میں اپالو پہنچا، تو میں متحیر تھا کہ کیا فی الحقیقتہ میں کسی ساحلِ بحر پر کھڑا ہوں؟ یقین نہ ہوتا تھا کہ میں خشکی کا اسقدر حصہ طے کر کے یہاں آگیا ہوں جہاں سے قدرت کی یہ رفیق اعجوبہ نمائیاں شروع ہو کر دنیا کے تین چوتھائی حصوں پر قابض ہو گئی ہیں۔ ایک ہموار نگاہوں کے لئے ناقابل عبور سطحِ مواج! یہ معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی وسعت تخئیل نے ایک صورت اختیار کر لی ہے۔

میں سمجھتا تھا کہ اونچی اونچی لہروں کے ہیبت ناک غیر منقطع سلسلہ اور ایک سامعہ شکن شور کا نام سمندر ہے، لیکن میں یہ دیکھکر کیسا متحیر ہوا کہ وہ تو صرف ایک سکون ہے متحرک، ایک خموشی ہے متلاطم۔ ہائے وہ نرم نرم آواز! یہ نہ پوچھو کہ ساحل کے لذائذ سرود میں بھی کیسی ڈوبی جاتی تھی۔ اُف وہ موجوں کی پر غم روانی! ادّف ومادّف جا کے دیکھو اور سر دھنو۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اور بعض بعض تو بالکل وہی "دو ڈولت جائے"

ایسی آزادی اور تیزی کیساتھ سمندر کے سینہ پر دوڑتی پھرتی تھیں کہ قوتِ بحر کی طرف سے اعتقاد کچھ کمزور ہوتا نظر آتا تھا، لیکن جب ذرا فاصلہ پر ایک عظیم الشان جہاز سمندر کی ہر سانس کے ساتھ متحرک نظر آیا، اور اُس سے اور دُور روشنی کا مینار (بحری جگنو) اپنے ضیا کے قبض و بسط سے نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا، تو سخت حیرت ہوئی کہ خدایا یہ قہار سکوں، یہ ذخار خموشی جو حقیقتاً پردۂ تلاطم، نقابِ طوفان ہے کیونکر انسان کو ایسا جری و بیباک بنا سکی۔

جس وقت ہم ساحل پر پہنچے شام ہو چکی تھی۔ بجلی کی روشنی، جو صرف لبِ آب جگمگانے کے لئے وضع ہوئی ہے اور وہ لبِ آب جس پر اپالو اور چوپاٹی بجا طور سے فخر و ناز کر سکتے ہیں، سمندر میں پڑ رہی تھی اور تاج محل ہوٹل جو ہند کا بہترین نزل ہے مع اپنی تمام روشنیوں و دلاویزیوں اور ارتفاع و شوکت کے پانی کے اندر ہچکولے کھاتا نظر آرہا تھا۔ کشتیوں پر کہیں لوگ سوار ہو رہے تھے۔ کہیں اُن سے اُتر رہے دس جا رہی تھیں، تو بیس واپس آرہی تھیں۔ مختلف شکل و وضع کے لوگوں کا مجمع تھا، جن میں کوئی ٹہل رہا تھا، کوئی بیٹھا تھا۔ لیکن کیسی پُر لطف و تعجب انگیز بات تھی کہ اس مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا میں کو جادۂ نظر دوسرے سے مختلف ہو، اِک طوفانِ نظارہ تھا جو سطحِ آب پر برپا تھا، اِک سیلابِ شوق تھا جو سمندر کی سیّال خموشی کو محیط تھا۔

سُنا ہے کہ سمندر کی صبح و شام بہت پُر لطف ہوتی ہے، یعنی اگر صبح و شام کا اصلی حسن دیکھنا ہے تو آئینۂ آب میں دیکھنا چاہیے، اور اگر

سمندر کے مناظر سے حقیقی مسرت حاصل کرنا ہے تو وہ وقت تلاش کرنا چاہیے جب آفتاب نہا کر نکل رہا ہو یا نہانے کے لئے اُس کے اندر جا رہا ہو۔ چنانچہ نیچر نے اس کا انتظام یہاں اس طرح پر کیا ہے کہ وہ شاخ بحر جو ساحلِ ریاآلو بناتی نکل جاتی ہے آفتاب کے غسل صباحی کے لئے مخصوص کر دی ہے اور ساحلِ چوپاٹی کے آغوش میں اُسکا شام کا حمام بنا دیا گیا ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت میں ساحلِ ریاآلو پر چل پھر رہا تھا، آفتاب چوپاٹی میں تھا۔ پھر میں یہاں کیا کر رہا تھا، ساری دُنیا یہاں کیا کر رہی تھی؟ شاید آپ ماننے کے لئے طیار نہ ہوں اور ممکن ہے کہ ہر وہ شخص جس نے شام کو اپالو نہیں دیکھا یہ ماننے کے لئے طیار نہ ہو، لیکن میں حقیقت سے انحراف کرونگا اگر اسکا اظہار نہ کروں کہ وُہ شام جس کے مفہوم میں تاریکی کا تصور جزو اعظم ہے حقیقتاً یہاں آتی ہی نہیں، اور اگر آتی بھی ہو تو صرف اس لئے کہ بجلی کی روشنیوں، حُسن کی صباحتوں، گورے گورے مکھڑوں کے تبسموں، کھُلی ہُوئی بلوری گردنوں پر لٹکنے والے آویزوں کے جھوٹ اور اسی قسم کی بہت سی نامعلوم یاسمینی سپیدیوں میں اپنے تئیں تحلیل کر دے۔ پھر اگر دن کی روشنی میرے سامنے غایب ہو گئی تو میں اُسے محسوس نہیں کر سکتا تھا کیونکہ حسن کی درخشانی نے اب اُس کی جگہ لے لی تھی، اور اگر رات کی تاریکی شروع ہو گئی تھی تو مجھے اُسکا ہوش نہ تھا کیونکہ الماس سے روشن تریں ٹکڑے کسی سینہ کے اُوپر سُرمئی دوپٹہ کے نیچے اِس حُسن کے ساتھ میں جس حُسن کے ساتھ دوشیزہ لڑکیوں کی قطار میں اس وقت آغوشِ شام میں جگمگا رہی تھیں۔ غرضکہ مجھے نہیں معلوم کہ شام کب ہوئی اور اگر شام اس کا نام ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ اس شام

کی صبح کے آرزو کیونکر میرے دل میں جگہ پاسکتی ہے۔ بہرحال میرے لئے عجیب و غریب سامانِ حیرت و نشاط یہاں موجود تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس طرح اِس منظر میں فنا ہو جاؤں ——— وہی ہوا جو ابھی ابھی سینکڑوں زلفوں سے دوشیزہ نکہت کو چھو چکی ہے، مجھ تک بھی آرہی ہے! میرے لئے بھی مشام نواز ہے!! آہ، وہی بجلی کی روشنی جس میں حسن، ایسے حسن، اسقدر حسن کی جلوہ طرازیاں شامل ہیں، مجھ پر بھی پڑ رہی ہے، میرے رستہ جام پر بھی ضیا افگن ہے!! وہی زمین جسپر ایسے ایسے نازک پیروں کے نشانات درس پرستش دے رہے ہیں، اُف، اُسی زمین پر میں بھی چل رہا ہوں۔ سر کے بل چلنا اک ناقص اظہار جذبات ہے اور خاک ہو کر وہی زمین میں بل رہنے کی تمنا نا ملک اعتراف یہ تخیل کہ حیات، نفس حیات یعنی یہ زندگی، یہ متحرک حالت، ہمارے اُن کے درمیان اِک کیفیت مشترک ہے! آہ، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر اسکی قدر کی جائے، کس انداز سے اِس زندگی کا شکریہ ادا کیا جائے۔

ہر انسان اپنی جان کو عزیز سمجھتا ہے، لیکن نہ اسقدر جتنا وہ انسان جو ملِل اپالو پر شام کو تفریح کے لئے نکل جاتا ہے یہاں سو کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہی جان جس کی طرف سے اسکو اِک نوع کا تغافل تھا، یہاں اِک مستقل حسن ہے، اِک نیرنگ ہے، مگر ہاں فرق یہ ہے کہ ہماری آنکھوں میں وہ حرفِ اشک ہے اور اُنکی آنکھوں میں اِک جنبش سحر انگیز، ہمارے سینوں میں وہ عرفِ آہ و فغاں ہے اور اُنکے سینوں میں شاہانہ غرور و تمکنت، ہمارے جسم میں وہ عرفِ عجز و فتادگی ہے اور اُنکے قدموں میں جمال و رعنائی +

ناپائداریٔ دُنیا

جہاں رباطِ خراب است برگذر گہہ سیل

غنچہ دگل کھلکر کملاتا، شبنم کا نمودار ہوکر غائب ہونا، بہار کا خزاں سے وابستہ رہنا، صبح ہوکر شام ہوجانا، چاند کا بڑھکر گھٹ جانا، ہمیں اِس دہر ناپائدار کی اصلیت کو صاف بتا رہا ہے۔

اے گندم نما جو فروش دُنیا! تیری خوش رنگا رنگینیاں، تیرے اشکالِ عجوبہ کی نو اظہاریاں، تیرے طلسمات جدیدہ کی سحر آفرینیاں، تیرے دلربا و دلجو شکن مناظر کی خوبیاں، تیرے پُرزور مقناطیسی اثرات، تیرے حسین مجودوں کی کششِ عشق و ادا، ایک عالم کو تیرے دام بلا میں پھنسانے کو کافی ہیں لیکن افسوس صد افسوس! تیری اصلیت فنائیت، تیرا وجود نابود، تیری ہستی نیستی، اور تیرا ہونا نہ ہونیکے برابر ہے۔ تیری ہر شے ہر کام بے اصل و ہیچ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تجھے بقا نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ تیری فنائیت کا راز پاکر بھی تیرے شیدائی، ظلم و تشدد کے نمونے، بیرحمی و سرکشی کے پتلے، حرص و ہوا کے متوالے ابد الآباد سمجھتے ہیں اور تجھپر شیدا و مفتوں ہیں اور نہیں سمجھتے کہ۔

شکاریم یکسر ہمہ پیشِ مرگ

ہاں اے بے وفا ناپائدار دُنیا ہماری چشم عبرت ہوشیار و خبردار ہے ہمارے گوش حسرت سُن چکے ہیں کہ تجھ میں بڑے بڑے شریف النفس، باوقار

اولوالعزم شہنشاہ، اور ہزارہا نازنینان جہاں صرف فنا ہوجانے کو پیدا ہوئے اور ہمکو خوب معلوم ہے کہ ہزارہا ہستیاں عالم ہولانیت کی صرف تجھہ میں آکر نیست ونابود ہوجانیکی منتظر ہیں۔ تیرا ہر ذرہ نیستی و فنائیت کی سیدھی راہ ہے۔

آہ! اگر تیری ہستی کا کچھہ بھی قیام و اعتبار ہوتا تو آج بڑے بڑے شاہیر و ناموران زماں کا کچھہ پتہ لگتا لیکن افسوس!

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

اے بیرحم و سنگدل دنیا، تونے بڑے بڑے سیم تن، نازکبدن، خوش ادا باحیا و پاکباز حسینوں کو اپنے آغوش شفقت میں پالا، پرورش کیا۔ اور پھر اپنے ہی نازپروردوں کو زمانے کے اُس شہ زور پنجہ تظلم و تشدد میں دسے دیا کہ جسنے اُن نازک تنونکو خاک میں ملاکر چھوڑا اور آج خفتگان زیر زمین کا نام و نشان تک نہیں ملتا چشم عبرت اُن نازک بدن حسینوں کے مرقدونپر چار آنسو بہانے کو ملیا ہے اور عبرت و تنبیہ زبان حال سے گویا ہے۔

خوشی سے دیکھیو حرکت میں آئیو نہ بہت
زمین تجھہ میں ہزاروں حسین سوتے ہیں

چمنستان دہر میں کونسے پھول کھلے جو کھلا نہ گئے، آہ! وہ ننھے ننھے پودے جو بہار کے زیر سایہ آغوش چمن میں، باد نسیم نرم نرم جھوکونسے بصد دقت و مشکلات پلکر بڑھے، افسوس کہ انقلاب زمانہ کے ہاتھہ سے رہائی نہ پاسکے، باد خزاں کے تھپیڑوں کے متحمل نہ ہوکر کمھلا گئے اور اُس چمن آباد کو جو فخر جناں تھا ویران و برباد بنا گئے۔

کدام باد بہاری وزید در آفاق   کہ باز در عقبش آفت خزانی نیست

حباب ہستی کو بحر جہاں میں فنائیت کے طوفان سے امن نہیں عالم ہیولا سے عالم وجود میں نمودار ہونا نیستی و فنائیت کے لئے تیار رہتا ہے۔ کاروانسرائے دنیا میں قیام پذیری ملک عدم کو جانے کی تیاری ہے۔

افسوس اس ہستی و نیستی کی حقیقت، اسکا مقصد اصلی، اسکا راز مخفی باشندگان عالم بقا سے ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے شاید کہ رہروان ملک عدم ہی کچھ بتا سکیں پس ملتجی ہیں کہ۔

دنیا سے جانے والو کچھ تم ہی بتاتے جاؤ
اس دشت غم میں کس لئے آئے تھے کیوں چلے

آہ! معلوم ہوا کہ اس کاروانسرائے ہزاروں گھر بگڑ جانے کو بنے، ہزاروں خاندان مٹ جانے کو ہوئے، ہزاروں آبادیاں برباد ہونیکو ہوئیں افسوس! اے دنیائے فانی کوئی تجھ میں پھول پھلکر نیست و نابود ہونے سے نہ بچ سکا، کوئی خوشی و راحت مبدل بہ رنج و کلفت ہونے سے نہ رک سکی۔ تیری اصلیت دیکھلی، اے بے ثباتی دنیا تیرا انجام دیکھ لیا۔ اے ویرانہ آباد دنیا تجھ میں نیستی و فنائیت کے سوا کچھ نہیں۔ شعر

بسی گور غریباں جب کسی کا گھر ہوا ویراں
مسافر پڑکے سوئے جاگ اٹھی تقدیر منزل کی

نصیر الدین احمد

طبیب یہ رسالہ طبیب ہفتہ وار کا بدل ہے جو حکیم علی رضا کی ایڈیٹری سے شائع ہوتا ہے اسکی نسبت ہمکو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ملک کو جسقدر اس قسم کے رسالوں کی احتیاج ہے وہ ناقابل اظہار ہے ہمیں مسرت ہوئی کہ طبیب پھر زندہ ہو گیا خدا کرے وہ مسیحا نفس ثابت ہو قیمت کے لحاظ سے لکھائی چھپائی اچھی ہے حکیم علی رضا کوچہ چیلان دلی سے

اعتزال

(از حضرت نیاز فتحپوری)

آج کل مسلمانوں میں جہاں اور بہت سی اعتقادی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، وہاں معلومات کی خامیاں بھی بہت ہیں، اور غالباً یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ معلومات کی کمی بڑا سبب اُن اعتقادی کمزوریوں کا ہے، بہت سے الفاظ ہم ایسے بولتے ہیں، جن کا مفہوم اپنے پندار میں صحیح سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مفہوم بالکل غلط ہے، اور اس لیے اُس مفہوم کے لحاظ سے جو نتائج ہمنے نکالے ہیں، وہ بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہمارے اذہان ایک اضطراری صورت میں اُس لفظ کے نکلتے ہی متاثر ہو جاتے ہیں اور ہم اُس تاثر کی وجہ سے جس کی علت ہی شروع سے بالکل بے بنیاد ہے، بعض دفعہ ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں، جو ہرگز ہمارے شایاں نہیں ہے، اور غالباً ہم اُسے نہ کرتے، اگر ہماری معلومات وسیع ہوتی، آجکل جبکہ مذہبی اعتقادات نے کچھ عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے، اور مذہب کو خدا معلوم کیا سمجھ رکھا ہے، بہت ضرورت اس امر کی ہے کہ بعض ایسے اُمور پر روشنی ڈالی جائے، جن سے وہ غلط فہمی دُور ہو، اور عام پبلک اس بات کے سمجھنے کا شعور پیدا کرے کہ جو کچھ منکشف کہا جا سکے، پہلے اُس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ مسلمانوں کے اُس طبقہ میں بھی جو معمولی پڑھا لکھا ہے غالباً کوئی فرد ایسا نہیں جو الفاظ اعتزال و معتزلی سے واقف نہ ہو، لیکن اگر کسی سے سوال کیجیے کہ اعتزال کیا ہے اور معتزلی کسے کہتے ہیں تو وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکیگا کہ اعتزال دہریت کو کہتے ہیں۔ اور معتزلی دہریہ کو۔ پھر دہریت و

دہریہ کی نسبت پوچھیئے تو وہ جھنجلا کے نہایت صاف الفاظ میں کہہ دیگا کہ کیا بے دین آدمیوں کا ذکر کرتے ہو۔ غرضکہ اس نشتر کرنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ معتزلی اُن کے پندار میں بے دین ہے اور اسلام سے خارج۔ لیکن اگر اُس شخص کو کسی طرح یقین دلا دیا جائے کہ جو کچھ وہ سمجھا ہے صحیح نہیں ہے۔ یا کسی معتزلی کو اسلام سے خارج کر دینا نادرست ہے تو اُسکو اپنے علم و یقین میں کس قدر محجوب ہونا پڑے گا۔ لہذا آج کی اشاعت میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اعتزال کسے کہتے ہیں اور معتزلی کس چیز کا نام ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اعتزال کی بنیاد صحابہ کرام کے اخیر زمانہ میں پڑی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے اسلام ہی سے اُس کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ جس کی تصریح آگے آئیگی۔ اُسوقت تک کہ آنحضرت کی ذات مقدسہ اس عالم میں رہی۔ مذہب نہایت اجمالی اور سادہ حالت میں رہا۔ عقاید کی تنہا تعلیم کلمہ توحید کا پڑھا دینا تھا اور اعمال کی نسبت فرائض خمسہ سے آگاہ کر دینا بس کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد مبارک میں جبکہ مبتغ حقیقی موجود تھا۔ اِس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ تھی اور نہ علایق کی وسعت نے اسلام کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ مذہب کی نسبت کچھ جاننے یا جاننے کی کوشش کرے۔ آنحضرت کے بعد جب اسلام کا دوسرا دور شروع ہوا اوسوقت بھی مصروفیت کا وہی عالم تھا کیونکہ روم و فارس کے معرکے پیش نظر تھے۔ اور کوئی صورت نہ تھی کہ فرزندان عرب کے دماغی و عملی انہماک کا رجحان کسی دوسری طرف ہوتا۔ لیکن جب اسلام نے زیادہ وسعت اختیار کی اور دوسری قومیں اسمیں آآکر شامل ہونے لگیں تو وہ زمانہ آیا جب اعتقادات و اعمال کے متعلق نسبتاً کچھ زیادہ غور و تعمق کی ضرورت پڑی۔ اور یہی وہ ضرورت تھی جسنے ابتدائی تعلیم کی وہ سادگی چھین لی۔ اور مذہب میں عقل کا دخل شروع ہوا۔

چنانچہ صحابہؓ کے زمانہ تک اعتقادات میں جو اختلاف ہوئے اُنمیں سے چند یہ ہیں۔

(۱) اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قایل تھے۔ حضرت عایشہؓ کو اس سے انکار تھا۔

(۲) عبداللہ بن عباس کا یقین تھا کہ رسُول اللہ نے خدا کو دیکھا۔ حضرت عایشہؓ کا عقیدہ اسکے خلاف تھا۔

(۳) ابوہریرہؓ اس بات کے قایل تھے کہ رونے پیٹنے سے مُردہ پر عذاب ہوتا ہے حضرت عایشہؓ مخالف تھیں۔

(۴) عبداللہ بن عمر سماع موتیٰ کے قایل تھے (یعنی اس بات کے کہ مُردہ سُنتا ہے) اور بعض صحابہ اِس کے خلاف تھے۔

اور پھر عقاید میں ہی نہیں۔ اعمال میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ چنانچہ وضُو اور مسایل وضُو میں مختلف اصحاب کے اقوال تھے۔ مگر ان جزئی اختلافات سے کوئی ایسی تفریق نہیں کی تھی۔ جس سے یہ حکم لگایا جاتا کہ مذہب کے دو یا زاید فرقے ہو گئے ہیں۔ سب مسلمان تھے اور مسلمان سمجھے جاتے تھے۔

اب حضرت علیؓ کا آخر زمانہ آیا (شاید ۳۸ھ ہجری) جب انھوں نے حَکَم کے فیصلہ سے اتفاق کر کے امیر معاویہ سے صلح کر لی۔ لیکن خود انھیں کے بہت سے ساتھیوں نے اِس صلح سے روگردانی اختیار کی۔ مذہب میں لا حکم الا اللہ حق و باطل کی تمیز میں ثالث کا فیصلہ کیا؟ چونکہ انھوں نے جمہور مسلمانان سے انحراف کیا۔ اسلیے یہ لوگ حضرت علیؓ کے دایرہ سے خارج سمجھے گئے۔ اور اسطرح اسلام میں اول اول دو فرقے پیدا ہو گئے۔ یعنی وہ لوگ جو حضرت علی سے علیحدہ ہو گئے خارجی سمجھے گئے اور وہ جو ان کے ساتھ رہے شیعہ بن گئے۔ اور حقیقتاً یہ وہ تفریق تھی جس کے اندر بالکل پالٹکس ہی کام کر رہی تھی۔

اِسکے بعد بنو امیّہ کا زمانہ شروع ہوا۔ اور وہ وقت آیا جب مذہب کی آڑ میں حکمرانی کی ہوسیں پوری کی گئیں۔ اور استحکام سلطنت کے لیئے سخت خونریزیاں اور سفاکیاں ہونے لگیں۔ ہر چند عرب میں وہ آزادی تو باقی نہیں رہی تھی جو رسول اللہؐ اور صحابۂ کرام کے زمانہ میں تھی۔ تاہم اس قدر جرأت تھی کہ وہ افسران سلطنت سے کبھی کبھی سوال کر بیٹھتے تھے کہ "تم مسلمان ہو کر کیونکر یہ خونریزیاں روا رکھتے ہو" جسپر انھیں یہ جواب ملتا تھا کہ "ہم کچھ نہیں کرتے ہیں۔ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے" چنانچہ انھیں سوال کرنے والوں میں ایک شخص معبد جہنی بھی تھا۔ وہ حضرت حسن بصری کی خدمت میں گیا اور اس مسئلہ کی نسبت کہ کیا "القدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" کا یہی مطلب ہے۔ اُن کی رائے دریافت کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ کذب اعداء اللہ (خدا کے دشمن جھوٹے ہیں) یہ تھی اعتزال کی اصلی بنیاد۔ اور یہ تھا اُسکا مختصر سا منشاء جس نے آگے چلکر دنیا میں بڑا اثر پیدا کیا۔ اور اک مستقل جدا مسلک ہو گیا+

چنانچہ سب سے پہلا مسئلۂ اعتزال جس سے مذہب اعتزال کی تاریخ شروع ہوتی ہے یہی مسئلۂ قدر ہے کہ "انسان جو بُرائیاں کرتا ہے وہ خود کرتا ہے۔ خدا نہیں کراتا"۔

اور اسی بنا پر معتزلین کو قدریہ بھی کہتے ہیں معبد جہنی نے سب سے پہلے اِس مسئلہ کی اشاعت کی، اور اس فرقہ کا نام قدریہ رکھا، کیونکہ خدا کا عادل ماننا اسی اعتقاد پر مبنی ہے کہ انسان اپنے افعال میں مختار مانا جائے۔ چونکہ معبد جہنی حکومت بنی امیہ کا شدید مخالف تھا، اور اس مسئلہ کا تعلق بھی یک گونہ پالٹکس سے ہے اسلیئے عبدالملک بن مروان نے ۸۰ھ میں حجاج کے ہاتھ سے اُسکو قتل کرا دیا، اور اسطرح اِس بانی اعتزال کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، لیکن ابھی تو اس

مذہب کو بہت ترقی کرنی تھی اس لیئے معبد کے بعد غیلان دمشقی نے جو قبطی النسل تھا۔ اس مسئلہ کو رواج دیا، اور اسکے ساتھ ہی ایک مسئلہ اور امر بالمعروف والنھی عن المنکر کا شامل کرلیا، مگر یہ مسئلہ اور بھی حکومت کے خلاف تھا، اور یہ نہایت بے باکی سے اعلان کرتا تھا اسلیئے ہشام بن عبد الملک نے دمشق بلا کر اسے پھانسی دیدی۔ ہر چند معبد و غیلان بہت کم زندہ رہے لیکن اسی قلیل زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے یہ مذہب قبول کرلیا۔ اور اسکے اصول قلمبند ہوکر شائع کئے جانے لگے۔ ۔ ۔ قبل اسکے کہ ہم غیلان کے بعد کے حالات لکھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معبد جہنی کے اس پرجوش و سرگرم ارادتمند کا ذکر ذرا تفصیل سے کریں، تاکہ یہ آسانی سے معلوم ہوسکے کہ بانیان اعتزال کی اخلاقی حالت کیا تھی جو خلاصۂ تعلیم اسلام ہے۔ یہ ابھی ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ وہ قبطی النسل تھا اور دمشق اسکا مسکن تھا، اس نے علم کلام کی تکمیل حسن بن محمد بن حنفیہ سے کی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کے ایسے مشہور علماء و اکابر حکماء میں سے تھا کہ حسن بصری جب اسکو دیکھتے تو کہتے کہ "اترون ھذا ھو حجۃ اللہ علی اھل الشام"، یعنی یہ شخص اہل شام کے لیئے اللہ کی حجت ہے۔ پھر یہی نہیں کہ ظاہری علوم کا ماہر ہو، زہد و تقویٰ، اور اعلائے کلمۃ اللہ میں بھی ایسا بیباک و آزاد تھا کہ اُس زمانہ میں بھی اوس کی کوئی نظیر نہ تھی چنانچہ اوسکی وہ تحریر دیکھنے کے قابل ہے۔ جس میں اوس نے خلیفہ عمر بن عبد العزیز کو لکھا ہے کہ:-

"خداتعالےٰ نے اسلام کی امامت کی دو تقسیمیں کی ہیں یعنی بعض امام تو ایسے ہیں جن کی نسبت فرماتا ہے کہ "وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا"، اور بعض امام ایسے ہیں جن کی نسبت "وجعلناھم

ائمۃ یدعون الی النار" فرماتا ہے، پس سمجھ لو کہ تم کس تقسیم میں ہو۔
اُمت تم سے نجات پانے والی ہے یا ہلاک ہونے والی"

پھر جس وقت عمر بن عبدالعزیز نے اُسے بلاکر کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم نظام سلطنت میں میری مدد کرو اور کوئی خدمت قبول کرو، تو اوس نے صاف کہہ دیا کہ مجھے سارے توشہ خانے سپرد کر دیجئے، تاکہ جتنی فضول و نمایشی چیزیں ہیں اون کو بیچکر روپیہ لوگوں کو واپس دیدوں، یہ منظور کیا گیا، اور وہ مہتمم توشہ خانہ بنا دیا گیا۔ اُس نے اِس خدمت کو ہاتھ میں لیتے ہی وہی کرنا شروع کیا جو اُسنے کہا تھا۔ چنانچہ صرف ریشمین موزے جو اِس غرض سے باہر نکالکر رکھے گئے تھے۔ ان کی قیمت تیس ہزار درہم تھی۔ غیلان ایک ایک چیز کو اٹھاتا جاتا تھا۔ اور بآواز بلند کہتا جاتا تھا کہ:۔

"آؤ اُن کے مال پر جو خاین تھے، آؤ اُن کے مال پر جو ظالم و غاصب تھے، آؤ ان کے مال پر جو رسول خدا کے بعد اُسکی سیرۃ و سنت کو بھلا بیٹھے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت و ایمان کے پیشوا اور دین و ملت کے امام تھے حالانکہ مسلمان اُن کے ظلم و ستم کی بدولت تنگدست و پریشان ہیں"

ھشام بن عبدالملک نے جب وہ تخت نشین ہوا۔ یہ سب باتیں سُنی اور ارادہ کر لیا کہ اِس شخص کو جو اُسکے اسلاف کے کارنامے پوری آزادی و دلیری سے بیان کرتا ہے، زندہ چھوڑنا قرین مصلحت نہیں ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ ایک دن جبکہ غیلان اپنے شاگرد صالح دمشقی کے ساتھ ملک آرمینیا جا رہا تھا ہشام کے سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ چند دن قید میں رکھنے کے بعد اُس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے گئے لیکن اُس کی یہ حالت تھی کہ خون کے فوارے جاری تھے اور وہ برابر یہی کہہ رہا تھا کہ:۔

"خدا انہیں ہلاک کرے، یہ وہ لوگ ہیں جو حق کو مردہ اور باطل کو زندہ کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو عزت دیتے ہیں اُن لوگوں کو جنکو اللہ نے ذلیل کیا، اور ذلیل کرتے ہیں اُن کو جنھیں خدا نے عزت دی"

ہشام سے ایک مصاحب نے کہا کہ اسکی فصاحت نے لوگوں کو رُلا رکھا ہے ضرورت تو زبان کاٹنے کی تھی۔ چنانچہ اوس کی زبان بھی کاٹ دی گئی اور وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بعد کو پھانسی کے ذریعہ سے اُسکی جان لی گئی۔

بہرحال اِس مختصر بیان سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ کتنا سچا مسلمان کیسا مستحکم عقیدہ رکھنے والا مومن تھا۔ حقیقت خلافت کے اعلان میں کس درجہ دلیر و بیباک اور پاکیزگی اخلاق کا کیسا اچھا نمونہ تھا۔

غرضکہ جب معبد و غیلان دونوں نہ رہے، تو خیال یہ تھا کہ اُن کی یادگار قایم رکھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ لیکن خدا کی شان اسی زمانہ میں دو شخص اور نمودار ہوگئے۔ جنہوں نے علمِ اعتزال کو اپنے ہاتھ میں لیکر اور زیادہ شہرت دی۔ یہ عمر بن عبید اور واصل بن عطا تھے جو ایک ہی ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اِن کا حال بھی ذرا تفصیل سے سننے کے قابل ہے +

(۱) عمر بن عبید کی کنیت ابو عثمان تھی۔ اور اسکا باپ عبید بصرہ میں سپاہی تھا۔ عمر کی طبیعت شروع ہی سے زہد و عبادت کی طرف راغب تھی حالانکہ اسکا باپ ایک رند مشرب سپاہی وضع آدمی تھا۔ جب باپ بیٹے دونوں باہر نکلتے تو لوگ کہتے "دیکھو کیا اللہ کی شان ہے، عبید سے جو شر الناس ہے، عمر کو پیدا کیا جو خیر الناس ہے۔ عبید سُنتا تو کہتا "ہاں تم لوگ سچ کہتے ہو۔ یہ ابراہیم ہے اور میں آذر ہوں۔ حافظ کا بیان ہے کہ عمر نے چالیس برس تک صبح کی نماز

مغرب سے وضو سے پڑھی اور چالیس حج پیدل چلکر کیئے، وہ دنیا اور اہل دنیا سے بالکل مستغنی تہا، اور اسی بے نیازی کی وجہ سے وہ بڑا حق گو تہا، چنانچہ ایک دفعہ عبداللہ بن عمر امیر عراق نے اپنے بصرہ کے عامل شبیب کو لکھا کہ اپنے شہر کی جماعت علمار کو میرے پاس بھیجو۔ جس میں عمر بن عبید کا ہونا ضروری ہے، شبیب نے بلاکر ان سے کہا کہ جایئے، انھوں نے انکار کردیا اور کہا کہ "تم جانتے ہو عبداللہ بن عمر کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ تمہارا حاکم کیسا ہے، اور تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری نسبت اُس کے جواب میں کیا کہوں گا،

ایک واقعہ اور خلیفہ منصور عباسی کے عہد کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کیسا عجیب و غریب شخص تہا۔ جب منصور تخت نشین ہوا تو عمر کو بلاکر اپنے برابر مسند پر بٹھانا چاہا، لیکن وہ نہیں بیٹھا اور جو نصیحت اُس نے کی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے،

"یہ حکومت جو آج تجھے نصیب ہے۔ تجہہ سے پہلے کسی اور کے پاس تہی، یاد رکھ کہ اگر دولت و حکومت کسی کے ساتھ وفا کرتی تو تجہہ تک نوبت نہ آتی۔ اسلیئے آج کی رات اُس دن سے ڈر جس کے بعد کوئی رات نہیں ہے"

جب عمر دربار سے اُٹھنے لگا تو منصور نے کہا میں نے آپکے لیئے دس ہزار درہم کا حکم دیا ہے۔ عمر نے جواب دیا مجھے اُسکی حاجت نہیں، منصور نے کہا "قسم خدا کی آپ کو یہ نذر قبول کرنا پڑے گی" عمر نے کہا "قسم خدا کی میں کبہی منظور نہیں کروں گا" یہ سُن کر منصور کا بیٹا مہدی بول اُٹھا کہ "افسوس تم امیرالمومنین کی قسم پر قسم کہاتے ہو" عمر نے منصور سے پوچھا یہ کون ہے۔

اُس نے جواب دیا کہ یہ میرا بیٹا ولی عہد مہدی ہے۔ عمر نے کہا "واللہ تم نے اِسکو وہ لباس پہنایا ہے جو شریفوں کا لباس نہیں ہے۔ اور ایسا نام رکھا ہے جسکے لایق وہ نہیں ہے پھر مہدی سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تیرا باپ قسم کا کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں کر سکتا" اِس کے بعد منصور نے پوچھا کہ کوئی حاجت تو فرمایئے۔ عمر نے جواب دیا کہ "بس اب آیندہ مجھے دربار میں بلانے کی زحمت نہ اُٹھائی جائے۔ منصور نے کہا تو اب میں آپ سے نہ مل سکونگا" اُسنے کہا "ہاں بس میری حاجت یہی ہے" اور یہ کہکر چلدیا۔

راستبازی میں وہ اِس درجہ مشہور تھا کہ ملکی معاملات میں بھی نہایت خطرہ کیوقت اُس کی بات کا اعتبار کیا جاتا تھا، چنانچہ جب نفس ذکیہ نے منصور پر خروج کیا اور بصرہ آیا تو منصور کو خبر لگی اور سیدھا بصرہ جا پہنچا لیکن نفس ذکیہ چلا گیا تھا منصور کو سخت تشویش تھی کہ ٹھیک پتہ کیسے معلوم ہو اتفاق سے عمر کے دوست زبردستی گھسیٹ کے منصور کے پاس لے گئے۔

اُس نے فوراً عمر سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص بصرہ میں ایسا ہے جس سے ہماری حکومت خطرہ میں ہو۔ عمر نے کہا "نہیں" منصور یہ سنتے ہی نہایت اطمینان سے واپس چلا گیا،

ایک شخص نے عمر سے مسئلہ قدر پر بحث کی۔ اُس نے جواب دیا کہ اِس مسئلہ میں جو کچھ خدا نے فرمایا ہے وہ مسلمانوں کے اطمینان کے لیئے کافی ہے۔ خدا نے فرمایا ہے "فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ" یعنی ہم اُن سے اُن کاموں کا سوال کرینگے جو وہ کرتے تھے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ ہم نے اُن کی تقدیر میں لکھدیا ہے اسکا سوال کرینگے، اور اِس سے خدا کا فعل اور انسان کا اپنے افعال میں مختار ہونا ثابت ہوتا ہے اُسے

کسی کی ملامت وتعریف کی بھی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ اُس سے ایک شخص نے کہا، مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ جب لوگ تمہیں بُرا کہتے ہیں۔ عمر نے کہا کبھی تم نے میری زبان سے بھی ان کی نسبت سُنا ہے۔ جواب ملا "کبھی نہیں" عمر نے کہا پھر تمہیں اُن کی حالت پر رحم آنا چاہیئے نہ کہ مجھ پر۔ اِس نے چونسٹھ برس کی عمر پائی، اور بڑے بڑے ناموری شاگرد جیسے خالد بن صفوان طلحہ بن زید، ابراہیم بن یحییٰ (جو امام شافعی کے اُستاد تھے) وغیرہ اپنے بعد چھوڑے، غالباً اِس کا حال بیان کرنے کے بعد ہمیں اسباب کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیسا شخص تھا۔ یا یہ کہ وہ مسلمان بھی تھا یا نہیں +

عمر بن عبید کے ساتھیوں میں واصل بن عطا بھی تھا، یہ بھی اُسی سال پیدا ہوا تھا جس سال عمر عالم وجود میں آیا۔ اِسکی کنیت ابو حذیفہ تھی اور لقب غزال۔ ہر چند اس کی پیدایش مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔ لیکن تعلیم وتربیت بصرہ میں ہوئی اور یہیں یہ جوان ہوا۔ یہ اپنے زمانہ کا ایسا فاضل اجل تھا کہ سارے عرب میں اِس کی فصاحت وبلاغت ضرب المثل تھی، وہ اتفاق سے الثغ تھا (یعنی حرف ر اُس سے ادا نہیں ہو سکتا تھا) اور اسی لیئے اکثر خاموش رہتا تھا۔ مگر اُسکی قادر الکلامی اور ادبی مہارت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی مجالس ومجامع میں خطبہ دینے کھڑا ہوجاتا تھا تو باوصف اس کے کہ وہ نہایت روانی وبیساختہ پن سے بولتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کہیں دوران تقریر میں حرف ر آجائے۔ چنانچہ ایک شخص نے اُس سے سوال کیا کہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ گھوڑے پر زین کسو تو "اسرج الفرس" کی جگہ تم کیا کہوگے۔ واصل نے فوراً کہا "البد الجواد"، پھر ایک شخص نے پوچھا کہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ "وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے نیزہ کو تانا"، تو "رکب فرسہ

وجود رحمہ " کی جگہ کیا کہو گے۔ اُس نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں کہونگا "استوی علی جوادہ وسحب عاملہ" اور یہ خصوصیت اس کی ایسی مشہور ہوگئی تھی کہ شعرار اپنے قصائد میں اسکا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ ابو محمد خازن نے اپنے ممدوح کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُسکا ایک شعر ہے کہ ؎

نعم تجنب "لا" یوم العطاء کما
تجنب ابن عطاء لثغة الراء

(یعنی میرا ممدوح فیاضی کے دن "نہیں" کہنے سے ایسا ہی بچتا ہے۔ جیسا واصل بن عطا الثغ ہونے کی وجہ سے حرف ر سے بچتا تھا)

اس نے علم کلام ابو ہاشم بن محمد بن حنفیہ سے سیکھا تہا۔ چونکہ وہ اکثر خاموش رہا کرتا تہا۔ اسلیئے لوگ گونگا سمجھنے لگے تھے، لیکن اُسکے علم و فضل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن عمر بن عبید کے پاس جا نکلا۔ عمر نے لوگوں سے خطاب کر کے کہا کہ "لوگ اُسے گونگا سمجھتے ہیں حالانکہ شیعہ، خوارج، ملاحدہ، اور دہریہ وغیرہ کے مذہبی عقاید و اصول کا جاننے والا اور دلایل سے اُن کا رد کرنے والا شخص اگر کوئی دنیا میں ہے تو واصل بن عطا ہے"۔

اس نے اپنے شاگردوں کو چاروں طرف خراسان و افریقہ، کوفہ، و آرمینا کی طرف بہیجا۔ اور مذہب اعتزال کو شہرت دی، تھوڑے ہی عرصہ میں اعتزال کا اثر ان تمام ممالک میں دوڑ گیا +

واصل و عمر دونوں حسن بصری کے حلقۂ درس میں بمقام بصرہ شریک ہوا کرتے تھے، وہ زمانہ وہ تہا جب خوارج کے اس مسئلہ کا کہ "گناہ کبیرہ کا

مرتکب کافر ہے" بڑا زور شور تہا، حسن بصری کی مجلس میں جب اسکا ذکر آیا
تو واصل نے کہا کہ میں تیسری شق اختیار کرتا ہوں یعنی "گناہ کبیرہ کا مرتکب
نہ کافر ہے نہ مسلمان" اسپر حسن بصری نے اظہار غصہ کیا اور یہ دونوں
وہاں سے اٹھ آئے اور اسی مسجد میں اپنا دوسرا حلقۂ درس قایم کیا۔ حسن بصری
کے حلقہ سے الگ دیکھ کر لوگوں نے انہیں معتزلہ کہنا شروع کیا اور اس لقب
کے ایجاد کا یہ پہلا دن تہا، اسکا ایک مناظرہ عمر بن عبید سے بڑا پر لطف ہے:-
"ایک روز حسن بصری کے درس گاہ میں واصل و عمرو دونوں موجود تھے-
واصل نے عمر سے کہا کہ تم گناہ کبیرہ کرنے والے مسلمان کو منافق کیوں کہتے ہو"
عمر:- "اس لیئے کہ خدا فرماتا ہے "والذین یرمون المحصنت ثم
لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدة ولا تقبلوا لهم
شهادة ابدا واولئك هم الفاسقون اور دوسری جگہ فرماتا ہے
ان المنافقین هم الفاسقون اسلیئے ہر فاسق منافق ہے، کیونکہ فاسق
پر الف لام تعریف کا داخل ہے،
واصل:- خدا تو یہ بہی فرماتا ہے کہ "ومن لم یحکم بما انزل الله
فاولئك هم الظالمون" اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ صاحب
کبیرہ کو ظالم کہہ سکتے ہیں. جیساکہ اُسے فاسق کہہ سکتے ہیں. پھر تم نے
خدا کے اس قول سے کہ الکافرون هم الظالمون صاحب کبیرہ کی
تکفیر کیوں نہیں کی جبکہ یہاں بہی لفظ ظالم پر الف لام تعریف کا داخل ہے۔
پس جس طرح تم یہ نتیجہ نکالتے ہو کہ ہر فاسق منافق ہے۔ اسی طرح یہ بہی کہو کہ ہر
ظالم یعنی مرتکب کبایر کافر ہے، حالانکہ تمام علماء اسپر متفق ہیں کہ صاحب کبیرہ
کافر نہیں ہے"

عمرو۔ یہ سُنکر چپ ہوگیا۔ پھر واصل نے کہا "اہل قبلہ کے مختلف گروہ جس بات پر متفق ہیں وہ قابل تسلیم ہے یا جس میں اُن کا اختلاف ہے"۔
عمرو نے جواب دیا کہ "وہی بات قابل تسلیم ہے جسپر سب کا اتفاق ہو"۔ واصل نے کہا "تمام اہل قبلہ صاحب کبیرہ کو فاسق کہنے میں متفق ہیں، چنانچہ خوارج مرتکب کبیرہ کو فاسق مشرک کہتے ہیں۔ شیعہ فاسق کافر نعمت کہتے ہیں حسن بصری فاسق منافق کہتے ہیں اور مرجیہ فاسق مومن"، پس فاسق کہنے میں سب کا اتفاق ہے، اور باقی ناموں میں اختلاف ہے اسلیے متفق علیہ نام فاسق اختیار کرنا چاہیئے۔ پس صاحب کبیرہ کو نہ مومن کہہ سکتے ہیں نہ منافق۔ نہ مشرک نہ کافر۔ بلکہ صرف فاسق کہہ سکتے ہیں،
عمرو نے یہ سُنکر کہا کہ "میں حق کا دشمن نہیں ہوں۔ تمہارا قول صحیح ہے سب لوگ اسپر گواہ رہیں کہ میں واصل کے قول کو تسلیم کرتا ہوں"
عبداللہ بن حسن کے دونوں بیٹے محمدؐ و ابراہیم جو خاندان اہل بیت سے تھے مسئلہ قدر میں واصل کے پیرو تھے۔ ایکدفعہ عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے محمد سے مخاطب ہوکر کہا کہ تمہاری تمام باتیں پسندیدہ ہیں مگر افسوس کہ تم مسئلہ قدر میں واصل کے پیرو تھے۔ ایکدفعہ عبداللہ بن حسن نے اپنے بیٹے محمد سے مخاطب ہوکر کہا کہ تمہاری تمام باتیں پسندیدہ ہیں مگر افسوس کہ تم مسئلہ قدر کو مانتے ہو، اور اوسپر اعتقاد رکھتے ہو۔ محمد نے کہا "ابا جان میرا یہ عقیدہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو میں اسکے چھوڑ دینے پر قادر ہوں یا نہیں اگر قادر ہوں تو یہی میرا مذہب ہے۔ اور اگر قادر نہیں ہوں تو پھر ملامت بے کار ہے"، عبداللہ بن حسن نے کہا۔ اب کبھی تم پر خفا نہ ہونگا"
غرضکہ علم کلام کا پہلا موجد یہی ہے اور پھر ایک علم کلام کیا۔ اصول

فقہ کے مہمات اصول اس نے بیان کئے۔ ملحدوں کا رد اول اسی نے کیا، مسایل فقہیہ کے چار ماخذ قرآن، حدیث، اجماع۔ قیاس، اول اسی نے قرار دئے یہ مسئلہ کہ "نسخ احکام میں ہو سکتا ہے نہ کہ اخبار میں"، اول اول اسی نے بیان کیا۔

غرضکہ عمرو اور واصل فضل وکمال میں عدیم المثیل اور مذہب اعتزال کی بنا مستحکم کرنے والے تھے۔ اور پھر زہد و ورع کی یہ حالت کہ ایکدفعہ حسن بصری سے کسی شخص نے عمرو کی نسبت سوال کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ "ایسے شخص کی نسبت کیا سوال کرتے ہو جس کو گویا فرشتوں نے ادب دیا ہے اور انبیاء نے اسکی تربیت کی ہے۔ میں نے اوس سے زاید کسی کے ظاہر و باطن کو یکساں نہیں پایا"

بہرحال ان دونوں کی نکتہ آفرینیوں سے مذہب اعتزال نے بہت وسعت اختیار کر لی اور بہت سے دقیق مسایل علاوہ مسئلہ قدر کے شامل ہو گئے رفتہ رفتہ دربار خلافت میں بھی اسکا ذکر ہونے لگا۔ اور آخر کار یزید بن ولید بن عبد الملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کر لیا۔ بنو امیہ میں یہ پہلا خلیفہ تھا، جس نے اعتزال کی حمایت کی۔ اسکے بعد ولید بھی معتزلی رہا۔ یہانتک کہ ۱۲۶ھ میں ولید مر گیا، اور اُس کے ۶ برس بعد ۱۳۲ھ میں دولت بنو امیہ کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

جب دولت بنو امیہ ختم ہو گئی، اور خاندان عباسیہ نے اُس کی جگہ لے لی، تو عقاید اعتزال جو بنو امیہ کے زمانہ میں ایسا مستحکم نشو و نما پا چکے تھے، اس قدر جلد فنا نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ اُن کا تعلق اگر ایک طرف بادشاہان بنی اُمیہ سے تھا، تو اُس سے زیادہ دوسری طرف عام پبلک سے تھا، اور جیسا آگے چلکر معلوم ہوگا گو اِس خاندان کے بعض بادشاہوں نے اعتزال کی بنیاد متزلزل کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، لیکن خدا کی شان ہے، کہ بعض افراد

حکومت ایسے ہی پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اس نے انتہائی ترقی حاصل کر لی اور کچھ عرصہ تک State Religion (مذہب حکومت) اختیار رہا دولت عباسیہ کا دوسرا زمانہ ہوا منصور، اگرچہ خود وہ اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ لوگ اُسے معتزلی سمجھیں یا اعتزال کی نسبت اُسکی طرف کریں، لیکن چونکہ عمرو بن عبید (جسکا مفصل ذکر پہلے صفحات میں ہو چکا ہے) سے اس کی بچپن کی دوستی تھی اور دونوں نے مدت تک ایک ساتھ تحصیل علم کی تھی اور منصور اس کے زہد واتقاء اور دیانت وخدا پرستی کا دل سے معترف تھا اس لیئے با وصف اس کے کہ وہ خود معتزلی نہ تھا، اسکے عہد میں اعتزال کو بہت ترقی ہوئی، واصل بن عطا نے تمام اسلامی ممالک میں اپنے نقیب بھیجد یئے کہ مذہب اعتزال کی منادی کریں، عبد اللہ بن الحارث کو مغرب بھیجا اور بہت سے لوگوں نے اُسکے ہاتھ پر بیعت کر لی حفص بن سالم کو خراسان روانہ کیا، وہاں جہم بن صفوان سے جو مذہب جہمیہ کا بانی تھا مناظرہ ہوا اور جہم نے زک پائی، اس طرح ایوب کو الجزائر حسن بن ذکوان کو کوفہ عثمان طویل کو آرمینیہ بھیجا اور بہت سے لوگوں نے یہ مذہب قبول کر لیا،

کچھہ تو اسباب اشاعتِ اعتزال کی یہ تھے اور کچھہ یہ کہ جب منصور انتظام سلطنت واستحکام حکومت کی طرف سے فارغ ومطمئن ہوکر بیٹھا، تو اُس نے اپنی توجہ علوم وفنون کی اشاعت پر مبذول کی اور پہلوی، سریانی، یونانی، ہندی زبانوں سے حکمت وفلسفہ کی کتابیں ترجمہ کرائیں، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ترجمے ملک میں بہت جلد پھیل گئے۔ اور ہر گوشۂ سلطنت سے اظہار پسندیدگی کیا جانے لگا، تمام ملک میں فلسفیانہ مذاق پھیل گیا، اور یہود عیسائی، پارسی قوموں کو جو حکومت کی رعایا تھیں، سلطنت [illegible] بہت توجہ ہوگئی، جب مذاقِ فلسفہ

اِس قدر بڑھ گیا، تو اسلام کے مسائل پر نکتہ چینیاں شروع ہوئیں اور منصور نے بزور شمشیر ان خیالات کو روکنا مناسب نہ سمجھکر بحث و مباحثہ، تحقیق و تدقیق کی عام اجازت دے دی، غیر مذہب والوں کے مقابلہ میں محدثین و فقہا اپنی روایات و منقولات لیکر آئے۔ لیکن وہاں اِن سے کیا کام چل سکتا تھا، لاچار معتزلہ کو میدان میں آنا پڑا، کیونکہ یہ مسایل مذہبیہ کو دلایل عقلی سے ثابت کرنے کے مدعی تھے، جب معتزلہ نے غیر مسلمین کے اعتراضات کو رفع کردیا اور اسلام کے اوپر حملہ کرنے والی قومیں ساکت کردی گئیں، تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ حمایت اسلام کے لیئے مذہب اعتزال سے زیادہ موزوں مذہب دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا، چنانچہ ملک کے تمام ممتاز دلوں میں اعتزال کی وقعت قایم ہوگئی، اور ہزاروں آدمی معتزلی بن گئے۔

منصور کے بعد مہدی کا زمانہ سلطنت شروع ہوا۔ اور اِس نے مذہبی آزادی کو بالکل روک دیا، مہدی کا بیٹا، ہارون الرشید جب تخت نشین ہوا تو وہ بھی حکمت و فلسفہ سے ناآشنا تھا، لیکن چونکہ اُس کے دربار میں خاندان برمکہ کو بہت درخور حاصل تھا اور وہ بڑے روشن خیال آزادطبع اور علم دوست تھے اِس لیئے دہرچند اعتزال نے کوئی نمایاں ترقی تو نہیں کی لیکن، اُسکا قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا، لیکن ہارون الرشید کے بعد جس نے مناظرہ کی مجلسیں حکماً بند کرادیں، اور اسطرح گویا اعتزال کو سخت صدمہ پہنچایا مامون تخت نشین ہوا۔ اور اسمیں شک نہیں کہ مامون کا زمانہ اعتزال کے لیئے بہترین عہد ثابت ہوا اور اُس کی ترقی اوج کمال پر پہونچ گئی، یہاں تک کہ خود مامون نے علانیہ اِسی مذہب کو اختیار کیا اور تمام اکابر علمائے اعتزال سے دربار بھر گیا، ابوالہذیل علاف اور نظام، مامون الرشید کے

استاد تھے، اور مامون اُن کا بہت ادب کرتا تھا۔ اب چونکہ ابو الہذیل و نظام کا ذکر آگیا ہے اسلیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصراً اُن کا حال یہان بیان کر دیا جائے:۔

ابو الہذیل علاف ۱۳۱ھ میں پیدا ہوا، مامون کا استاد اور بصرہ کے علمائے اعتزال کا پیش رو تھا۔ علامہ احمد بن یحییٰ مرتضےٰ زیدی نے اُس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے،

"وکان نسیج وحدہ وعالم دھرہ ولم یتقدمہ احد من الموافقین لہ ولا من المخالفین" ابو الہذیل اپنے عہد کا بے مثل عالم تھا، اور اُس کے موافق و مخالف علمار میں کوئی اُس کا ہمسر نہ تھا، شروع ہی سے اُسکی طبیعت فلسفہ و علم کلام کی طرف راغب تھی، علم کلام اُس نے عثمان طویل سے حاصل کیا جو واصل بن عطا کا نامور شاگرد تھا اور فلسفہ کی دقیق و مشکل کتابیں اپنے مطالعہ سے حل کیں، ابو الہذیل کا ابھی عالم شباب ہی تھا کہ ایک یہودی عالم بصرہ میں آیا اور بڑے بڑے متکلمین کو مباحثہ میں عاجز کر دیا، ابو الہذیل نے یہ سُنکر اپنے چچا سے درخواست کی کہ "مجھے بھی اسکے پاس لے چلیے"، چچا نے کہا "کہ بڑے بڑے علمائے کلام کو اُس نے مباحثہ میں بند کر دیا ہے، تم اُس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکوگے"، مگر وہ نہیں مانا، اور آخر کار اُس کا چچا اپنے ساتھ لے گیا، جس وقت یہ دونوں پہونچے "موسیٰؑ کے مسئلہ نبوت پر بحث ہو رہی تھی، اور اُس یہودی نے سب کو اپنی زور تقریر سے خاموش کر دیا تھا۔

ابو الہذیل نے وہاں پہونچتے ہی اُس سے کہا کہ "آپ پہلے سوال کرنا مناسب سمجھتے ہیں، یا مجھے پہلے سوال کرنے کی اجازت دینگے"، یہودی نے

جواب دیا کہ "پہلے میں سوال کروں گا"، ابو الہذیل نے کہا کہ "اچھا وہ سوال کیا ہے"، یہودی نے پوچھا کہ "تم موسیٰ کی صداقت نبوت کو تسلیم کرتے ہو یا نہیں"؟ ابو الہذیل: "موسیٰ جن کی نسبت آپ پوچھتے ہیں اگر وہی نبی ہیں جنھوں نے ہمارے نبی کی بشارت دی اور ان کی رسالت کی تصدیق کی تو بیشک وہ سچے نبی ہیں اور اگر کوئی اور موسیٰ مراد ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا۔"

یہودی نے زک اٹھا کر دوسرا سوال کیا کہ "توراۃ کو تم سچی کتاب مانتے ہو یا نہیں" ابو الہذیل نے اسکا بھی جواب ویسا ہی دیا کہ اگر توراۃ سے مراد آپ کی وہی توراۃ ہے جس میں ہمارے نبی کی بشارت موجود ہے تو بے شک ہم اُسے خدا کی کتاب مانتے ہیں اور اگر کوئی اور توراۃ ہے تو ہم تسلیم نہیں کرتے۔

ابو الہذیل جب تحصیل فلسفہ و کلام سے فارغ ہو گیا تو اُس نے مخالفین اسلام سے مناظرہ و مباحثہ شروع کیا اور ایسی سرگرمی کے ساتھ اسمیں مصروف ہوا کہ بہت تھوڑے زمانہ میں سارا ملک اُس کی فصاحت و خوش بیانی، کمالات علمی و فن مناظرہ کی خوبی کا قایل ہو گیا۔

ابو العباس اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں نے ابو الہذیل و جاحظ سے زیادہ فصیح اللسان کسی کو نہیں دیکھا"، یزدان بخت رئیس مانویہ اور ہشام بن حکم سے جو فرقۂ مجسمہ کا سرگروہ تھا، اِس نے مباحثے کیے، اور مجوس و ثنویہ فرقوں کے علمار کے ساتھ بھی بڑے بڑے معرکۃ الآرا مناظرے کئے، اور سب میں کامیاب رہا۔ اُسکی خصوصیت استدلال یہ تھی کہ ہمیشہ معترض کو نہایت مختصر جواب سے بند کر دیا کرتا تھا، اور اُس کی قوتِ بیانی کا اثر تھا کہ تین ہزار سے زاید غیر مذہب کے لوگ مسلمان ہو گئے۔

ایک دفعہ دوران گفتگو میں ابو الہذیل نے ایک فلسفی عالم سے، جو اعراض سے وجود مستقل کا منکر تھا، کہا خدا نے فرمایا ہے "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ" یعنی زنا کرنے والے مرد و عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو تازیانوں کی سزا دو، اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ "والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یاتوا باربعۃ شہداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ" یعنے جو لوگ پاکدامنوں پر تہمت لگاتے ہیں، اور چار گواہ پیش نہیں کر سکتے اُن کے ۸۰ کوڑے مارو، اِن آیتوں میں زانی کی حد زیادہ ہے یا قاذف (تہمت لگانے والے کی)۔

فلسفی "زانی کی حد زیادہ ہے" ابو الہذیل "کتنی زیادہ ہے" فلسفی "بقدر بیس کے" ابو الہذیل "کیا لفظ جلدہ سے جلاد کا ہاتھ مراد ہے؟" فلسفی "نہیں" ابو الہذیل "کیا اِس سے کوڑا مراد ہے" فلسفی "نہیں" ابو الہذیل "کیا اس سے مجرم کی پشت مراد ہے" فلسفی "نہیں" ابو الہذیل "کیا اس سے وہ فاصلہ مراد ہے جو کوڑے اور پشت مجرم کے درمیان ہے" فلسفی "نہیں" ابو الہذیل "تو کیا تمہارے نزدیک ایک لاشئے سے بقدر بیس کے زیادہ ہو سکتی ہے؟"

ایک بار مجلس مناظرہ میں اُس نے ایک مجوسی سے پوچھا کہ "تمہارے نزدیک آگ کی حقیقت کیا ہے؟" مجوسی "آگ خدا کی بیٹی ہے" ابو الہذیل "اور گائے کیا مرتبہ رکھتی ہے۔" مجوسی "گائے خدا کی فرشتہ ہیں جن کے بازو کٹ گئے ہیں" ابو الہذیل "پانی کیا ہے" مجوسی "خدا کا نور" ابو الہذیل "بھوک اور پیاس کیا ہیں؟" مجوسی "شیطان کا فقر و فاقہ" ابو الہذیل "زمین کو کون اٹھائے ہوئے ہے" مجوسی "بہمن فرشتہ"

ابو الہذیل" تو دنیا میں مجوسی سے زیادہ کون برا ہو سکتا ہے، جنہوں نے خدا کے فرشتوں کو پکڑ کر ذبح کیا۔ پھر خدا کے نور سے دھویا اور خدا کی بیٹی پر رکھہ کر بہونا پھر اوسے شیطان کے فقر و فاقہ کے سپرد کیا اور اسکو بہمن فرشتہ کے سر سے جو خدا کے فرشتوں میں سب سے زیادہ معزز ہے اٹھایا اور اُسکی کھال کھینچ لی"

ایک بار حسن بن سہل کی مجلس میں جا نکلا، ایک نجومی امیر کی مسند کے پاس بیٹھا ہوا۔ ابو الہذیل نے پوچھا یہ کون جوان ہے جسکو امیر نے اس قدر عزت بخشی، امیر نے کہا کہ یہ نجومی ہے، ابو الہذیل" نجوم کا حساب جانتا ہے یا اُن کے احکام" امیر" یہ نجوم کے احکام جانتا ہے" ابو الہذیل" یہ علم تو بالکل جھوٹا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھہ اس سے پوچھوں" امیر" ہاں، ہاں ضرور سوال کیجئے" ابو الہذیل نے ایک سیب ہاتھ میں لے لیا اور نجومی سے خطاب کر کے کہا کہ" آپ بتائیں میں اس سیب کو کھاؤنگا یا نہیں" نجومی نے حساب کر کے کہا کہ آپ اُسکو ضرور کہائیں گے" ابو الہذیل نے سیب کو ہاتھ سے رکھدیا اور کہا" کہ میں اسکو ہرگز ہرگز نہ کھاؤنگا نجومی نے کچھہ سوچکر کہا کہ اچھا اب دوبارہ آپ سیب کو ہاتھ میں لیں، میں پھر غور کرتا ہوں، شاید کوئی غلطی رہ گئی ہو، ابو الہذیل نے اب کے دوسرا سیب ہاتھ میں لیا، امیر نے کہا کہ" آپنے دوسرا سیب کیوں اٹھایا، ابو الہذیل" اسلیے کہ اگر آپکے نجومی نے کہا نہیں کھاؤ گے تو میں اس سیب کو ضرور کھا جاؤں گا" نجومی شرمندہ ہو کر مجلس سے اُٹھ گیا۔

ایک دفعہ بصرہ میں ایک نو وارد شخص اُسکے پاس آیا اور کہا کہ مجھے قرآن میں چند شبہات ہیں، میں نے بہت کوشش کی کہ وہ رفع ہو جائیں،

لیکن کسی طرح تشفی نہ ہوسکی مجھے چند احباب نے مشورہ دیا کہ آپ کے پاس جاؤں، اسلیئے آپ خدا کے لیئے میری تشفی کر دیجئے، ابوالہذیل "میں سنوں کہ وہ شبہات کیا ہیں" نووارد "قرآن کی چند آیتوں میں مجھے تناقض معلوم ہوتا ہے، اور چند آیتیں ایسی ہیں جن میں زبان کی غلطی معلوم ہوتی ہے"

ابوالہذیل "آپ ایک ایک آیت پر الگ الگ اپنے شبہات بیان کرنا چاہتے ہیں یا اپنے تمام شکوک کا جواب ایک ہی دفعہ سُننا پسند کرتے ہیں" نووارد "اگر ایک ہی دفعہ تمام شبہات کا جواب دینا ممکن ہے تو یہ اور بھی مناسب ہے"

ابوالہذیل "آپ کو معلوم ہے کہ محمد صلعم عرب کے شرفا میں سے تھے، اور اُن کی زبان مستند اور غیر مطعون تھی، اور وہ اپنی قوم کے نزدیک سب سے زیادہ عاقل تھے" نووارد "بیشک وہ ایسے ہی تھے" ابوالہذیل "آپ کو معلوم ہے کہ عرب کے لوگ نہایت تندخو، سرکش اور جھگڑالو تھے" نووارد "یہ بھی سچ ہے" ابوالہذیل "آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل عرب نے ہمارے پیغمبر کی تکذیب و مخالفت میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہیں اٹھا رکھا" نووارد "بے شک یہ بھی صحیح ہے" ابوالہذیل "آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے متناقض کلام یا غلط گوئی کا الزام ہمارے پیغمبر پر نہیں لگایا" نووارد "کبھی نہیں" ابوالہذیل "تو اہل عرب کی شہادت چھوڑکر جو اپنی زبان سے خوب ماہر تھے آپ کسی جاہل کی بات کا کیوں اعتبار کرتے ہیں" نووارد یہ سنکر مسلمان ہوگیا *

ابوالہذیل کو عربی اشعار کثرت سے یاد تھے، اور اکثر اپنے کلام میں اُن سے استناد کرتا تھا ابوحسن شمامہ کہتے ہیں کہ ابوالہذیل جب ما تورج سکے

دربار میں مجھ سے خطاب کرتا تو ہمیشہ میرا نام لیکر مجھ سے بات کرتا، اور مامون ہمیشہ کنیت کے ساتھ یاد کرتا۔ مجھ کو کئی دفعہ اسپر غصہ آیا لیکن آداب مجلس کا خیال کر کے خاموش ہو ہو جاتا تھا، ایک بار ابوالہذیل نے مجلس مناظرہ میں اپنے کلام کی سند میں سات سو اشعار پڑھے، یہ دیکھ کر میں دنگ ہوگیا، اور میں نے کہا کہ اب آپ کو اختیار ہے میرا نام لیکر مجھسے بات کیجئے یا میری کنیت کے ساتھ خطاب کرے"۔

ایک دفعہ ابوالہذیل، صالح بن عبدالقدوس سے ملنے گیا جو ثنوی المذہب تھا، اسی زمانہ میں صالح کا جوان لڑکا مرچکا تھا۔ صالح کو رنجیدہ دیکھ کر ابوالہذیل نے کہا کہ "آپ تو انسان کو کھیتی کی طرح سمجھتے ہیں جو پھلتی پھولتی اور اپنے وقت پر کٹ جاتی ہیں پھر آپ کیوں غمگین ہیں" صالح: "نہیں مجھے افسوس صرف اس وجہ سے ہے کہ اُس نے کتاب الشکوک نہیں پڑھی تھی" ابوالہذیل "وہ کیا کتاب ہے" صالح "جو کتاب الشکوک میری ہی تصنیف ہے اور جو اسکو پڑھتا ہے موجودات میں شک کرنے لگتا ہے کہ شاید وہ نہیں ہیں اور معدوم اشیاء کی نسبت شک کرنے لگتا ہے کہ شاید وہ ہیں" ابوالہذیل: "تو آپ اپنے بیٹے کی نسبت شک کریں اور یہی خیال کریں کہ وہ مرا نہیں ہے، اور اسی طرح آپ شک کریں کہ مرحوم نے کتاب الشکوک پڑھ لی ہے حالانکہ اُس نے نہیں پڑھی +

ابوالہذیل سے ایک عالم نے اثناء گفتگو میں کہا کہ آپ عالم کا حادث ہونا ثابت کریں مگر بغیر اس کے کہ اس میں پہلے حرکت وسکون کا موجود ہونا تسلیم کیا جائے ابوالہذیل نے کہا "سبحان اللہ آپ کی مثال تو بالکل اُس آدمی کی سی ہے جو اپنے مخالف سے کہے کہ آؤ میرے ساتھ قاضی کے پاس چلو لیکن دیکھو اپنے دعوے پر کوئی دلیل پیش کرنا"

اشخاص ثلاثہ

یورپ میں جب سے جنگ و جدل قتل و قتال کا بازار گرم ہوا ہے "اتحاد ثلاثہ" اور "ائتلاف ثلاثہ"، مرکب الفاظ نے اک عجیب قسم کی دلچسپی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کے "اخبارات" و "رسالہ جات" میں "اتحاد ثلاثہ" اور "ائتلاف ثلاثہ" کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ ہم سے بھی چند احباب متقاضی ہیں کہ ہم بھی اتحاد ثلاثہ اور "ائتلاف ثلاثہ" پر کچھ اپنے خیالات ظاہر کریں اور اگر "اتحاد ثلاثہ" و "ائتلاف ثلاثہ" پر اظہار خیالات ؟ خلاف احتیاط سمجھیں تو کسی اور "ثلاثہ" پر کوئی مضمون لکھیں۔ ہمیں فرمائش احباب کی تعمیل میں تو کچھ عذر نہیں ہے۔ لیکن فی زمانہ مشکل اک بہت بڑی یہہ پیدا ہو گئی کہ اگر ہم کسی سیاسی !! مسئلہ پر کوئی مضمون لکھتے ہیں تو اس زمانہ کی نزاکت ہمیں اسکی اجازت نہیں دیتی اور اگر ؟ کسی اخلاقی سبجکٹ پر قلم اُٹھاتے ہیں رفتار زمانہ سے اسکی مساعدت کی بھی توقع نہیں ہوتی کیونکہ بعض طبیعتیں آجکل "اخلاق" و "سیاست" جیسے متفرق و متباین الفاظ و خیالات کو بھی مترادف سمجھنے لگ گئیں ہیں۔ اس قسم کی خرابیوں کی وجہ سے یہہ زمانہ انڈیا بھر میں اس قسم کی مضامین نویسی کے واسطے خطرہ سے پاک نہیں ہے کیسی ہی طبیعت کی صفائی اور پاک بازی سے کوئی پولیٹیکل یا سیاسی یا اخلاقی مضمون لکھا جائے ممکن نہیں کہ دوست دشمن کی نشانہ بازی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ ایسے زمانہ میں مضمون نگاری کے واسطے حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے جب تک "حکومت"، اور اہل ملک کی طرف سے

پوری آزادی میسر نہ ہو کسی سمجھدار شخص کا کام نہیں ہے کہ وہ **پولٹیکل اکانمی** بیان کرے یا امور **سیاست** کی گتھیاں سلجھانیکی کوشش کرے یا **اخلاق** اور فلسفہ **اخلاق** پر کوئی لکچر دے۔

خصوصاً مجھ جیسے کمزور طبیعت والے شخص کے لئے یہہ ہی اک مجبوری کیا کچھ کم ہے کہ زمانہ میں انقلاب عظیم پیدا ہو رہا ہے جو دوست تھے اونمیں دشمنی پیدا ہو رہی ہے اور جو دشمن تھے اونمیں دوستی اور اتفاق کا پر جوش سمندر موجزن ہو رہا ہے۔ ایسے نازک وقت میں ہمارے احباب کی فرمایش نے اک غلجان میں ڈال دیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا کروں کوئی مضمون لکھوں اور لکھوں تو کیا لکھوں۔

حالت دل مضطر لکھوں چھوٹا سا اک مضمون لکھوں
افسانۂ لیلیٰ لکھوں یا قصۂ مجنوں لکھوں

سب سے پہلے جانتا ہوں کہ **مشاہیر ثلاثہ** جو اک تاریخی ناتمام مضمون جو رسالہ "ید بیضا" میں شائع ہوا تھا اُسے پورا کر ڈالوں مگر اوس زمانہ کا سا نہ طبیعت کا "جوش و خروش ہے نہ دل میں وہ اگلی سی امنگ کافی ہے لہذا یہہ ارادہ بھی نقش بر آب ثابت ہوتا ہے۔ پھر چاہتا ہوں کہ کسی یگانۂ روزگار شخص کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرکے کچھ فکر سخن ہی کروں اور اک ایسی ....

غزل لکھوں

اوستاد کو میدان میں آج ہمنے پچھاڑا | چھاتی پہ چڑھے کود کے ڈاڑھی کو اُکھاڑا
اوستاد کے مصرعہ پہ لگاتے ہیں گرہ ہم | شاعر ہمیں کردیجئے یا پیر بخارا
یہہ طرفہ غزل ہمنے کہی مولوی صاحب | اصلاح سے دل کیجئے خورسند ہمارا

پہلی ہی غزل پر میں ہوا داد کا خواہاں　　　شاہا چہ عجب گر بنوازند گدا را

مگر جب یہہ خیال دامنگیر ہوتا ہے کہ ۱۹۱۵ء کا زمانہ اب کہاں کہ ظریفانہ چاشنی کی قدر و منزلت ہوتی ہے اک طرف لکھنؤ میں منشی سجاد حسین صاحب اخبار اودھ پنچ کے کالموں میں لطائف و ظرائف سے مضامین کا انبار لگاتے رہتے تھے اور دوسری طرف میرٹھ میں سید مرتضیٰ حسین صاحب بیان دیزدانی اخبار طوطی ہند میں پسند خاطر احباب کے لئے سامان عجیب کی فراہمی میں شب و روز ہمہ تن مصروف نظر آتے تھے۔ اصل یہہ ہے کہ خیال آرائی"... یا "مضمون نگاری" کا "شوق" یا بالفاظ دیگر "خبط" جو کچھ ہی کہئے اچھا خاصا مالیخولیا کا مرض ہے خیال پیدا ہوتے ہی اک اُدھیڑ بن ہی شروع ہو جاتی ہے اب مجھے ہی یہ اتفاق پیش آیا ہے کہ کئی شب و روز ہو گئے باوجود "غور" و "خوض" "تلاش" و "جستجو" سے کوئی اچھا عنوان مضمون نویسی کے واسطے نہ ملا۔

"اُلجھن" "کشمکش" اور "مخمصات" کے ہجوم نے مبہوت سا بنا رکھا ہے خواہشات کا سلسلہ طول ہوتا گیا مگر کوئی موزوں عنوان ذہن نشین نہ ہوا۔ مسلسل اور متواتر خواہشات کے طومار نے گھیر لیا اور پھر ہر ایک مشکل اور دشوار تر بقول شخصے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہہ غزل ملا دوپیازہ کے اک شاگرد نے لکھی تھی جس پر اُنہوں نے یہہ اصلاحی شعر لکھا تھا ؎

یہ طرفہ غزل لائے ہیں دستک کر آگے　　　صد لعنت و پھٹکار چنیں ذہن رسا را

قصہ مختصر یہہ کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور میں حضرت لسان الغیب

حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ کی طرف رجوع ہوا۔ دیوان نکالکر دیکھا تو اس شعر پر نظر پڑی۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است — با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

تہوڑی دیر تک میں اِس شعر کے معنی اور مطالب پر غور کرتا رہا پھر طبیعت کی خواہش پر آہستہ آہستہ گنگناتا رہا اور یکایک "حسرت"، "امتیاز"، دیگر اشخاص ثلاثہ کی وقعت اور عظمت نے دِل میں گھر کر لیا اور تقاضائے طبیعت ہوا کہ ان "اشخاص ثلاثہ"، پر ہی قلم فرسائی کرنی چاہیئے +

تجویز عنوان کی گتھی سلجھی تھی کہ مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ آپ مشہور رسالہ "اردوئے معلے" کے ایڈیٹر اور علیگڈہ کالج کے ممتاز تعلیم یافتوں میں سے ہیں۔ نثر و نظم دونوں خوب لکھتے ہیں علیگڈہ کے بی اے کلاس کا کوئی طالب علم شاعر نہیں کہلایا جاتا بجز حسرت کے۔ اردو شاعری میں فی زمانہ جو نازک خیالی "لطافت"، اور "سادگی" آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ میر و مرزا کے کلام کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپکی زبان اس درجہ "شستہ"، اور "پاکیزہ"، ہے کہ اگر مولانا آزاد مرحوم کا تذکرہ آب حیات کہلایا جا سکتا ہے تو مولوی حسرت کا کلام نظم اور عبارت نثر آب مقطر کہلائے جانے کی ضرور مستحق ہے۔

اردوئے معلے میں اک مرتبہ نزاکت پاکیزگی اور صفائی بیان کے سلسلہ میں مولانا حالی مرحوم مغفور اور ڈاکٹر اقبال کی شاعری میں چند اعتراض ہوئے تھے اور اک دلچسپ بحث درستی زبان کے متعلق شروع ہوئی تھی مگر افسوس اوسکا سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا اور

یہہ لٹریری قابل قدر خدمت پیدا ہوکر ناپید ہوگئی - اوراب امید نہیں کہ کسیکو اس کا حوصلہ ہو اردوئے معلیٰ ایک **بےنظیر** ادبی رسالہ تھا اگر صرف علم ادب ہی کی ترقی کے متعلق ادسمیں ہنرمندی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ کام کیا جاتا تو یقیناً ضروریات ملک کی ایک بہترین خدمت انجام ہوتی رہتی مگر بدقسمتی سے اوس میں **سیاسی** مضامین بھی شامل کردئے گئے۔

ادب و شاعری کے ساتھ **پولٹیکل** اور **سیاسی** بلند پروازی ایک بے جوڑ بات تھی اگر "پولٹیکل" اور "سیاسی" مضامین کی اشاعت ضروری ہی خیال کی گئی تہی تو اِس ضرورت کے واسطے علحدہ ایک رسالہ ہونا چاہئے تھا جس میں باحتیاط تمام **سنجیدہ** اور **پُرمغز** پولٹیکل مضامین کی مبانہ روی کے ساتھ اشاعت کی جاتی تو ضرور مُفید نتیجہ پیدا ہوتا اور رسالہ ہرقسم کے نقصان سے بھی محفوظ رہتا۔ مگر افسوس کہ مولانا حسرت پر کانگریسی رنگ زیادہ غالب ہوگیا اور اُنھوں نے اردوئے مُعلیٰ میں ادب و شاعری کے پہلو کو ضعیف کرکے "پولٹیکل" اور "سیاسی" مضامین کی چاشنی کو غالب کردیا جس کی وجہ سے خود اونکو بعض تکالیف کا سامنا ہوا اور اہل نظر کے نزدیک رسالہ بھی بے لطف سا ہوگیا۔ اسی غلطی کی وجہ سے اُردوئے معلیٰ گمنامی کے پردہ میں رُو پوش ہوکر گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہے:-

عنقا کی طرح گم ہو جو شہرت پسند ہی
پایا اُسی نے نام کہ جو بے نشاں رہا

اور مولانا حسرت بھی گلہ مند نظر آتے ہیں جیسا کہ اونکے تازہ کلام سے مترشح ہوتا ہے۔

کلام حسرت

مر مٹیں گے جو غم ہجر کی ایذا ہے یہی
اک نہ اک روز ترے عشق میں ہونا ہے یہی

آج اغیار ہیں جو یار تھے کل تک کیا خوب / آپ کے دامنِ انصاف پہ دھبا ہی یہی
ناگوارا ہے بہت تلخیٔ ہجران لیکن / تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم / یا مگر اونکی محبت کا نتیجہ ہے یہی
یہ جو اک دردِ محبت کی خلش ہے حسرت / مقصدِ دل ہے یہی جانِ تمنا ہے یہی

ہمیں مولانا حسرت کی خداداد قابلیت کا اعتراف ہے مگر اونکی "دو پالیسی" سے اختلاف ہے ہم تو یہ چاہتے ہیں۔

یار کا پاسِ نزاکت دل ناشاد رہے
نامہ رکتا ہُوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

مولانائے موصوف کی اک غزل حال میں شائع ہوئی ہے جسے ہم **خلش خار** سے موسوم کرکے یہاں لکھتے ہیں ناظرین خیال فرمائیں کہ حسرت کے دل سوختہ میں کیسی کیسی دلدوز آہیں پوشیدہ ہیں۔ ... ...

زیرِ دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھ تو لو / ناتواں کرتے ہیں دل تھام کر آہیں کیونکر

خلش خار

ہم سحر ہو سرِ دحق کا سرانجام کہاں / دیکھیں اس صبح صداقت کی ابھی شام کہاں
عشق میں صبر و سکوں اے دلِ ناکام کہاں / اس دلارام کی خواہش ہے تو آرام کہاں
خاص تعزیر کے لایق ہے گنہگاریٔ عشق / درخورِ جاں ہے تری سرزنشِ عام کہاں
پندِ ناصح وہ سُنے خوفِ ملامت ہو جسے / پاسِ ناموس کہاں عاشقِ بدنام کہاں
ترکِ آداب کا عشاق سے بیجا ہے گلہ / جب نہو موردِ الزام تو الزام کہاں
کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے اسمیں / نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں

حسرت زار ہے اور کشمکشِ یاس و اُمید
اب وہ بالیدگیٔ شوق کا ہنگام کہاں

نیاز

ابو المعانی جناب نیاز محمد خاں صاحب "نیاز" فتح پوری شاعری اسٹیج پر جب کبھی تشریف لاتے ہیں اور شاعرانہ کوئی پارٹ کرتے دکھائی دیتے ہیں تو ونس مور کا اک شور مچ جاتا ہے۔ آپ کے فیض کرم سے ہندوستان کے ممتاز اور قابل قدر رسالہ "ادیب" اور "پنجاب ریویو" سیراب ہو چکے ہیں اور اب موقت الشیوع پرچے بھی مستفیض ہو رہے ہیں آپ کے کلام میں وہ "درد" اور "اثر" ہے کہ داغ اور حالی جیسے سحر بیان اشخاص کی یاد تازہ رہنے کی کچھ امید ہے تو ایسی ہی شخص سے ہے جیسے حضرت نیاز ہیں۔ زمانہ حال میں جناب نیاز کے تازہ "افکار" میں "ہذیان" "محبت" اک ایسی نفیس نظم شایع ہوئی ہے کہ داد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ع

اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

ہذیانِ محبت

پھر سے مجھے طوق و سلاسل کا خیال آنے لگا
پھر سے مجھے مرغ حرم رہ رہ کے تڑپانے لگا

پھر نمایاں ہو چلا دامن مرے ملبوس کا
یعنی اشکوں میں مرے پھر رنگ خوں آنے لگا

سینۂ عریاں پہ چوٹیں پھر ابھر آنے لگیں
پھر گریباں تک مرا دستِ جنوں آنے لگا

پھر وہی ہے ناخن غم اور اوسکی کاوشیں
پھر مجھے دردِ نہاں کچھ آج تڑپانے لگا

پھر بہار آئی چمن میں زخم دل آئے ہوئے
پھر مرے داغ جنوں آتش کے پرکالے ہوئے

عقل کہتی ہے کسی کی پردہ داری چاہئے
دل یہہ کہتا ہے نمودِ بیقراری چاہئے

کسکو سمجھاؤں کہ تجدیدِ وفا اک جرم ہے
اس میں پہلے عہد کی نا استواری چاہئے

مصلحت غربا ہی زا ہر زخم دل ظاہر نہو
میں یہہ کہتا ہی نہیں خونابہ باری چاہئے

ہے سکون اک طور کا خاموشی زنداں میں بہی | مجھکو لیکن رخصت فریاد و زاری چاہئے
جی مرا پھر بیٹھے بیٹھے آج گھبرانے لگا | یعنی دیوار و در سے پھر میں سر کو ٹکرانے لگا

حضرت دلگیر

سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبر آبادی رہنے والے ہیں آگرہ یا اکبر آباد عہد اسلامی سے دور عروج کی یادگار ہے اُردو کی ترقی اور نشو و نما میں بہی حصہ دار رہا ہے کیونکہ میر و غالب کے مولد ہونے کا فخر اسکو حاصل ہے اُردو رسائل کی کساد بازاری کی حالت میں خیال ہوتا تہا کہ آگرہ سے بہی اُردو زبان خدمت کا کچھ سلسلہ شروع ہو تو مناسب ہے. مسرت کا مقام ہے [illegible]اق طبیعت نے اونکے "نقاد" جیسے اعلے درجہ کے [illegible] رسالوں میں ایک مفید اضافہ کرا دیا دلگیر خود اک [illegible]ور اس [illegible] اور سخن شناس شخص ہیں اور اون کے احباب کا حلقہ بہی اچھا خاصا وسیع ہے جو ناظم بہی ہیں اور نثار بہی ہیں یہی وجہ ہے اس کے مضامین اچہے ہوتے ہیں اب تہوڑے عرصہ سے اس میں تصاویر کی اشاعت کا بہی اہتمام کیا گیا ہے بہرحال اب یہہ پرچہ "ادیب" اور "مخزن" کا قائم مقام خیال کیا جاتا ہے۔ قریب زمانہ میں مولنا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم مغفور کی تاریخ وفات دلگیر کے قلم سے جو نکلی ہے بلحاظ سوز و گداز اپنا نظیر نہیں رکھتی دل چاہتا تہا کہ حالی کی وفات پر دو آنسو بہانے کو کچھ "آہ" و "بکا" سامان چاہئے ہم ممنون ہیں کہ اون کی آہ شرربار نے ہمارے دل سوختہ سے بھی چار آنسوؤں کا خراج وصول کر لیا +

تاریخ وفات مولانا حالی

نہ اب تبسم نہ خندۂ گل نہ نغمے اب شورِ بلبل
زبانِ سوسن ہے گنگ بالکل خموش ہے صحرائے باغ دہلی

نہ کوئی ساقی نہ مے ہے باقی وہ گرمیِ بزم داغ تک تھی
کہاں ہے کیسی شراب کیسی پڑا ہے خالی ایاغ دہلی

مگر تھی پھر بھی نمود کچھ کچھ کرشمے دیتی تھی دکھ کچھ کچھ
اٹھے جو حالی صدا یہ آئی ہوا ہے اب گل چراغ دہلی

عزیز الحسن یاد سکندر آبادی بلند شہر

غزل

وہ نگاہیں کیا کہوں کیونکر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے [illegible]

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اُس شوخ نے
ہستیاں جب [illegible]

پھونک دی اک روح دیکھا زور اعجاز جنوں
جتنی سانسیں سینے میں تھیں تا [illegible]

چند تصویریں دبی جو مختلف وقتوں کی تھیں
بعد میرے زینت دیوارِ زنداں ہو گئیں

اُڑ کے دل کی خاک کے ذرے گئے جس جس جگہ
رفتہ رفتہ وہ زمینیں سب بیاباں ہو گئیں

بچ رہی تھیں جو اسیرانِ کہن کی ہڈیاں
رفتہ رفتہ صرفِ استحکامِ زنداں ہو گئیں

کس دلِ آوارہ کی میت گھر سے نکلی تھی عزیز
شہر کی آباد راہیں آج ویراں ہو گئیں

عزیز لکھنوی

رباعی

اسباب خور و نوش نہ جب تو نے دیئے
اے رب قدیر کوئی کس طرح جیئے

ہم اسکو بھی رزق ہی سمجھتے لیکن
بھر پیٹ گناہ بھی تو ہم نے نہ کیئے

نیاز فتحپوری

گل کی فریاد

اے! حضرتِ انسان تو اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی ہے میری دانست میں تو سخت خود غرض اور نفس پرور ہے اور میرے لحاظ سے تو تو سخت ظالم ہے۔ تجھ کو یہ غرہ ہے کہ کائنات میں جو شے موجود ہے وہ سب تیری آسائش و استعمال کے لئے ہے۔ یہ خیال دراصل غلط ہے۔ فی الحقیقت نیچر میں ہر شے کے لئے اپنا اپنا کام مقرر ہے اور اس کی ہستی اپنے لئے ہے۔ زبردستی یا ظلم سے کسی کا استحقاق زائل کرنا اشرف المخلوق کے رتبے سے تجھے گرا دیتا ہے۔ میں بلبل کو تجھ سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دیکھ! وہ میرے رنگ و بو پر کیسی دلدادہ ہے۔ صبح و شام میرے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ میری بہارِ حسن سے اپنے دل و جان کو تازہ کرتی رہتی ہے فی الواقعہ وہ اربابِ معنی سے ہے اس کی شرافت دیکھ کہ وہ مجھے ٹہنی سے جدا نہیں کرتی۔ میرا جوبن لوٹتی ہے لیکن کس خوش اسلوبی سے اس حبشی کالے کلوٹے بھنگے کو دیکھ جسے لوگ بھونرا کہتے ہیں۔ کس طرح وہ میرے ارد گرد دیوانہ وار گردش کرتا ہے مجھے صانع قدرت کی ایک حسین مخلوق سمجھ کر میرے طواف میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی حالت میں مست ہے موسیقار کے مانند گنگناتا ہر وقت وجد میں رہتا ہے میری ایذا کے درپے ہونا تو درکنار میرے گن گاتا رہتا ہے۔ اس سے ہی سبق لے۔

او ظالم! نیچر نے تجھے جتلا دیا ہے کہ میرے خار میری حفاظت کیلئے بنائے گئے تھے تو انہیں بھی توڑ دیتا ہے۔ تیرا چاقو بے زبان جانوروں کی جان لینے سے نہ ٹلا تو میں کس گنتی میں ہوں۔ کیا یہ حظ تیرے لئے کافی نہیں کہ تو میری بو باس

سے فردوس دباغ بنا میری خوش رنگی سے جنت نگاہ بنا لیکن مجھے ٹہنی سے جدا کر۔

او ظالم! میری شکائتیں بیشمار ہیں۔ کاش میری فریاد سننے والا کوئی ہوتا تو درد دل سناتا اور انصاف پاتا۔ تاہم تجھے ہی سناتا ہوں تاکہ شاید تیرا سنگین دل نرم ہو۔ ممکن ہی کہ تو اپنی زبردستی سے باز آجائے۔ آخر میری زندگی نہایت مختصر ہے عمر طبعی چند گھنٹے ہے۔ کاش تو مجھے چند گھنٹے جینے دے۔ اب میری فریاد سُن۔

۱۔ جب تجھے کسی دیوتا۔ پیر۔ فقیر۔ مرقد سے التجا کرنی ہوتی ہی انکی خوشنودی مزاج مطلوب ہوتی ہی۔ مجھ غریب کی جان پر بن آتی ہی۔ میں چڑہاوے کا کام دیتا ہوں۔

۲۔ جب تجھے وارفتگان کی تربت پر جانے کا موقع ہوتا ہی مجھ بیکس کو مردوں کے سینے پر چھوڑ آتا ہے میری ہی وہیں ہوائی تربت بنجاتی ہے۔

۳۔ جب تجھے کسی اپنے سے بزرگ بنی نوع انسان کی تکریم وتحسین منظور ہوتی ہی مجھ پر آفت آنے لگتی ہی۔ میرا ہی دل جانتا ہی جس طرح سے میرے سینے میں سوئیاں چبھو چبھو کر ہار بنائے جاتے ہیں۔ اور ظالمان درجۂ اولی کے زیب گلو ہوتے ہیں۔

۴۔ جب آدمی زاد بیاہ شادی کرتے ہیں تو باران گلاب و بارش گل شروع ہوجاتی ہے اور مجھ کس مپرس کی شامت آتی ہی۔ کہیں سہرے پر لٹک رہا ہوں کہیں گجرے میں جکڑا ہوا ہوں کہیں سیج میں پامال ہو رہا ہوں۔

۵۔ واہ رے تیری آسائش پسندی! تجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تو میرے پاس آکر میرے حسن وجمال سے حظ حاصل کرے۔ نہیں بلکہ مجھے ٹہنی سے توڑ گلدستہ بنا گول کمروں اور کھانے کے کمروں میں رکھ دیتا ہے جہاں مجھے مرگ مفاجات جلد آجاتی ہی۔ تیری خود غرضی یہانتک ہے کہ دستبو بنا کر مجھے بٹن ہول میں لگا کر مجھ نیم مردہ کو سینے سے لگائے رکھتا ہی۔ واہ رے تیری فرط محبت!

۶۔ تو کن کن غیر جنسوں کے ساتھ مجھے ہم آغوش کرتا ہے کبھی تلمون میں مجھے ہم خواب کرتا ہے کبھی سرسوں سے میری صحبت ہوتی ہے۔ تاکہ میرے جوہر ان میں منتقل ہوں۔ میری رُوح اُن کے جسم میں داخل ہو۔ اور بقول تیرے وُہ "وبس" جائیں اور میں خانہ برباد ہو جاؤں۔

۷۔ کبھی تو مجھے روغنوں میں حل کرتا ہے۔ میرا رنگ زائل کر دیتا ہے بلبل کی بد دعائیں تجھ پر اثر نہیں کرتیں۔ میری رُوح تن سے جدا کر کے مجھے روغن میں مقید کر دیتا ہے۔ اِس فرطِ اُلفت کا نام تو نے عطر رکھ چھوڑا ہے

۸۔ کبھی تیری رحمدلی اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ مجھے قرع انبیق میں ڈال آتش سوزاں پر رکھ کر جوش دیتا ہے۔ اس پر بھی صبر نہیں۔ پھر دو آتشہ کرتا ہے۔ اِس پیار کے اظہار کا نام عرق ہے۔ او ظالم! تیری جبین پر کاش عرقِ انفعال آتا۔ مگر کہاں۔

۹۔ او ظالم! تو مجھے میری موت کے بعد بھی نہیں چھوڑتا۔ تجھے یقین نہیں آتا کہ میں کما حقہ مرا ہوں۔ میری پتیاں سُکھاتا ہے۔ پھر مجھے نسخوں اور معجونوں میں ڈالتا ہے اور اُن معدوں کی امداد کرتا ہے جن میں تیر سے خنجر سے اور دیمی رُوح ہلاک کر کے داخل کئے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ او بے رحم آدمی زاد۔ تو تو انسان بھی کہلانے کا مستحق نہیں اشرف المخلوقی تو تیری لُغات میں نہ ہونا چاہئے۔ حق تو یہ ہے کہ تیرا کیا قصور ہے۔ یہ معمّا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں کسی اذیت میں دوسرے کا عیش ہو۔ اور مجھے تو ذوق کا یہ شعر پڑھنا کافی ہے۔

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

غزلیں

ہجر میں اس بت کے تارِ اشکِ غم ٹوٹے نہیں — دم میں دم جبتک ہے دامانِ قضا چھوٹے نہیں

عہد پر قائم رہینگے آپ کیونکر مان لوں — کیا یہ پیمانِ وفا میرا ہے جو ٹوٹے نہیں

وہ تو سننے کے لئے تیار تھے احوالِ دل — کیا علاج اس کا کہ ہم ہی منہ سے کچھ پھوٹے نہیں

یاد رکھنا آگئی پیری تو پھر پچھتاؤ گے — گر جوانی میں جوانی کے مزے لوٹے نہیں

زندگی جبتک ہے یارب عیش دنیا کم نہ ہو — جامِ مے منہ سے صراحی ہاتھ سے چھوٹے نہیں

نوچ ڈالے بلبلِ بے خانماں کے بال و پر — یا الٰہی ہاتھ کیوں صیاد کے ٹوٹے نہیں

رات دن اس فکر میں ہوں اے فصیحِ باوفا
رشتۂ الفت جہانتک ہو سکے ٹوٹے نہیں

فصیح

چٹکیاں لے رہے ہو تم دل میں — پیار کرلے کوئی نہ محفل میں

درد ہو داغ ہو غرض کچھ ہو — اک تری آرزو نہ ہو دل میں

جیتے جی اے غبارِ ناکامی — ہو گئے دفن کوئے قاتل میں

تم نے ترکش میں ان کو رکھا تھا — ہمنے تیروں کو دی جگہ دل میں

مے سے کر لے وضو تو چل زاہد — منبر ہے پیرِ مغاں کی محفل میں

بسملوں کی دعا ہے اور بڑھے — باڑہ خنجر میں نوک قاتل میں

انتہا ہے یہ سوزِ الفت کی — خون کے بدلے آگ ہے دل میں

کیا بگڑتا ہے کیوں رسائی ہو — دُور بیٹھے رہیں گے محفل میں

تم نہا کر چلے جو دریا سے — اشک بھر آئے چشمِ ساحل میں

تم جگر صاف کر گزرتے ہو
ٹھان لیتے ہو بات جو دل میں

جگر بسوانی

تمدن

نوشتہ تقدیر

"دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو فلسفہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئیں"

کہتے ہیں کہ شہر لکھنؤ میں ایک بڑا ودیادان پنڈت تھا۔ قدرت نے اسکو سوچنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھیں عطا کی تھیں۔ ایک روز شام کے وقت وہ تن تنہا دریا کے کنارے ایک دور اور غیر آباد مقام پر سیر کر رہا تھا کہ اسکی نگاہ ریت پر کسی آدمی دبی ہوئی چیز پر پڑی جو سورج کی مغربی شعاعوں میں آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ پاس جاکر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ کسی مردے کی پیشانی کی ہڈی ہے۔ قریب تھا کہ گرا دے مگر یکایک اسکی نگاہ چند لکیروں پر پڑی جو اسپر کچھ بے قاعدہ سی کھچی ہوئی تھیں اور چونٹیوں کی رفتار سے مشابہ تھیں۔ پنڈت بہت سے ایسے علموں سے ماہر تھا جن سے عوام الناس ناواقف ہیں اور ایسی پراسرار باتیں پڑھ سکتا تھا جن کا دوسروں کو علم نہیں اسنے مردے کی پیشانی کی تحریر کو بغور دیکھکر اسکے نوشتہ تقدیر کو اپنے علم کی رو سے پڑھا

"جہاں کہیں سے بن پڑے بری بھلی طرح اپنا پیٹ پالو گلیوں اور کوچوں میں مارے مارے پھرو۔ کھیت اور میدان میں سو۔ دریا کے کنارے پر کتے کی موت مرو۔ پھر ...... دیکھو ہوتا کیا ہے"

یہ الفاظ حیرت خیز اور تعجب انگیز تھے اور انکا مطلب اس سے بھی زیادہ

وحشت زا تھا مگر جس بات سے برہمن حیران تھا وہ یہ تھی کہ یہ تحریر اسوقت لکھی گئی تھی جب یہ شخص پیدا ہوا تھا اور خدا جانے کس کس مصیبت اور آفت سے اسنے زندگی کے دن پورے کئے ہونگے۔ اب موے پر سو درے کی مثال وہ کیا ہے جو اس غریب کو سہنا ہوگا اسے مرے ہوئے خدا معلوم کس قدر عرصہ ہوا ہی یہانتک کہ اسکے گوشت و پوست کا نشان بھی باقی نہیں رہا اور ہڈیاں گل سڑ کر غبار ہوگئی ہیں اسپر اب کیا باقی رہا ہے جو اسکو پیش آئے۔ اسی پیچ و تاب میں برہمن نے ٹھان لی کہ اب دیکھنا چاہئے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اور ہڈی کو احتیاط سے اپنی دھوتی کے دامن میں باندھکر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہونچکر اسنے بڑی حفاظت سے اُس ہڈی کو اپنے کمرے میں ایسی چیزوں کے ساتھ جنکی اپنے پیشے کے متعلق اسکو ضرورت پڑتی تھی اور جہاں اسکی نجوم اور رمل کی کتابیں رہتی تھیں نہایت پوشیدہ طور پر رکھا ہر روز صبح کے وقت اپنا بستہ کھولتا اور خبرداری سے جب کوئی دیکھتا نہو اس میں سے بدیں خیال وہ ہڈی نکالتا اور دیکھتا کہ اسمیں کوئی تغیر تو واقع نہیں ہوا۔ اسی طرح مدتیں گذر گئیں اور کچھ بھی ظہور میں نہ آیا۔ اس اثنا میں برہمن کی عورت اسکی تمام کارروائی سے آگاہ ہوگئی اور دل ہی دل میں بے قرار تھی کہ آخر یہ کیا کرتا ہے اور تاک میں رہتی کہ برہمن کسی وقت غافل ہو اور میں اسکا بستہ کھولکر اس راز سے واقف ہوجاؤں ایک روز قریب کے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا اور برہمن کو صبح سویرے منھ اندھیرے وہاں سے بلاوا آیا اور اسکو فی الفور اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے جانا پڑا۔ عورت جو موقعہ کی تلاش میں تھی وقت کو غنیمت سمجھی اور فوراً برہمن کی کوٹھڑی میں گھس اور بستہ کھول گوہر مقصود نکالا تو سوا اُس استخوان بوسیدہ کے اور کچھ برآمد نہوا۔ بہت سر پٹکا کوئی بات سمجھ میں آئی آخر سوچی کہ ہو نہو یہ ہڈی میری سوتن کی ہے اور برہمن کو اس سے اسقدر محبت تھی کہ مرے بعد بھی اسکی

پیشانی اس حفاظت سے رکھی ہے اور صبح صبح اٹھکر اسکی پوجا کیا کرتا ہے بس
یہ خیال آنا تھا کہ آتش حسد سے آگ بگولا ہوگئی۔ ہڈی کو باورچیخانہ میں لیجا کر بل بٹے سے
پیسکر سرمہ کیا اور بدرو میں ڈالدیا برہمن نے آکر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ آخر اپنی بیوی
سے پوچھا تو وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑگئی اور گالی گلوچ کا ایسا طوفان اٹھایا کہ بیچارہ
برہمن موںھ دیکھتے کا دیکھتا رہگیا۔ آخر جب اسنے بتایا کہ میں نے اس کتیا سوار کی
ہڈی جسکا تم روز درشن کرتے تھے اور جسکی پوجا کے بغیر تم رہ نہیں سکتے تھے بدرو
میں ڈالدی تو اسنے وہاں جا کر دیکھا۔ مگر سوائے ایک بھوری بھوری خاکستر کے
جسمیں پاخانہ سے پیلا پیلا پانی بہہ کر لگیا تھا اور کچھ نہ پایا۔ غرض استخوان شکستہ کا یہ انجام
ہوا۔ اور یوں اس خوفناک نوشتۂ تقدیر کی آخری پیشینگوئی پوری ہوئی۔

برہمن کچھ موںھ میں بڑبڑاتا باہر چلاگیا اور جورو اپنی کامیابی پر گویا پھولی جامے میں
نہ سماتی تھی۔ رات کو خاوند اور بیوی آرام کے لئے اپنے کمرے میں گئے۔ بیوی تو
سوگئی اور خاوند کو موت اور حیات کے پیچیدہ مسئلے سوچتے سوچتے آدھی رات
ہوگئی اسوقت اسنے جو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو اپنے بستر کے عین برابر چھت میں سے
ایک باریک سا تاگا لٹکتا ہوا پایا۔ پہلے تو کچھ خیال نہ کیا مگر رفتہ رفتہ تاگا بڑھکر اسکی
چارپائی کے قریب ہو پہنچنے لگا۔ برہمن آنکھیں ملنے لگا اور قریب تھا کہ اپنی بیوی کو
آواز دے کہ تاگا ایک نہایت زہریلا سانپ بن گیا اور اسنے برہمن کی ناک پر
کاٹ کھایا۔ پیشتر اسکے کہ برہمن اٹھکر بیٹھے سانپ ایک روزن دیوار میں سے نکلکر
کمرہ سے باہر ہوگیا یہ بمشکل اٹھکر دروازہ کھولکر باہر نکلنے کو تھا کہ سانپ نے ایک
خوفناک بھیڑیے کی شکل اختیار کی اور ہمسایہ کے بچے کو جو صحن میں سو رہا تھا پھاڑ
کھایا۔ برہمن نے اب جان ہتیلی پر رکھ لی اور اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا اتنے میں
بھیڑیے نے ایک نوجوان کی شکل اختیار کی اور برہمن کی طرف مڑکر متبسم نگاہ ہوا

سے دیکھا۔ برہمن نے دلکو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اسکے پاؤں میں گر پڑا کر یہ کیا ماجرا ہے اس نوجوان نے جواب ایسی آواز سے دیا جس میں نہ خفگی تھی نہ ناراضگی تھی کہ میں موت کا گماشتہ ہوں اور دنیا میں جس جس طرح لوگوں کی موت لکھی ہوئی ہے اسکو پورا کرنے آیا ہوں۔ بس اب میرا پیچھا نہ کرو۔

برہمن اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا تعاقب سے باز نہ آیا۔ فرشتے نے پھر مڑکر کہا کہ اب کیا چاہتے ہو برہمن نے کہا کہ میں صرف اسقدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری موت کس طرح لکھی ہے۔

موت کے گماشتہ نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم دلیر آدمی ہو مگر اب بھی اسکی آواز میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے ترس اور خوف پایا جاوے۔

برہمن اپنی بات پر اڑا رہا اور پھر وہی سوال کیا۔ اسپر فرشتہ نے رعد کی آواز میں جواب دیا کہ تم دریائے گنگا میں کام نہنگ کا طعمہ ہوگے۔ کیا تم اپنی تقدیر سے بھاگ سکتے ہو اور پیشتر اسکے کہ برہمن اس خوفناک پیشین گوئی کے معنے سمجھے نوجوان ہوا ہوگیا۔

برہمن نے گھر آکر اپنی جورو کا کریا کرم کیا اور ہمیشہ کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دیا اسنے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ ہیبت ناک گنگا کے نزدیک نہ رہونگا۔ کچھ ہی ہو یا کچھ ہو مگر ایسی جگہ جاکر رہونگا جہاں لوگوں نے اس خوفناک دریا کا نام بھی نہ سنا ہو۔ کہنا آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے۔ بجائے اسکے کہ مغرب کی طرف جاتا جہاں خواہ لوگوں نے گنگا نام تو سنا ہوگا مگر اسکی شکل نظر نہ آتی، وہ مشرق کی طرف روانہ ہوا اور آخر برما کے علاقہ میں پہونچ گیا۔ یہاں بود و باش اختیار کرلی۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر اُسے سجایا اور اپنے کاروبار میں مشغول ہوا۔ اسکی لیاقت اور دانشمندی کا جلدی شہرہ ہوگیا۔ اور وہاں کے مہاراج ادہراج کے دربار تک اسکی رسائی ہوگئی اتفاق سے مہاراجہ کو اپنے لڑکے کے واسطے ایک لائق پنڈت کی ضرورت تھی اسکے فضل و کمال کا شہرہ تو سن ہی چکا تھا۔ اب دیکھا تو ہمہ دانی اور دانشمندی

میں اسے کہیں بڑھکر پایا۔ غرض اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا۔ برہمن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا اور اس نے اپنی پہلی عمر کے واقعات کی طرف کبھی اشارہ ہی نہ کیا لڑکا اس اثنا میں بڑا ہوگیا اور اب وہ وقت آپہونچا کہ مہاراج نے اپنے تمام اراکین سلطنت کو جمع کرکے دریافت کیا کہ شہزادہ کی تعلیم کا کیا بندوبست کرنا چاہیے۔ سب نے عرض کیا کہ نوجوان شہزادہ تمام علوم میں یکتا اور سارے فنوں میں کامل ہو گیا ہے اب مناسب ہے کہ گھر سے باہر قدم رکھے اور سیر ممالک سے اپنی نظر کو وسیع کرے چنانچہ سب سامان سفر تیار ہوا اور شہزادہ نے اپنے اتالیق سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں اتالیق نے صاف انکار کر دیا۔ یہ خبر مہاراجہ تک پہنچی جسنے پنڈت کو ہمیشہ نہایت مطیع اور وفادار پایا تھا اسکو اس سے نہایت مایوسی ہوئی اور پنڈت سے بضد ہوا کہ آپکو ضرور شہزادہ کے ہمراہ جانا ہوگا۔ پنڈت کو اب انکار مشکل ہوگیا اور ناچار اپنی رام کہانی اور گنگا رانی کی واردات سنانی پڑی۔ اسپر درباری اور خود شہزادہ بھی خوب قہقہہ لگاکر ہنسے اور پنڈت کی توہم پرستی پر اسکو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ پنڈت بہت کھسیانہ ہوا۔ مگر سب کے اصرار و خوشامد و انعام بیش بہا کے وعدوں سے شہزادے کے ہمراہ رکاب جانے پر راضی ہوگیا۔ مگر شہزادے اور اُسکے باپ سے اس امر کا وعدہ لے لیا کہ اگر کہیں شہزادہ دریائے گنگا کے نواح میں پہنچ جائے تو میں اپنے وطن کو لوٹ آؤنگا۔

لگن دیکھکر شہزادہ روانہ ہوا اور بہت سے مقامات کی سیر کی یہانتک کہ ان کا کیمپ جنوبی بنگال میں پہنچ گیا۔ برہمن نے اپنا وعدہ یاد دلایا مگر شہزادہ نے ایک نہ سُنی اور اپنا تمام فلسفہ اور منطق برہمن کو سمجھانے میں خرچ کر ڈالا کہ آخر آپکو اس مقدس دریا سے کیوں نفرت ہے۔ پھر کہا کہ تنخواہ و انعامات موجودہ سے

دس گنا لیجئے اور ایک بار میرے ساتھ چلکر دریا کے کنارے پر کھڑے ہو جائیے ورنہ لوگ کیا سمجھیں گے کہ آپ ساداناایسی وہمی باتوں کے خیال سے اپنے اوپر جگ ہنسائی کراتا ہے۔

شہزادے کا اصرار۔ انعام کی توقع اسپر ہمراہیوں کی چھیڑ چھاڑ برہمن سے شکوک سکے زائل ہونے اور انجام کار وہ راضی ہو گیا۔ فوراً ایک سو سورما جوان زرہ بکتر پہنے۔ ہتھیاروں سے اوپچی بنے۔ ڈہال تلوار لگائے اُچھل پڑے اور دریا کے کنارے پہونچے۔ شہزادہ اور اتالیق بھی آکر اپنے گھوڑوں سے اُترے اور دریا کی طرف دیکھنے لگے۔ پانی کس قدر صاف اور دریا کیسا خاموش تھا اسکے تمام وسعت پر ایک لہر تک نہ تھی۔ کیا اس میں گھڑیال ہوگا سب بے اختیار ہنسنے لگے یہانتک کہ خود برہمن بھی اس خوشی میں شریک ہونے سے باز نہ رہ سکا اور وہ بھی مسکرا دیا۔

شہزادے کے حکم پر ایک سو سپاہی پانی میں کود پڑے اور ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ایک ایسی جگہ حلقہ باندھکر کھڑے ہو گئے جہاں کمر تک پانی آتا تھا۔ اس حلقہ میں شہزادہ کو اشنان کرنا تھا۔ اس وقت شہزادے نے مسکرا کر اپنے اتالیق کی طرف دیکھا جسپر برہمن سے نرہا گیا اور اسکے ہاتھ میں ہاتھ دیکر کہنے لگا میں ایسا بزدل بھی نہیں ہوں کہ آپکے ساتھ ایسی جگہ جہاں ایک سو مسلح جوان کھڑا ہے نہا سکوں اس طرح سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے مزے مزے کی باتیں کرتے دونوں پانی میں اترے اور اس حلقہ میں جا کھڑے ہوئے۔ سورج اندر باہر تھا۔ نہانے والوں نے اشنان کا گیت گانا شروع کیا ایک لحظہ میں سب نے کا اپنے سروں تک ڈوبکر غوطہ لگانا تھا کہ یکایک شہزادہ ایک بید تک لرز رہے گھڑیال نگلا گھڑیال سے گرج کر کہا کہ اور برہمن میں وہی اجل کا فرشتہ ہوں اور برہمن کو کمر سے پکڑ کر مسلح آدمیوں کی صف چیر کر گہرے پانی میں سے گھسا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ "عالم خیال"

یاد اجل

"آسودگی بہ گوشۂ ہستی نہ دیدہ ایم — جاں دادہ ایم و کنج مزار آخریدہ ایم"

میں اے اجل ہوں تیرا اُمیدوار کب سے! — تیری مفارقت میں ہوں بے قرار کب سے!

ہے میری جان اے جاں تجھپر نثار کب سے! — کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے!

مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں
اے مرگ تیری خاطر سینہ فگار ہوں میں

اے پُرز نار نخوت سے آن بان والی — اے غم فروش عالم۔ اُونچی دوکان والی

اے صاحب رعونت۔ برتر نشان والی — شرم و حیا کی دیوی۔ شاہانہ شان والی

جاں تیرے خیر مقدم کو رُک رہی ہے لب پر
دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے اے ستمگر

اے موت بندِ ہستی سے تو چھُڑا لے مجھکو — آزاد کر کے اپنا بندہ بنا دے مجھ کو

صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو — آ حجرۂ لحد میں چلکر سلا دے مجھ کو

اے قبر ایک مدت سے وصل کا ہے ارماں
آغوش دل میں لے شفقت پہ تیری قرباں

میں ہوں فقط اکیلا۔ کچھ مال ہو نہ زر ہو — دو گز کا اک کفن ہو۔ کچھ اپنے پاس اگر ہو

کھٹکا نہ رہزنوں کا چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو — شادی کی کچھ خبر ہو۔ غم کا نہ کچھ اثر ہو

وہ دن کب آئینگے جب احباب روتے ہونگے
ہم اپنا مُنہ لپیٹے بیفکر سوتے ہونگے

غربت کی ہو نہ پروا۔ دولت کی ہو نہ حاجت — عزت کی ہو نہ خواہش۔ ذلت سے ہو نہ نفرت

اعدا سے ہو نہ کینہ۔ یاروں کی ہو نہ اُلفت — اولاد کی محبت۔ ماں باپ کی نہ چاہت

محفوظ ہوں غرض ہم ان ساری آفتوں سے
بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے

کپڑا سفید سر سے پا تک تنا ہوا ہو
ڈھیلوں کا ایک تکیہ سر سے مرے لگا ہو
اور خوابہائے غفلت کا سلسلہ بندھا ہو
لیکن نہ وہ پریشان دنیا کے وہم سا ہو

اِس میٹھی نیند میں ہم کچھ ایسے بےخبر ہوں
غل شور سے ہوں ایمن نالوں سے بےخطر ہوں

سبزے کی سبز چادر مرقد پہ اک چڑھی ہو
پھولوں کے بیلے جس پر حسرت برس رہی ہو
سنگِ لحد سے تصویر اک پاس کی کھڑی ہو
جائے چراغ جس پر تاریکی چھا گئی ہو

سر پیٹتی ہو حسرت اور نوحہ خواں ہو ارماں
ماتم کرے تمنا۔ ہو شوق مرثیہ خواں

سنسان مقبرہ ہو۔ ہر سو ہو ہُو کا عالم
اور لہلہا رہا ہو سبزے کا ایک پرچم
ہر پھول داغِ غم ہو۔ ہر نخل نخلِ ماتم
آنسو بہا رہی ہو تربت پہ میری شبنم

تنہائی ہو محافظ خاکی مکاں کی میرے
اور بیکسی ہوں درباں اِس آستاں کی میرے

ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری خصلت
مکار بے حمیت۔ بد چشم۔ بے مروت
تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت
ہے بیوفائی تیری معمولی ایک عادت

تجھ سے اماں جو مانگے اُس کے گلے لگے تو
جو دل سے تجھ کو چاہے اُس سے الگ رہے تو

آمد کا اپنی مژدہ سنوائے گی یقینی
اور میری آرزوئیں بر لائے گی یقینی
آئے کہو یوں تو اک دن تو آئے گی یقینی
تو آج مجھ کو لیکن ترسائے گی یقینی
"پہچاؤں گا میں کرتا اے موت تیری منت
اور تو رہیگی یوں ہی مخمورِ خوابِ راحت"

نہر سویز

آج کل جبکہ ترکوں سے مصر پر حملہ کرنیکے متعلق نہر سویز کا اکثر ذکر ہوتا ہے اگر اس نہر کے ابتدائی اور مابعد کے تاریخی حالات لکھے جائیں تو خالی از دلچسپی نہ ہونگے۔

قدیم تاریخ نمبر ا

یہ تو بچے بچے کو معلوم ہے کہ نہر سویز بحیرہ روم کو بحرہ قلزم سے ملاتی ہے۔ گویا جہازوں کے لیئے ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں پہنچنے کا راستہ قائم کرتی ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان اور یورپ کی تجارت مصر میں سے ہوکر گزرتی تھی۔ جہاں تک جہاز پہنچ سکتے تھے وہاں تک تجارتی مال جہازوں میں آتا تھا پھر خشکی کی راہ بحیرہ روم کے کنارے تک جاتا تھا۔ اس تکلیف کو زمانہ قدیم کے بادشاہوں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا جیسا کہ موجودہ زمانے کے حکمرانوں نے۔

چنانچہ سب سے پہلے مصر کے مشہور بادشاہ سیتی اول نے مسیح سے ۱۳۸۰ برس قبل اس نہر کے تیار کرنے کا خیال کیا۔ بعض یونانی مؤرخین دوسرے بادشاہوں کا نام بھی لکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ اس نہر کی تیاری میں ایک لاکھ سے زیادہ مزدور بخار اور وبائی بیماریوں میں کام آئے ایسا ہونا بالکل ممکن ہے۔ کیونکہ ہم موجودہ زمانے میں دیکھتے ہیں کہ پناما کی نہر کی تیاری میں بھی ایسا ہوا اور بہت سی جانیں اس قسم کی وبائی بیماریوں میں ضائع ہوئیں۔

بادشاہ سیتی کی نہر دریائے نیل سے نکلکر کھاری جھیل میں آملتی تھی اس نہر کے نشان آجتک پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور بادشاہ نے یہ کام شروع کیا مگر ناتمام رہا۔
مسیح سے ۵۰۲ برس قبل بادشاہ دارا نے اس نہر کو بحیرہ قلزم سے ملانا چاہا اور بہت حد تک کامیاب ہوا۔ مگر بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ پانی جاری نہیں کیا گیا کیونکہ اندیشہ تھا کہ بحیرہ قلزم کی سطح بحیرہ روم سے بلند ہونے کی وجہ سے اس نہر کے کھودنے سے سارا ملک مصر پانی کی طغیانی سے غارت ہو جائیگا کہتے ہیں کہ اس مشکل کو آسان کرنے کی غرض سے طالمی دوم کے زمانے میں نہر میں بند بنائے گئے اور نہر بہمہ وجوہ مکمل صورت میں آئی۔ اُسوقت اس کا طول ۳۷ میل عرض ایکسو فیٹ اور عمق ۴۰ فیٹ تھا۔ لیکن موجودہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ نہر کی تکمیل دارا کے زمانے ہی میں ہو گئی تھی۔ بہر حال اسکی تکمیل کسی بادشاہ کے زمانے میں ہوئی ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایک قدیم زمانے سے یہ نہر موجود تھی۔ مگر رفتہ رفتہ بند ہو گئی۔ شاہان روما نے اسکو دوبارہ کھدوانا چاہا اور آخر ش ساتویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے مصر پر قبضہ کیا تو حضرت عمرؓ کے حکم سے اِس نہر کو پھر جاری کیا گیا۔ اور عرصے تک یہ نہر جاری رہی۔ ۷۶۷ء میں خلیفہ دوم ابو جعفر شاہ منصور بانئے بغداد کے حکم سے اسے بند کرایا گیا اور پھر اسی طرح بند پڑی رہی اگرچہ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ۱۰۰۰ء میں سلطان حکیم کے عہد میں یہ نہر جاری ہو گئی تھی۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو بھی اس کے بعد یہ نہر پھر بند ہو گئی۔ آخر کار ۱۸۶۱ء میں فرانس کے مشہور انجنیروں نے اسی نہر کو

جس کی ابتدا دو ہزار پانچسو برس پہلے ہوئی تھی دوبارہ کھودنا شروع کیا اور تھوڑے سے تغیر کے بعد اسکی وہ صورت قائم کی جو آجتک موجود ہے۔

نہر سویز کی موجودہ تاریخ نمبر ۲

اُوپر جو بیان کیا گیا ہے وہ دریائے نیل سے نہر نکالنے کے متعلق ہے۔ لیکن اِس کے علاوہ خشکی کے راہ دوسرے راستے سے نہر نکالنے کی تجویز بھی آٹھوی صدی عیسوی میں خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں زیر بحث ہوئی تھی لیکن چونکہ خلیفہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ اِس بحری راستے سے اُس کے رومی دشمن عرب تک پہنچ جاوینگے اس لئے اِس منصوبے کو ترک کر دیا۔ پھر پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اہل وینس نے مصری حکمرانوں سے اس نہر کے اجرا کے متعلق گفت وشنید کی لیکن اسی زمانے میں ترکوں نے مصر پر قبضہ کر لیا اور اہل وینس خاموش ہو رہے۔ سنہ ۱۶۷۱ء بادشاہ فرانس کو اسکے وزیر نے مصر پر حملہ کرنے اور ایک نہر بنانے کا مشورہ دیا۔ سنہ ۱۷۷۰ء میں شیخ البلاد علی بے نے اس کام کو پورا کرنیکا ارادہ کیا۔ سنہ ۱۷۹۸ء میں نپولین بونا پارٹ نے نہر کھودنے کے خیال سے زمین کی پیمائش کرائی مگر انجنیروں میں اِس امر پر بہت اختلاف رہا کہ بحیرہ قلزم وبحیرہ روم کی بلندی سطح میں بہت فرق ہے سنہ ۱۸۴۷ء کی تحقیقات سے یہ بلندی سطح کا فرق غلط ثابت ہوا۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں فرڈیننڈ ڈی لسپ نے سعید پاشا خدیو مصر سے نہر بنانے کی اجازت حاصل کی۔ شرط یہ قرار پائی تھی کہ ۹۹ سال کے لئے اجارہ دیا جائے اور اس کے بعد نہر حکومت مصر کے قبضے میں آجائیگی۔ مگر چونکہ مصر سلطان ٹرکی کے ماتحت تھا اس لئے باب عالی سے منظوری حاصل

کرنی ضروری تھی۔ اس زمانے میں جنگ کریمیا کی وجہ سے ٹرکی اور انگلستان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اور انگلستان اس نہر کی تکمیل کے خلاف تھا۔ انگلستان کے وزیر لارڈ پامرسٹن نے بیان کیا کہ اول تو ایسی نہر تیار ہونی محال ہے اور اگر یہ تیار ہوگئی تو انگریزوں کو اس سے بجائے فائدہ کے یہ نقصان پہنچیگا کہ بحیرہ روم کی سلطنتیں خاصکر فرانس مشرق میں انگریزی بحری غلبے کی مزاحمت کریگا۔ اس بنا پر انگریزی سیاسی ریشہ دوانیوں سے بابِ عالی ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۶ء تک اس نہر کے ٹھیکے کے معاہدے کو منظور نہیں کیا مگر لسپ نے نہر سویز کی کمپنی کا کام ۱۸۵۴ء ہی سے شروع کر دیا تھا اور باوجود انگریزوں کی ٹرکی کے ذریعہ ہر قسم کی مزاحمت میں نہر کھدنی شروع ہوگئی اور ۱۸۶۹ء میں جاری ہوگئی۔ اس نہر کی لاگت کا تخمینہ ۴۳۲۸۰۷۸۸۲ فرانک ہوتا ہے اگرچہ ۱۸۵۶ء میں اسکی لاگت کا تخمینہ صرف ۲۰ کروڑ فرانک کیا گیا تھا ۲۰ نومبر ۱۸۶۹ء کے بعد سے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدہ شروع ہوگئی تھی۔

اس نہر کا طول پورٹ سعید سے سویز تک سو میل ہے۔ شروع میں اسکا عرض کم تھا حتیٰ کہ دو جہاز برابر ہوکر نہ گزر سکتے تھے لیکن بعد کو اسکو زیادہ چوڑا کیا گیا اور اب دو جہاز اس طرح برابر سے گزر سکتے ہیں کہ ایک جہاز ٹھہر جائے اور دوسرا پاس سے نکل جائے۔ ۱۸۸۶ء تک اس نہر کے عبور کرنے میں جہازوں کو ۳۶ گھنٹے لگتے تھے لیکن اب صرف نصف وقت درکار ہوتا ہے

حق ملکیت

حق ملکیت کے لحاظ سے یہ نہر کسی ایک شخص یا بادشاہ کی نہیں ہے ۱۸۵۶ء کے معاہدے کی رو سے تمام اقوام و ممالک کو جو حصہ دار تھیں برابر کے حقوق حاصل تھے اور کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ حق نہ تھا۔ اور ہر تجارتی جہاز بلا روک ٹوک اسمیں سے گزر سکتا تھا مگر ۱۸۸۱-۸۲ء میں جبکہ انگریزوں اور فرانسیسوں کی لڑائی ہو رہی تھی انگریزوں نے فرانسیسوں کو مصر میں شکست دی تھی اور بحری لڑائی اسی نہر کے کنارے ہو رہی تھی تو چار دن کے لئے انگریزی امیر البحر نے اس نہر کا راستہ بند کر دیا تھا۔ یہ معاملہ بعد میں زیر مباحثہ آیا اور ۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ میں ایک کمیٹی نے جس میں انگلستان - جرمنی - آسٹریا - اسپین فرانس - اٹلی ہالینڈ روس اور ٹرکی کے نمائندے تھے نہر سویز کے معاہدے پر دستخط کئے جس کی رو سے اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ یہ نہر زمانہ امن و زمانہ جنگ میں ہمیشہ اور ہر وقت ہر جنگی و تجارتی جہاز کے لئے کھلی رہیگی خواہ وہ جہاز کسی ملک کا ہو لیکن برطانیہ کلاں نے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اس معاہدے کی شرائط اس حد تک قابل تسلیم ہونگے کہ جس حد تک کہ برطانیہ کے مصر پر قبضہ قائم رکھنے میں خلل نہ آئے۔

اس موقعہ پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ انگریزوں کو جو شروع ہی سے اس نہر کے مخالف تھے اسکے معاملات میں رائے زنی کا حق کس طرح حاصل ہوا ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر پر قبضہ ہونیکی وجہ سے لیکن اصلیت یہ ہے کہ اسماعیل پاشا خدیو مصر نہایت فضول خرچ شخص تھا اور وہ اسقدر مقروض ہو گیا کہ اسنے ۱۸۷۵ء میں نہر سویز کے حصے انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ نے نہر سویز کے ۱۷۶۶۰۲ حصے ۳۹۷۶۵۸۲ پونڈ میں خریدے اور اسطرح اسوقت نہر سویز کے

مغل شہزادوں کی تعلیم

رسالہ "سوڈرن ریویو" میں اورنگ زیب کا ایک خط شایع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی میں مغل شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ کیا تھا۔ یہہ اصل خط فارسی زبان میں ہے مگر رسالہ مذکور میں بزبان انگریزی ترجمہ ہوکر شایع ہوا ہے جس سے ہم ترجمہ کرکے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۶۵۴ء میں خود اورنگ زیب بادشاہ کا بڑا بیٹا محمد سلطان جس کی عمر ابھی صرف پندرہ سال ہے اجمیر کو مغل اعظم (شاہجہاں) کی حضور میں باریاب ہونے کے لئے جا رہا ہے۔ اورنگ زیب کو قدرتی طور پر یہہ فکر ہے کہ اوس کا بیٹا شاہی دربار میں عمدہ اثر قائم کرے۔ اوس کی نسبت اورنگ زیب نے شہزادے کو جو ہدایتیں لکھی ہیں اون میں ہر وقت اور ہر کام کا ایک نہایت مکمل دستور العمل موجود ہے۔

اورنگ زیب لکھتا ہے سفر و حضر میں طلوع آفتاب سے ۷۲ منٹ قبل بیدار ہوجاؤ۔ غسل اور حوائج ضروریہ سے ۴۸ منٹ میں فارغ ہوکر نماز شروع کرو۔ نماز اور اوراد کے بعد بعد قرآن شریف تلاوت کرو اس کے بعد ناشتہ کھاؤ۔ اگر سفر میں ہو تو طلوع کے ۴۸ منٹ بعد تک گھوڑے پر سوار ہوجاؤ۔ اگر راستہ میں شکار کرو تو اس بات کا ضرور لحاظ رکھو کہ منزل پر ٹھیک وقت پر پہونچ جاؤ منزل پر پہونچنے کے

would bring

بعد اگر تمہارا دل چاہے یا فرصت ہو تو عربی کی کوئی کتاب مطالعہ کرو۔ یا آرام کرو۔ زوال آفتاب سے ۲۴ منٹ کے بعد خیمہ سے نکلو اور ظہر کی نماز باجماعت ادا کرو۔ دوپہر کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرو۔ اس میں دو گھنٹے صرف ہو جاویں گے۔ اس کے بعد عصر کی نماز پڑھو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوپہر کا کھانا ظہر و عصر کے درمیان کھایا جاتا تھا۔ ایڈیٹر) لیکن اگر صرف کھانے ہی سے تمہیں کافی تفریح حاصل ہو جائے تو درمیان کا خالی وقت املاء و انشاء اور فارسی نظم و نثر کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرو نماز عصر کے بعد کچھ دیر عربی پڑھو۔ اور اس کے بعد نماز مغرب سے ۴۲ منٹ قبل علماء و صلحاء کی صحبت سے استفادہ کرو۔ اور اس شغل کو نماز مغرب سے ۴۸ منٹ بعد تک جاری رکھو۔ اسکے بعد قرآن کے ایک پارہ کی تلاوت کرو۔ اور اس کے بعد نو بجے سو جاؤ۔ اگر تم سفر میں ہو تو منزل کے روز تمام کام اوقات معینہ پر انجام دو۔ اور کوچ کے زمانہ میں صبح کے ۴۸ منٹ تیر و تفنگ کی مشق میں صرف کرو۔

کوچ کی حالت میں ۴۸ منٹ تیر اندازی و نشانہ بازی کی مشق میں صرف کرو۔ طلوع آفتاب کے ایک گھنٹہ ۲۴ منٹ بعد ۴۸ منٹ دیا حسب ضرورت زیادہ عرصہ) کے لئے دربار عام میں نشست کرو۔ اگر ضرورت ہو تو تقریباً ایک گھنٹہ دربار خاص میں اجلاس کرو۔ ورنہ اس وقت کو عربی کے مطالعہ میں صرف کرو۔ اگر منزل طویل ہو تو نماز فجر کے بعد فوراً گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور ناشتہ راستہ ہی میں کرو۔ ورنہ روانہ ہونے سے قبل ناشتہ کر لو۔ سپیدہ صبح نمودار ہونے کے وقت یا نو بجے دن کے بعد سفر کا آغاز نہ کرو۔ اگر راستہ میں شکار کھیں ہو تو فوج کو قریب میں

راستہ سے منزل کی طرف خزینہ دار سپاہ کی معیت میں روانہ کر دو۔ اور اپنے ہمرکاب صرف نہایت مختصر جمعیت رکھو۔ رفتہ رفتہ ہتھیار لگانے کی عادت ڈالو۔ کپڑے اوتارنے اور پیٹنے سے قبل پسینہ خشک ہونے دو۔ سوائے محمد طاہر کے (یہ شخص محمد سلطان کا اتالیق ہے۔ ایڈیٹر) میرے کسی اور افسر کو یا شاہی کے دو ہزاری سے نیچے درجے کے عہدہ دار کو اپنی فوج کے آگے نہ چلاؤ۔ کیونکہ نوآزمودہ کاروں کی فوج کے آگے ہونے سے اوس کے رعب وداب میں فرق آتا ہے۔ ہمیشہ عاقل ودول بات کرو۔

باوجود اس اہتمام کے معلوم ہوتا ہے کہ محمد سلطان نے تعلیم میں زیادہ ترقی نہ کی۔ یہاں تک کہ اپنی خاندانی زبان ترکی سے بھی اُسے نفرت تھی۔ باوجودیکہ اورنگزیب نے خاص زبان ترکی کی تعلیم کے لئے ایک معلم مقرر کر رکھا تھا۔ اورنگزیب نے ایک بار شکایت کی تھی کہ "ترکی زبان کا معلم ایک سال سے مشاہرہ لے رہا ہے۔ مگر تم نے اوس سے پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔"

اورنگزیب نے لباس وغیرہ کے متعلق بھی شہزادہ کو ہدایات کی ہیں اور اپنا نمونہ اوس کو یاد دلایا ہے۔

بہرحال محمد سلطان ماہ دسمبر میں شاہجہاں کے دربار میں پہونچ کر مورد عنایات والطاف شاہانہ ہوا ہے۔ غالباً ناظرین کو محمد سلطان کی آیندہ زندگی کا حال معلوم کرنے کا بھی اشتیاق ہوگا۔ اس کی کیفیت مختصراً یہ ہے کہ تمام تعلیم و تربیت محض بیکار ثابت ہوگی۔ اور یہ مضمون صادق آیا کہ۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اورنگ زیب طرز انشا معلوم کرنے کے لئے اوس کو اکبر نامہ کے مطالعہ کا حکم دیتا ہے اور وہ اوس کی یہاں تک تقلید کرتا ہے کہ بجائے بسم اللہ کے اللہ اکبر جل جلالہ میں بھی ابوالفضل کا تتبع کرتا ہے۔ اورنگ زیب کو جب بھائیوں سے لڑنا پڑا ہے تو کئی معرکوں میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ تھا۔ آخر کار وہ شجاع سے ملگیا۔ مگر شجاع کی شکست کے بعد اوس نے اپنے آپ کو اورنگ زیب کے سپہ سالار میر جملہ کے حوالہ کر دیا۔ اسکے بعد عمر بھر داول گوالیار اور پھر سلیم گڈہ متصل دہلی میں قید رہ کر بعمر سی و ہفت سالگی ۳ دسمبر ۱۶۷۶ء کو راہی ملک بقا ہوا

(انسٹیٹیوٹ گزٹ)

ناظرین براہ کرم خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

منیجر

ابونصر فارابی معلم ثانی

ابونصر لقب اور محمد ابن محمد ابن اوزلغ بن طرخان نام تھا فاراب¹ اوسکا وطن آبائی تھا۔ یہ ایک کمانڈر کا ہونہار لڑکا تیسری صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا۔ مدت تک بغداد میں رہا پھر شام میں جا بسا اور مرتے دم تک وہیں رہا معلم ارسطو کے فلسفہ کو اسی نے اہل اسلام کے سامنے پیش کیا اور اِس صلہ میں علمی دربار سے خطاب معلم ثانی حاصل کیا۔

اگرچہ نصر سے پہلے مسلمانوں کو یونانی فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر ارسطو کی نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ایک دوسری زبان درکار تھی قدرت سے اسرار ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اوسوقت تک یونانی فلسفہ عربی میں نہایت بھدے اور ناموزوں تجربوں کے لباس میں تھا۔ جن سے فایدہ اُٹھانا معلوم بے جان الفاظ کے پیکروں میں۔ روح معانی کے جلوے نگاہ تصور کو بھی نظر نہ آتی تھی۔ تخیل ساذج تو کیا باریک بیں عقول بھی مصنوعی فہم و ادراک کا دعوی کرنا اپنی موت

¹ فاراب ترکستان میں نہر سیحوں کے پرے بلاساغوں کے قریب ایک شہر ہے جو طول میں ایک دن کی مسافت رکھتا ہے۔

سمجھتی تھی کہ یہ نامور وجود خاک پاک پارس سے اُٹھا اور حقائق اشیاء کے اظہار کا چمکتا آفتاب تمام عالم افکار میں روشن کر دیا۔ جس کی کرنیں عرب وعجم بلکہ یورپ وامریکہ کے فلاسفروں کے خلوت کدہ تخئیل میں پہونچ گئیں اوس نے فلسفہ کی تجلیوں کو دیکھا اور وہ اس کے فیض نظر سے ایسی ہوگئیں کہ آج ہم سب دیکھ سکتے ہیں۔

ارسطو جو حقیقت میں یونانی فلسفہ کا موجد گزرا ہے اگرچہ قدما کی طرح فلسفہ کی عام تعلیم کا مخالف نہ تھا کہ سوا خاص شاگردوں کے اور کسی کو ایسی قیمتی جواہر کی طرف نگاہ کرنے کی بھی اجازت نہ دیتا اور ہمیشہ رموز واشارات کے صندوقوں میں محفوظ رکھتا۔ مگر اوس کے بسیط مضامین بھی معمولی ذہنوں کی چار دیواری میں نہ سما سکتے تھے۔ اوس نے گو افلاطون الٰہی کی طرح تعلیم فلسفہ کے لئے اپنی ہیکل کے دروازہ پر یہ نہیں لکھدیا تھا کہ جو علم ہندسہ نہ جانتا ہو ہمارے پاس نہ آئے لیکن اوسکا تسلسل خیالات اور مقدمات تمہیدیہ کا سلسلہ بھی فہم وخرد میں بھی نہ آنے پاتا تھا۔ کہ مخاطب کثرت غور وخوض سے مجنوں ہو جاتا تھا۔

ابونصر نے ارسطو کی کتابوں پر کثرت سے تعلیقات لکھے اوس کے مجمل بیانوں کی تشریح اور کندی وغیرہ مترجمین کی اغلاط کی تصحیح کر دی جس سے عربی خزانہ افکار میں یونانی جواہر کی قدر وقیمت بڑھ گئی۔ یونانی فلسفہ عام ہوگیا۔ اور عام وخاص اوس سے مستفید ہونے لگے ابونصر خود ساختہ غریب وفقیر تھا وہ ابتدا میں ایک باغ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اسپر بھی اوس نے اپنے تمام مشاغل فلسفہ کے لئے وقف کر دئے تھے ارسطو کی کتابیں بڑی گراں تھیں اور ابونصر تنگدستی کی وجہ سے مول

نہیں ہو سکتا تھا کہ اتفاق سے ایک اجنبی ارسطو کی تمام کتابیں اوس
کے پاس چھوڑ گیا اب کیا تھا ابونصر نے اون کتابوں کے دیکھنے کا حق
ادا کر دیا کثرت غور و خوض سے وہ اون کے تمام مطالب پر حاوی
ہو گیا۔ وہ مطالعہ و تصنیف کی ضرورت سے رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ اتنی
استطاعت کہاں تھی کہ دمڑی کا تیل چراغ میں ڈالتا اور ایک گوشہ میں
بیٹھکر مطالعہ میں مشغول ہوتا۔ غریب ساری رات اپنے گھر سے نکلکر چوکیداروں
کی لالٹینوں کی روشنی میں پڑھتا پھرتا تھا۔ خدا نے اوسے ایسا ذہین کیا
تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ فیلسوف اعظم شمار کیا جانے لگا۔ فلسفہ مشک
سے بڑھکر خوشبودار ہے وہ اگرچہ فلسفی کی نافہ دماغ میں محفوظ رہتا ہے مگر فلاسفر
کی ہر نفس نفحات طیبہ بنکر مشام سامع کو معطر کرتے رہتے ہیں یہی سبب
تھا کہ ابونصر تو ایک گوشہ میں تھا۔ مگر اوس کی باتیں [illegible]
غرض اوس کے علم و فضل [illegible] کے دور دور چرچے ہونے لگے ہر وقت
شاگردوں کے [illegible] رہتے تھے حلقہ درس میں بڑے بڑے نبیل القدر
امرا [illegible] فلسفہ کی دلچسپ تقریریں سننے کے [illegible]
شدہ شدہ یہ خبر امیر سیف الدولہ کو پہونچی سیف الدولہ جو ہنر شناس
دوست تھا۔ اوسکا دربار علم و فضل کا دربار تھا۔ [illegible] متنبی
[illegible] کو پڑھا ہے وہ سیف الدولہ کی عظمت و شان کا کچھ
[illegible] ہے۔ غرض سیف الدولہ نے ابونصر کی بڑی تعظیم و تکریم کی
[illegible] اعتراف کیا
[illegible] گفتگو کرنے کو
[illegible]

کہ جس طرح ہوا اس کے نگہ بلند کو اجسام ترابیہ کی طرف مائل کریں اور فانی لذتیں غلبہ پا کر اسی منازل نفوس باقیہ سے دور کر دیں۔ مگر وہ جو آزادانہ منظر اقدس کو دیکھ رہا ہے اور عالم استغنا کی رفتار حریت کے نغموں پر کان لگائے ہوئے ہے عناصر اربعہ کی چار دیواری کا ہو کر نہیں رہ سکتا دنیا دنی کی پست آوازیں اوس کے عالم سامعہ تک نہیں پہونچ سکتیں

ابو نصر نے بھی اپنے کمال بیرخی کو ظاہر کیا۔ اور ان مذموم علائق سے منہ پھیر لیا۔ اگرچہ مجموعہ کونیہ سے مطلقاً نجات پانا۔ اور ان کے اسباب دفع سے قطعاً اغماض کرنا فطرت انسانیہ کے خلاف ہے۔ ابو نصر نے بقدر ضرورت صرف چار درہم یومیہ لینا منظور کیا۔ اور سیف الدولہ کے یہاں سے یہی روزینہ مقرر ہو گیا۔ ابو نصر فیشن کا دلدادہ یا دنیاوی طرز معیشت کا مقلد نہ تھا بلکہ وہ خود انسانی زندگی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ایسی جد و جہد حیات کے نمونے آج ہمارے پیش نظر ہوتے تو ہم وہی تھے جو ہمیں ہونا تھا۔ ابو نصر راہبوں کی طرح ایک مستغنی بیکار نہ تھا بلکہ اوسکا زہد اختیاری دنیاوی جاہ و منزلت کی ناقدری اور بے ثباتی کا بہت بڑا واعظ تھا۔ وہ اپنے قول و علم سے نہیں بلکہ عمل و شغل سے ابناء دہر کا روحانی معلم تھا۔ وہ انھیں بتاتا تھا۔ راغب

دنیا دنی اور یہ شوق تحصیل — کیوں تم نے کیا ہے اپنی ہمت کو ذلیل
سمجھو تو سہی کس کے عوض بکتے ہو — کہتا ہے خدا متاع دنیا ہے قلیل

ابو نصر کی زاہدانہ زندگی کی حد ہو گئی اوس نے آخر دم تک کسی منزل و مکسب کی طرف مستقل توجہ نہیں کی وہ اگرچہ [illegible] ہو گیا تھا مگر جب اوسی [illegible] اوس نے فوراً [illegible] داخل کر دیا اور

ہمہ تن تحصیل فلسفہ میں مشغول ہوگیا۔ اوس نے ایک شخص یوحنا بن جیلان نامی سے زمانہ خلافت مقتدر میں فلسفہ آخر کتاب البرہان تک پڑھا۔ کتاب البرہان کا آخری حصہ درس میں نہ تھا مگر ابونصر کے زمانہ سے درس میں داخل ہوگیا تھا۔ افسوس ہے البرہان کا آخری حصہ تو کیا البرہان بھی ہمارے درس فلسفہ میں داخل نہیں۔ اور آج ہمارے طلبا نے فلسفہ اوس کی زیارت سے بھی محروم ہیں۔ ابونصر کے زمانہ تحصیل فلسفہ میں ایک شخص ابو البشر متی بن یونان فلسفی بھی تھا۔ اس نے ابراہیم مروزی سے فلسفہ پڑھا تھا۔ متی اگرچہ بڈھا ہوگیا تھا مگر مسائل فلسفہ میں ابونصر کی طرح ژرف نگاہی اُسے نصیب نہ تھی اور نہ وہ ابونصر کی برابر ذہین وفہیم تھا متی ایام خلافت راضی میں ۳۲۳ھ لغایت ۳۲۹ھ کے دوران انتقال کر گیا۔ پھر تو ہر جگہ ابونصر ہی ابونصر تھا۔ شروع شروع میں ابونصر کو نحو اچھی نہیں آتی تھی اوس نے ابوبکر بن سراج نحوی سے نحو پڑھنا شروع کی اور اسکے معاوضہ میں اوسے منطق کا درس دیا۔

ایسے علم وفضل پر بھی اوسکا یہ عالم تھا کہ جب کسی نے پوچھا کہ تم زیادہ فلسفی ہو کہ ارسطو۔ تو اوس نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ اگر میرے زمانہ میں ارسطو ہوتا تو میں اوس کے ایک شاگرد سے بڑھکر نہ تھا۔

ابونصر فلسفہ کا امام تھا۔ اور تمام متاخرین میں اوس کے مقتدی۔ اوس نے محققانہ بلکہ مجتہدانہ انداز سے فلسفہ کی تمام شعبوں میں اپنے کمالات وادراک کا ثبوت دیا ہے یہانتک کہ وہ موسیقی کا بےمثال اوستاد تسلیم کیا گیا۔ اوس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس کے نغمے جذبات سامع میں آگ لگاتے تھے حلقہ سامع میں ہنسنا رونا سوجانا سننے والے کے

دخفیا نہیں نہ تھا۔ بلکہ ابونصر کے ارادہ اور اوس آلہ کی اثنان معجزہ کے
اشارہ میں تھا۔ خلکان نے لکھا ہے کہ ابونصر جب سیف الدولہ کے علمی
دربار میں پہونچا ترکانہ انداز تھا اور اسی طرح سیف الدولہ کے سامنے
کھڑا ہوگیا سیف الدولہ نے کہا بیٹھو فرمایا کس حیثیت سے حیث آنا۔
ام حیث انت۔ سیف الدولہ نے کہا حیث انت سنتے ہی آگے بڑہا
اور مسند شاہی تک پہونچکر سیف الدولہ سے بھڑ گیا یہانتک کہ وہاں سے
ہٹایا گیا۔ سیف الدولہ کے پیچھے اوس کے مسلح غلام کھڑے رہتے تھے
جن سے کہ اسلحہ آداب دربار کی بڑی زبردست نگراں اور اون کے ابروئے
شمشیر بادشاہ کی ادا فہم نگہبان تھے۔ سیف الدولہ ایک خاص زبان میں
انھیں احکام دیتا تھا۔ اب بھی اوس نے اوسی زبان میں اون سے کہا اگرچہ
اس بڈہے نے آداب شاہی کا لحاظ نہیں کیا مگر میں اس سے کچھ پوچھتا ہوں
اگر جواب نہ دے سکے تو اس کے ٹکڑے اڑا دینا۔ ابونصر نے یہ سنکر
فوراً بادشاہ سے کہا کہ صبر کیجئے۔ مرد آخر بین مبارک بندہ است۔ سیف الدولہ
یہ سنکر بڑا متعجب ہوا اور اوس سے کہا کیوں جی تم یہ بھی زبان جانتے ہو اوس
نے کہا جی ہاں میں ستر سے زیادہ زبانیں جانتا ہوں پھر علمائے حاضرین سے
ابونصر کی گفتگو ہوئی اور اوس نے ہر فن میں علما کا ناطقہ بند کر دیا۔ علما کو
چپ کر دینے کے بعد اوس نے خود تقریر شروع کی اور لوگوں نے قلم
دوات سنبھالے۔

پھر سیف الدولہ نے پوچھا کہیئے کچھ کھائیے گا۔ اوس نے کہا نہیں۔
پینے کو پوچھا تو بھی انکار رہا سیف الدولہ نے کہا اچھا تم کچھ سنوگے اب کے
جواب اثبات میں تھا۔ سیف الدولہ کے حکم سے محفل سماع منعقد ہوئی

اب کوئی ساز ندہ یا نواز ندہ ایسا نہ تھا جسے ابونصر نے نہ ٹوکا ہو اور اونکے
الاتِ طرب بجانے میں عیب نہ نکالا ہو۔ سب نے اپنا اپنا کان پکڑا اور
ہاتھ جوڑ کر یا اوستاد ٹھیک ہے۔ جی حضور بجا ہے۔ کہکر چُپ ہوگئے
پھر ابونصر نے خود ایک تھیلی میں سے چند لکڑیاں نکالیں اور اُنھیں
ترکیب سے ایک بنالیا پھر جب اُسے بجایا تو محفل کی محفل ہنستے ہنستے
لوٹ گئی پھر دوبارہ ترکیب دیا اور بجایا تو سارے دربار کا روتے
روتے غیر حال ہوگیا۔ تیسری دفعہ نئی ترکیب دیکر جب اوس نے بجایا
ہے تو اہل مجلس خواب راحت میں تھی دربان تک سوگیا اور ابو نصر سبکو
سوتا چھوڑ کر چلدیا۔ خلکان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابونصر شام کے
آبشاروں اور باغوں میں اوقات بسر کرتا تھا۔ اور وہیں تصنیف و تدریس
کا سلسلہ رہتا تھا وہیں اس کے حواری اوس سے فیض پاتے تھے
اسی بے سرو سامانی کے باعث اوس کی کتابیں اکثر ناقص رہ گئی ہیں
جب اسی برس کی عمر ہوئی سنہ ۳۳۹ھ میں دمشق میں وفات پائی سیف الدولہ
نے چار ارکین کے ساتھ نماز پڑھی بیرون دمشق باب صغیر کے باہر
دفن کیا گیا بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ ابونصر نے سنہ ۳۳۰ھ میں
مصر کا سفر کیا اور وہاں سے لوٹ کر دمشق میں سکونت اختیار کی اور
وہیں رجب سنہ ۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔ اس زمانہ میں خلافت عباسیہ
پر خلیفہ راضی کا نام تھا۔ سیف الدولہ نے پندرہ خواص کے ساتھ
نماز پڑہی۔ واللہ اعلم +

راغب جیلانی۔ بدایونی۔

قدیم ہندوستان کی تہذیب

(مترجمہ - اے - ڈی - احمد صاحب)

کسی قوم کے تمدن کی اشاعت اور اُسکی قومیت کے قیام کے لئے تاریخ کا مطالعہ جسقدر ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں کسی انگریزی مؤرخ کا قول ہے کہ جو قوم اپنے بزرگوں کے کارنامے نہیں یاد رکھتی وہ خود کبھی ایسا کام نہیں کرے گی جو آیندہ یاد رکھے جانے کے قابل ہو۔ لیکن محض قومیت کی عینک کو اتار کر اگر آپ تاریخ کو فلسفی کی نگاہ سے دیکھیں تب بھی آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ تمدن کا تسلسل قومی ترقی کے لیئے اس اصول کو منضبط کرتا ہے کہ کسی قوم کی پچھلی تاریخ اُسکے عروج اور زوال کے اسباب اُسکی فطرتی قوتوں اور اُسکے مرز بوم کے حالات - اُس قوم کی آئندہ روش پر روشنی ڈالتے ہیں - اسی بنا پر ہم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ آجکل کے نوجوانوں کے لیئے جنھیں ہندوستانی قوم کو از سر نو خلق کرنا ہے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں -

مسٹر دت کی تاریخ ہندوستان قدیم ہمارے ملک میں اُنیسویں صدی کی نامور کتابوں میں سے ہے - یہ ضرور ہے کہ جہاں تک محض واقعات کی تحقیقات کا تعلق ہے - اس کتاب میں بہت کچھ کمی ہے اگر یہی کتاب مسٹر دت آج لکھتے تو وہ موجودہ مستشرقین کی تحقیق اور تنقید سے ضرور فائدہ اُٹھاتے - اس خیال سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر ونسنٹ اسمتھ، پروفیسر رائیس ڈے وس کی کتابیں مسٹر دت کی

تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ معتبر ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسکے ہمکو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مسٹر دت نے مسٹر اسمتھ کی طرح واقعات بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اُنسے نتائج بھی اخذ کئے ہیں اُنکی کتاب محض تاریخی روزنامچہ نہیں ہے بلکہ ہندو تمدن کی داستان ہے اور چونکہ وہ خود ہندو تھے اور اس تمدن کی خوبیوں اور کمزوریوں سے بخوبی واقف تھے اسلئے باوجود تحقیقات کے نقائص کے جو کچھ اُنھوں نے ہندو تمدن کے متعلق لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ توجہ سے پڑھا جائے اور غور و فکر کی کسوٹی پر کسا جائے۔

مسٹر اے۔ وی۔ احمد صاحب نے مسٹر دت کی کتاب کے پہلے دَور یعنی ویدک زمانہ کی تاریخ کا ترجمہ کیا ہے اور کتاب کے باقی حصص کا ترجمہ کرنے کا آخر میں وعدہ فرمایا ہے۔ علاوہ ترجمہ کے آپ نے کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں قدیم داستانوں کے فوائد، مذہب اور تمدن کے تعلق۔ تاریخی تنقید کے اصول اور اسی قسم کے دیگر مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ زاں بعد وید سنسکرت کا علم ادب اور فلسفہ ویدانت۔ ہندوستان قدیم کے فنون نفیسہ وغیرہ کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اسکے بعد مسٹر دت کی سوانح عمری درج ہے۔

نئی روشنی کے دلدادہ غالباً یہ کہیں گے کہ اتنا بڑا مقدمہ کسی تاریخی تصنیف کے لئے ناموزوں ہے کیونکہ اسمیں اکثر انھیں باتوں کو دُہرایا گیا ہے جنپر مسٹر دت نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے اور جب ہمکو کتاب کا ترجمہ پڑھنا ہے تو ان باتوں کے اعادہ کی مقدمہ کے شکل میں کیا حاجت

تھی۔ ترجمہ میں زبان کی لطافت بہت کچھ موجود ہے لیکن کہیں کہیں پُرانی انشاپردازی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ذیل کے فقرے ملاحظہ ہوں:

"ابتدائی زمانے کی قدیمی روایتوں اور قومی تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ بالکل اس زمانہ کی ضد واقع ہُوا تھا اُسمیں نہ تہذیب تھی نہ شائستگی تھی نہ تمدن کی ترقی تھی نہ تعیش کا دفور تھا نہ ایسے اسباب راحت موجود تھے نہ ایسے سامان فرحت مہیا تھے نہ اسطرح کی معاشرت تھی نہ اس نہج کی منافرت تھی نہ یہ حرفت وصنعت کی گرم بازاری تھی نہ یہ زراعت وتجارت کی بھرمار تھی نہ کوئی نظام درست تھا نہ کوئی اسلوب صحیح تھا نہ کہیں ایسی منتظم بادشاہت تھی نہ کہیں ایسی باقاعدہ حکومت تھی نہ ایسے دستور رائج تھے نہ ایسے اصول قائم تھے نہ کسی قسم کا قانون نافذ تھا نہ کسی نوع کا آئین شائع تھا نہ یہ خلش تھی نہ یہ روش تھی نہ ایسا تکلف تھا نہ ایسا تصنع تھا نہ اسطرح کا علم ادب دیکھنے میں آتا تھا نہ اس قطع کا فلسفہ پایا جاتا تھا نہ کسی ذات کی قید تھی نہ کسی رسم کی پابندی تھی نہ اس حیثیت کی آرائش تھی نہ اس کیفیت کی نمائش تھی نہ یہ آفتاب آفتاب سمجھکر پوجا جاتا تھا نہ یہ ماہتاب ماہتاب جانکر مانا جاتا تھا غرضکہ یہ زمین زمین تھی نہ یہ آسمان آسمان تھا۔"

"جب ہمارا تصور ہم کو ابتدائی دُنیا کی سیر کراتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں کہیں خدا کی سادگی پسند مخلوق آباد ہے جسمیں نہ حد سے بڑھا ہُوا تعصب ہے نہ مقدار سے زیادہ

تشخص ہے نہ افراط ہے نہ تفریط ہے نہ تعمیم ہے نہ تخصیص ہے،
نہ پیکار غلو ہے نہ فضول علو ہے نہ تساہل ہے نہ تغافل ہے
نہ اندوہ ہے نہ یاس ہے نہ جسارت ہے نہ ہراس ہے نہ بیوجہ
عداوت ہے نہ بے سبب نفرت ہے نہ حقارت ہے نہ شماتت
ہے نہ کراہت ہے نہ اہانت ہے نہ کہیں بڑھی ہوئی حاجتمندی
ہے نہ کہیں گھٹی ہوئی حوصلہ مندی ہے ......"

اس کتاب کی ریویو میں ہم ایک امر کا ذکر کرنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ ہندوؤں کی قدیم تمدن کی داستان کا ایک مسلمان مترجم کے ہاتھوں اس زمانہ میں ترجمہ ہونا جبکہ ایک طرف مسلمان لیگ کا دَور دَورہ ہے اور دوسری طرف ہندو کانفرنس کی اشاعت ہو رہی ہے ایک مسرت انگیز اور تعجب خیز واقعہ ہے۔ مترجم صاحب کو انکی علمی کوشش اور انکی بے تعصبی پر مبارکباد دیتے ہیں اور جس عزت کے ساتھ اُنھوں نے ہندو بزرگوں کا نام لیا ہے اور جس طریق پر اُنھوں نے ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کے خوبیوں کی قدر دانی کی ہے اُسکو ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے لئے قابل تقلید سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب محمد فدا علی خاں صاحب سکریٹری ٹرینسلیٹنگ کمیٹی گھاٹ دروازہ جے پور سے مل سکتی ہے۔

منوہر لال زتشی

خوفِ رسوائی

(۱)

ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں ایک نازک اندام نفیس پوش عورت میز کے سامنے رخساروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔ مگر ظاہرا اس خیال میں غور کی محویت نہیں ہے۔ بلکہ بے چینی اور انتشار۔ اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار اُس کے حسین چہرے پر نمودار ہیں۔

سرلا۔ بابو دھرن چودھری کی بیوی تھی۔ دھرن کلکتہ کے ایک ہونہار بیرسٹر تھے۔ خلیق اور غریب نواز فیشنبل سوسائٹی سے محترز رہنے والے نہ بال سے رغبت۔ نہ گھوڑ دوڑ کے شیدا۔ وہ تھیٹروں اور پولٹیکل جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ ان کی اوقات کا بیشتر حصہ اپنے مقدمات کی تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا۔ جہاں تکلف اور ظاہرداری کے بدلے خلوص اور دوستی کے مراسم برتے جاتے تھے۔ دھرن کو فیشن سے انتہا درجہ کی نفرت تھی۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ کا ہر ایک گوشہ پولٹیکل خبروں سے گونج رہا تھا۔ مگر دھرن کو اُنسے صرف اتنی ہمدردی کہ اخباروں میں اُن کا تذکرہ دیکھ لیا کرتا۔ پولٹیکس سے اُسے مناسبت نہ تھی وہ اپنے دوستوں میں ایک سیدھا سلیم الطبع صلح پسند۔ میانہ رو۔ خوش باش آدمی مشہور تھا اس کے برعکس سرلا فیشنسٹ عقائد کی عورت تھی۔ اُس نے اعلیٰ درجہ کی

انگریزی تعلیم پائی تھی، اور ہندوستان کے پولٹیکل اور اقتصادی معاملات سے اُسے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک بار وہ اپنے کالج کی لیڈی پرنسپل سے صرف اس بنا پر جھگڑ پڑی کہ لیڈی صاحبہ نے برسبیل تذکرہ ہندوستانی عورات کے متعلق زبان سے کچھ اہانت آمیز کلمات نکالے تھے! آزادی نسواں کے متعلق بھی اس کے خیالات بہت وسیع تھے۔ باوجود اِن اسباب کے وہ ہندوستانی محبت اور جذبات کی عورت تھی۔ وضع کی پابند شوہر کی ادب اور محبت کرنے والی۔

سرلا سوچتی تھی "کیا یہ ممکن ہے؟" "انھیں اِن معاملات سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ یہ سب کسی بدخواہ کی شرارت ہے کسی سیہ باطن شخص نے یہ دروغ اختراع کیا ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں"

(۲)

حقیقت یہ تھی کہ آج پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کئی کانسٹبلوں کے ساتھ دھرن بابو کے مکان کی تلاشی لی تھی منگل کے روز چار بجے شام کو ہیرسین روڈ کے کنارے ایک نوجوان بنگالی نے ایک انگریز افسر پر بم کا گولہ چلایا تھا۔ اس ہولناک حادثہ نے سارے شہر میں کھلبلی ڈالدی تھی۔ خانہ تلاشیوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ دھرن بابو پر اس قتل کی اعانت کرنے کا جرم لگایا گیا تھا جو شخص سنتا اُسے حیرت ہوتی۔ دھرن بابو! نہیں۔ وہ ہرگز ایسے معاملوں میں شریک نہیں ہو سکتے! وہ ایسے سیدھے سادے۔ سلامت پسند۔ اپنے کام میں شب و روز محو رہنے والے آدمی تھے کہ کسی کو اُن کے متعلق ایسی متوحش خبر سُنکر اعتبار نہیں آتا تھا اور دھرن بابو پر یہ

شبہ محض ایک مخبر کے بیان کی بدولت عائد ہوا تھا۔ مخبر نے صاف صاف کہا تھا کہ منگل کو چار بجے دھرن بابو ہیریس روڈ پر موجود تھے۔ اور اُنھوں نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے بم کا گولہ دیا تھا۔ اسی بیان کی بدولت آج دھرن بابو کی خانہ تلاشی ہوئی۔ صندوق۔ الماریاں۔ کاغذات، خطوط ایک بھی تفتیش کنندہ افسر کی متجسّس نگاہوں سے نہ بچا۔ اور باوجودیکہ کوئی ثبوت ایسا نہ ملا جس سے دھر بابو پر اعانت جرم کے شبہ کی تائید ہو سکے۔ تاہم سپرنٹنڈنٹ نے انھیں زیر حراست لے لیا۔ سرلا انھیں پریشان کرنے والے واقعات کے اثر سے اس وقت بے چین ہے

وہ خیال کرتی تھی "ضرور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے غلطی ہوئی اُس نے دھوکا کھایا۔ منگل کو چار بجے دھرن عدالت میں ہوں گے، عدالت سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ اُن کے موکل اور احباب اسکی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر دھرن نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو اپنی بریت کا ثبوت کیوں نہ دے دیا۔ ممکن ہے اس وقت گھبراہٹ میں انھیں خیال نہ رہا ہو۔ اب ضرور انھوں نے صفائی کر لی ہوگی اور غالباً آتے بھی ہوں گے۔"

ان خیالات سے سرلا کا دل ذرا ہلکا ہوا۔ اسی اثناء میں ایک موٹر کار دروازہ پر آکر رکی۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ مسرت سے بیتاب ہوکر زینہ سے نیچے اُتری۔ موٹر گھر ہی کا تھا۔ مگر اس میں دھرن بابو کے بجائے جوتندر وسین نیشے ہوئے تھے۔ جو دھرن کے دلی دوستوں میں سے تھے۔

سرلا نے پوچھا "دھرن کہاں ہیں۔ دیکھا پولیس والوں نے کیسی

حماقت کی ہے۔ تم جانتے منگل کے دن شام کے وقت وہ ہائی کورٹ میں تھے۔ کیوں صفائی ہو گئی نہ۔ کب تک آئیں گے؟ تم اُن سے ملے تھے؟"

جوتندرو کے چہرے نے سرلا کے خیال کی تائید نہیں کی۔ وہ فکرمند اور دردناک نگاہوں سے سرلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے گھبرا کر کہا "جوتن تم اس قدر پریشان کیوں ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔"

جوتن نے کچھ سوچ کر جواب دیا "شاید دھیرن آج شب کو نہ آسکیں ممکن ہے کچھ توقف ہو۔ جونہی ان کی صفائی ہو گی، غالباً ان کا تم سے ملنا ضروری ہے۔ میں خیال کرتا ہوں ...." یہ کہتے کہتے جوتن بابو رک گئے۔ سرلا تاڑ گئی کہ یہ کوئی منحوس خبر لائے ہیں۔ گھبرا کر بولی۔ "جوتن! مجھے اس وقت پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کچھ کہتا ہو صاف صاف کہو۔ مجھ میں اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کیا دھیرن ابھی رہا نہ ہو سکیں گے کیا انھوں نے اپنے بریت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ وہ منگل کو چار بجے عدالت میں تھے۔ میرے خیال میں یہ تو بہت کافی ثبوت تھا۔"

جوتندرو نے لمبی سانس لیکر کہا "منگل کے دن سہ پہر کو وہ عدالت میں نہیں تھے!"

سرلا "کیا! عدالت میں نہیں تھے۔ آخر تب کہاں تھے؟" جوتندرو "یہی تو وہ بتلاتے نہیں۔"

سرلا "کیوں آخر وجہ؟ کیا آپ ہی اپنے دشمن ہوئے ہیں۔؟"

جوتندرو "وہ مطلق کچھ نہیں ظاہر کرتے۔ عدالت میں ان کے ۲ بجے

ٹکٹ رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے۔ مگر کہاں گئے اور ۴ بجے سے ۶ بجے تک کہاں رہے۔ اس کا وہ کچھ بھی پتہ نہیں دیتے"۔

سرلا نے عالم وحشت میں سر کو ہاتھوں سے تھام کر کہا: "میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ دھرن کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس سازش میں شریک ہوں۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے کہیں تب بھی مجھے اعتبار نہیں آسکتا۔ مگر وہ صاف صاف حقیقت حال کیوں نہیں کہتے۔ کیا تم لوگوں نے انہیں سمجھایا نہیں"؟

جوتندر: "سمجھایا کیوں نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے سر مغزی کرتے رہے۔ مگر جب کچھ ان کے خیال میں آئے۔ اور وہ ایسے کم فہم نہیں ہیں کہ ہم کو ان کے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ ایسے نازک موقع پر اُن کا کچھ صاف صاف نہ کہنا کیسے خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں بلا سے میں چند سالوں کے لئے جلاوطن ہو جاؤں گا۔ جلاوطنی اور قید جھیلنے کے لئے آمادہ ہیں مگر نکل کر کہاں گئے یہ نہیں بتاتے۔ اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید کچھ تمہیں معلوم ہو۔ کچھ معلوم ہے؟ وہ زیادہ تر کہاں آتے جاتے ہیں"؟

سرلا نے سر ہلا کر جواب دیا: "میں نے انھیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو اب تک اسی خیال سے خوش تھی کہ منگل کو چار بجے وہ ضرور کچہری میں رہے ہوں گے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر وہ کیوں خاموش ہیں۔ کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ ذرا مجھے اُن کے پاس لے چلو۔ شاید

وہ مجھ سے کچھ اپنے دل کی بات کہیں. ضرور کہیں گے. میں اُنھیں سمجھاؤں گی مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زبان سے حقیقت حال سُن لوں گی. وہ میری درخواست کو رد نہیں کر سکتے. بس مجھے اُن کے پاس لے چلو.

سرلا کا گلا بھر آیا. جوتن درد تسکین وہ لہجہ میں بولے "میرا بھی یہی خیال ہے کہ شاید تم کو وہ کچھ بتلا ہیں. اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا. مگر اب بات زیادہ آگئی ہے. اور اس وقت اُن سے ملاقات کرنے کی کوشش فضول ہے. مجسٹریٹ کی اجازت ملنی مشکل ہوگی. میں کل تمہیں وہاں لے چلوں گا. ایشور نے چاہا تو سب اچھا ہی ہوگا. ہائیں. یہ کیا. دل کو ڈھارس دو. گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے"

سرلا کی آنکھوں میں اشک اُمڈے ہوئے تھے. مگر اُس نے ضبط کیا اور جوتن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "جوتن. تمہاری ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں. مگر میں انھیں فراموش نہیں کر سکتی"

سرلا کی آواز پھر رک گئی. وہ کیسی خوش خوش زینے سے اتری تھی دھرن کی واپسی کی امید نے اُس کے چہرہ کو روشن کر دیا تھا. مگر اب اس پر حسرت ویاس کی زردی چھائی ہوئی تھی. جوتن بابو آہستہ آہستہ فکرمند کمرہ سے باہر چلے گئے. وہ سوچتے جاتے تھے "غریب! ابھی اُسے کیا خبر کہ کیا بیتنے والی ہے. کاش وہ ظالم اپنی زبان سے کچھ کہہ دیتا. مگر تب بھی عجیب گو مگو معاملہ ہے!"

(۳)

دس بج گئے تھے. سرلا نے کچھ نہیں کھایا. نوالے منہ سے باہر

سے نکلے آتے تھے۔ وہ پلنگ پر گئی۔ مگر نیند نہ آتی تھی۔ میز کے سامنے اخبار لے کر بیٹھی۔ مگر اخبار ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھڑکی طرف تب وہ اٹھکر ٹہلنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت دھرن کے پاس چلوں چلکر مجسٹریٹ سے کہوں کہ مجھے اُن سے ملاقات کرنے دو۔ کیا وہ انکار کرے گا؟

ہائے۔ دھرن اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ کاش میں انکے پہلو میں ہوتی۔ کیا وہ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپائیں گے۔ کیا اسوقت انھیں میرا خیال ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا دل جھنجلا اٹھتا اور وہ اپنے شوہر کو بے رحم خیال کرتی۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ میں کس قدر بے چین ہوں اسنے دنوں تک ساتھ رہنے پر بھی انھیں میرے دل کا، اور میری محبت کا اندازہ نہوا۔ وہ کیوں خاموش ہیں۔ وہ کیوں۔

ٹہلتے ٹہلتے اُس کی نگاہ دھربندھو کی میز پر پڑی۔ خطوط۔ کاغذات و اخبارات اوراق پریشان کی طرح بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ سرلا اضطراری طور پر بیٹھ گئی۔ اور انھیں سمیٹنے لگی۔ یکایک اس کی نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو میز کے نیچے گرا ہوا تھا۔ اس نے چاہا کہ اسے اٹھا کر دوسرے خطوط کے ساتھ رکھدے مگر اس پرزے پر چند ایسے الفاظ نظر آئے جو خود بخود اُسکی آنکھوں میں چبھ گئے۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کے پردہ میں اس کی پریشانیوں کا راز پوشیدہ تھا۔ "منگل کے دن ۸ بجے!" سرلا چونک پڑی۔ اُس پرزے کو اٹھایا۔ منگل کے دن ۸ بجے ہی کا تو یہ واقعہ ہے۔ اُس نے اِن الفاظ کو پھر غور سے دیکھا کیا اس پرزہ کو ان واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ کیوں میں نہ اُسے

پڑھوں۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ انداز تحریر سے بھی وہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ مگر خط کو پڑھوں؟ مسز لا باوجودیکہ شوہر کو دل وجان سے چاہتی تھی لیکن انگریزی تعلیم کے اثر نے اُس کے دل میں یہ خیال قایم کر دیا تھا کہ مجھے اپنے شوہر کے پوشیدہ خطوط پڑھنے کا کوئی مجاز نہیں ہے کیا میں اس خط کو پڑھ لوں تو وہ مجھسے ناراض ہوں گے یقیناً اس سے ان معاملات پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی اس میں کوئی ایسی بات ہرگز نہیں ہوسکتی جو وہ مجھسے چھپانا چاہتے ہوں۔ بالفرض اس میں کوئی مخفی بات ہی ہو۔ تاہم میں اس وقت اسے پڑھنے کی مستحق ہوں۔ تہذیب جدید کی یہ قیدیں ایسے نازک موقعوں پر عمل میں نہیں آسکتیں۔ کیا مجھے اُن کے رازدار بننے کا کوئی استحقاق نہیں ہے میں ثابت کر دوں گی کہ میرے دل میں بھی باتیں اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں جس طرح اُن کے دل میں۔

اس نے خط کھولکر دیکھا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ مسز لا ایک ہی نگاہ میں اُسے پڑھ گئی۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا گویا میرے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت ہوگئی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ میں کاغذ کا وہ پرزہ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا اور اس کی آنکھیں دیوار کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کا چہرہ خاک کی طرح زرد ہوگیا تھا عضو مفلوج کی طرح اس کے دل و دماغ اس وقت بیکار ہوگئے تھے خط کا مضمون بھی خیال میں نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ یکایک اس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اور ساری کیفیت نظروں کے سامنے

صورت پذیر ہو گئی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کرسی پہ گر پڑی
آہ اس خموشی کے یہ معنی ہیں! اسی لیے زبان پہ مہر لگی ہوئی ہے"
خیر اب مجھے کیا کرنا چاہیئے، سرلا سوچنے لگی۔

بیشک یہ خط دھرن کو اس الزام سے بری کر دے گا۔ جو اُن پر عائد ہے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دوں گی۔ ذرا سی تحقیقات میں سارے واقعات کھل پڑیں گے۔ اور دھرن فوراً رہا ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے بعد پھر کیسے نبھیگی! کیا اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کی محبت کر سکیں گے۔!"

اسے پھر خیال آیا کیا یہ مناسب ہے کہ میں اس راز کو اس طرح طشت از بام کر دوں جس کے مخفی رکھنے کے لئے دھرن یہ سب کچھ جھیلنے کو تیار تھے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں خموشی اختیار کروں۔ اور انھیں اس الزام کا خمیازہ اٹھانے دوں جس سے وہ بالکل پاک ہیں۔ انھیں بچانا میرا فرض ہے۔ آخر اس کے دل نے فیصلہ کر لیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرہ میں آکر ایک چادر اوڑھ کر باہر نکل پڑی۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اُسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

سرلا قدم بڑھاتے ہوئے تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت مکان کے سامنے آکر رکی۔ کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور ایک عورت میز پہ بیٹھی ہوئی کچھ لکھتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ سرلا کو دیکھتے ہی اُس عورت نے گھبرا کر پوچھا۔ "سرلا تم یہاں کہاں؟ اتنی رات گئے۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا دھرن بیمار تو نہیں ہیں؟"

سرلا نے میز کے سامنے آکر کہا "دیکھا تم نے نہیں سُنا کہ دھرن پر حادثہ بمب میں شریک ہونے کا جرم عائد ہوا ہے۔ مخبر کا بیان ہے کہ جس وقت قاتل کے ہاتھ میں بمب دیا گیا اُس وقت دھرن وہاں موجود تھے۔ یہ منگل کے چار بجے دن کا واقعہ ہے دھرن کا بیان ہے کہ مجھے ان سانحات کا مطلق علم نہیں۔ اور نہ اُس وقت میں وہاں تھا لیکن یہ وہ نہیں بتاتے کہ اُس وقت تھے کہاں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں منگل کے دن چار بجے شام کو وہ کہاں تھے؟

وہ عورت چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی "منگل کو چار بجے! اُس دن تو وہ۔۔۔۔۔" کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور بہت مدھم لہجہ میں بولی "کیوں وہ کچھ بتاتے نہیں کیا۔ سوا کچہری کے اور کہاں ہوں گے"۔

سرلا نے جواب دیا "نہیں اُس دن وہ عدالت میں نہیں تھے"! مگر ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ اُگل پڑی "اور اس معاملہ میں وہ اِس لئے خاموش ہیں کہ شاید اظہار حال کسی کے نام نیک پر دھبہ نہ لگا دے اب میرے سامنے ایسی بھولی نہ بنو۔ میں سب جان گئی ہوں۔ ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے، یہ دیکھو" یہ کہکر اس نے وہی خط میز پر پھینکدیا

اس عورت نے پیک خط اُٹھالیا۔ اور اس پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالکر کسی قدر بیباکانہ لہجہ میں بولی "مجھے کسی کا خوف نہیں ہے بیشک دھرن کو مجھ سے محبت ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے"۔

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ تب سرلا نے تحکمانہ انداز سے کہا "تو انھیں بچا کیوں نہیں لیتیں۔ اس خط کو مجسٹریٹ کے پاس بھیجدو۔ اور دھرن فوراً چھوٹ جائیں گے" یہ کہکر وہ لوٹ پڑی۔ اور

اور اپنے خانۂ محزون میں چلی آئی۔

تڑکا ہوگیا تھا۔ اور سرلا کی آنکھیں ابھی نہیں جھپکی تھیں۔ اسے اب دھرن کی رہائی کی فکر نہ تھی اس فکر سے اب وہ آزاد ہوگئی تھی۔ مگر جن فکروں نے اس وقت اسے گھیرا تھا وہ اس سے بھی زیادہ جانکاہ تھیں۔

"تھوڑی دیر میں وہ یہاں آتے ہوں گے مجھسے ملاقات ہوگی کیا میں ان سے مل سکوں گی؟ اب میں کس دعوے پر۔ کس برتے پر، اُن سے ملوں گی۔ جب یہ میں جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہے تو میں کونسا مُنہ لیکر ان کے سامنے جاؤنگی۔ جب تک میں الفت کا خواب دیکھ رہی تھی سنجھے اُن پر اعتبار تھا۔ مگر اب! آہ اب میرے لئے زندگی میں کیا امید ہے میرا دل۔ میری جان میری آرزوئیں۔ میری زندگی کی خوشیاں سب ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ محبت سے عورت کا سہاگ قائم ہے۔ میرا سہاگ اب کہاں"؟

سرلا کی آنکھیں کھڑکی کے باہر سبزہ زار کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گویا وہ مستقبل کے وسیع میدان میں قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اُس کے دماغ میں اب احساس کا مادّہ نہ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس۔ نیند اور تکان۔ یہ چیزیں اسے بالکل محسوس نہ ہوتی تھیں سست رفتار دن چڑھتا جاتا تھا اور سرلا وہیں کھڑکی کے سامنے انھی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھرن کی اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ مگر سرلا کو اس کی زیادہ تشویش نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ ایک حلیم اور متین شخص سمجھتی رہی۔ اُس نے بارہا اُن سے اُن کی بے رُخی اور بے اعتنائی کی شکایت کی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کے دل کو تسکین ہوگئی تھی کہ ان کی طبیعت ہی ایسی متین واقع ہوئی ہے۔ وہ

سمجھتی تھی کہ وہ طبعاً اظہار جذبات سے محترز رہتے ہیں۔ وہ اس کی طرف سے ہمیشہ بے تعلق سے رہتے تھے۔ کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ کن چیزوں کا شوق ہے ایسا شاذ ہی کبھی اتفاق ہوا تھا کہ وہ دُرگا پوجا کے دن سرلا کے لئے کوئی تحفہ لائے ہوں۔ سرلا سمجھتی تھی کہ مقدمات کی مصروفیت ان بے اعتنائیوں کا باعث ہے۔ اسے یقین تھا کہ گو ظاہر نہ سہی مگر دل سے وہ میری محبت کرتے ہیں۔ مگر اب ان سرد مہریوں کا راز سمجھ میں آگیا۔ وہ اب دوسری عورت کے دامِ محبت میں گرفتار ہیں۔ جب محبت کا رشتہ نہ رہا تو تمدنی رشتہ کس کام کا مگر باوجود ان سرد مہریوں کے وہ شوہر کی محبت میں مخمور تھی۔ اُس نے انھیں اپنے دل میں جگہ دیدی تھی اور اب کسی طرح ہٹا نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ محبت اُس کے لئے سوہانِ روح ہی کیوں نہ ہو۔ بیشک یہ خیالات حسد اور جلن کے سبب پیدا ہوئے تھے۔ مگر حسد کی تیزی اور جانکاہی محبت کی کسوٹی ہے۔

بہت دور تک سوچنے کے بعد سرلا اس نتیجہ پر پہنچی "میں اب ان کا دامن چھوڑ دوں گی۔ اس کے سوا میرے لئے اب اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ میں نے اب تک نادانستہ انھیں قید میں رکھا ہے اب میں انھیں چھوڑ دوں گی۔ اُن کا گلا چھوٹ جائے گا۔ انکی زندگی آرام سے گزرے گی۔ ایشور کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں سرسبز ہوں۔ انھیں خوش دیکھکر میں بھی خوش ہو لیا کروں گی"۔

انھیں خیالات میں دس بج گئے۔ سرلا اب تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک ایک گاڑی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اس نے کھڑکی سے

جھانک کر دیکھا۔ دھرن بیٹھے ہوئے تھے۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا مگر وہ بے جان لاش کی طرح بیٹھی رہی۔ زینہ پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور ذرا دیر میں دھرن کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرلا اب بھی کچھ نہ بولی۔ اُسے الفاظ ہی نہ ملے دھرن نے اُس کے پاس آکر آغوشِ محبت میں لینا چاہا۔ اور بولے "کیوں سرلا تم میری خاطر بہت پریشان تھیں"؟ سرلا نے مُنہ پھیر لیا اور ہٹ گئی۔ دھرن نے کچھ خیال نہ کیا کہنے لگے "پولیس والوں نے کیسی حماقت کی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ کسی طرح خانہ عافیت میں تو پہنچے۔ رات بھر مصیبت میں مبتلا رہا"۔

سرلا خاموش اُن کے چہرہ کی طرف تاکتی رہی کیسی مکر کی باتیں ہیں۔ دھرن کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی بے تکلفی وہی آزادی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سرلا زیادہ متحمل نہ ہو سکی۔ ترش لہجہ میں بولی "تم یہاں کیوں آئے"؟ دھرن نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا "سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو اپنے گھر کے سوا اور کہاں جاتا۔ تم میرے آنے سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کیا بات ہوئی؟"

سرلا "ابھی اُس سے ملاقات کی یا نہیں"؟

دھرن "کس سے؟ تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا"۔

سرلا "دھرن۔ اب یہ تجاہل مت جتاؤ۔ اب حیلہ سازیوں کا موقع نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں صفائی کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔ مجھ پر تمہاری ساری باتیں روشن ہو گئیں ہیں۔ ایک خط میری نظر سے گذر چکا ہے جو مجھے میز کے نیچے گرا ہُوا ملا۔ یہ خط میں نے تمہاری معشوقہ کو دکھایا۔ اور غالباً اس نے اسے مجسٹریٹ کے یہاں پیش کر دیا اس لیے اب مجھ سے دغل

فیصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری خوشی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمہیں شوق سے لطف زندگی اٹھانے کے لئے آزادی دیتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں مجھے اور پہلے کیوں نہ معلوم ہو گئیں ورنہ تمہیں اتنے عرصہ تک قید بے جا میں نہ رہنا پڑتا۔"

دھرن بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر راز طشت از بام ہو گیا۔ میں نے کیا حماقت کی کہ خط کو چاک نہ کر دیا۔ اس نے وہ خط مجسٹریٹ کے یہاں دیکھا تھا۔ اور حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا کہ کیونکر یہ وہاں پہنچا۔ مگر یاد نے کچھ کام ندیا تھا۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اوپر جھنجلایا۔ مگر سرلا کی خوشامد کرنے لگا: "میری جان! میں سخت نادم ہوں۔ واقعی مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر کیا تم میری اس خطا کو معاف نہیں کر سکتیں۔ اگر کسی کے کان میں اس کی ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری خیر نہیں۔ ابھی تک یہ بھید چھپا ہوا ہے۔ مجسٹریٹ بڑا دانا شخص ہے۔ اس نے خط کو دیکھ کر مجھے تو رہا کر دیا۔ مگر اسے عدالت میں پیش نہیں کیا۔ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے مگر تم خوب جانتی ہو کر لوگوں کو ایسی باتوں کی کیونکر تلاش رہتی ہے پبلک کو دوسروں کی رسوائی و بدنامی میں مزہ آتا ہے۔ میری خاطر سے تم اس تذکرے کو زبان پر نہ لاؤ۔ غلطیاں انساں سے ہوتی ہی ہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو حلفیہ کہتا ہوں کہ اب کبھی اس کے دروازہ پر نہ جاؤں گا!"

سرلا:- "کیوں تم اس پر عاشق نہیں ہو؟ اس کی آبرو کے خوف سے تم قید اور جلاوطنی جھیلنے پر آمادہ تھے۔ اور اب تم کہتے ہو میں اس کے دروازے پر نہ جاؤں گا۔ کیا اتنی جلد دل سے نقش محبت مٹ گیا۔ ! ان فریب کی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تم شوق سے خوشیاں مناؤ۔ میں

ذرا بھی مخل نہوں گی۔ حسد کا کانٹا بنکر کسی کے پہلو میں کھٹکنا نہیں چاہتی۔"

دھرن کرسی پر بیٹھ گئے اور غمناک لہجہ میں بولے بیدسرلا! ایسی باتیں بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہیں۔ جب تم دیکھتی ہو کہ میں حد درجہ نادم اور پشیمان ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ تو تمھیں ایسی باتیں کر کے میرا دل نہیں دکھانا چاہیئے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے میں کس حد تک نقصانات اٹھانے کے لئے تیار تھا۔ اگرچہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر مجھے جلاوطن ہونا گوارا تھا بجائے اس کے کہ شکل کے دن اپنے حرکات کا پتہ دوں۔ اب تک طرح طرح کی افواہیں اڑتی ہوتیں۔ یقین مانو اس رسوائی کے مقابلہ میں میں جلاوطن ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔

سرلا: "اگر راہ محبت میں قدم رکھا ہے تو رسوائی کا کیا خوف! اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمہیں سوسائٹی کا اس قدر خوف نہ کرنا چاہیئے۔"

دھرن: "کیسی باتیں کرتی ہو۔ سرلا! سوسائٹی کا خوف خدا کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم نے یہ روش اختیار کی تو میری عزت خاک میں ملادو گی اور میرا مستقبل سیاہ ہو جائے گا۔ میں سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ سرلا۔ تم اس وقت غصہ میں ہو مگر جب تمہاری طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔ غصہ فرو ہو جائیگا اور تم اس مسئلہ پر غور کرو گی تو یقیناً میری یہ خطا معاف کردو گی۔ ایسی بہت کم عورتیں ہوں گی جنھیں اپنی زندگی میں ایسی گتھیاں نہ سلجھانی پڑتی ہوں۔ میں مبالغہ نہیں کرتا ہوں۔ سوسائٹی میں ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر پردہ کے اندر۔ میں [illegible]

کا شیدا سہی۔ کیا تمہیں بھی میری محبت نہیں۔ اُسی محبت کے صدقے تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب پھر ایسا موقعہ کبھی نہ آئے گا" یہ کہکر دمری باہر چلے گئے۔ اور سرلاڈ ہیں خاموش بیٹھی سوچتی رہی "سوسائٹی کا شیرازہ ایسے سچّے دھاگے سے بندھا ہوا ہے"!

غزل

رہی فراق میں بھی شکل روبرو تیری ۔۔۔ شبیہ کھینچی تصور نے ہُو بہ ہُو تیری

معاف رکھ! جو ہیں گلہائے تر سے پیار مجھے ۔۔۔ کہ ان میں رنگ ترا کچھ ہے، کچھ ہے بُو تیری

نسیم صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا! ۔۔۔ رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری

یہ فخر کم نہیں ہم قابلِ خطاب تو ہیں ۔۔۔ عزیز اور کے القاب ہیں "تو" تیری

دہانِ غنچۂ تر سے، زبان سوسن سے ۔۔۔ چمن چمن میں سنی ہے گفتگو تیری

دل و جگر پھکے جاتے ہیں سوزِ ہجراں سے ۔۔۔ لگن عذاب ہوئی مجھکو شمع رو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو، بقول سرورؔ

"کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری"

محروم

گذرے ہوئے ملال فراہم نہ کیجئے ۔۔۔ اچھے بھلے مزاج کو برہم نہ کیجئے

پھر کاہشِ ہوس سے تبہ ہوگی زندگی ۔۔۔ دشمن پہ رحم کیجئے اب دم نہ دیجئے

الفت کو گر فروغ نہ دیجے نہ دیجئے ۔۔۔ جو رہ گئی ہے اس کو تو اب کم نہ کیجئے

روشن ہیں مجھ پہ حسن کی سب کارسازیاں ۔۔۔ اپنے ستم کو لطف سے مدغم نہ کیجئے

مصروف منع گریہ رہے آستین جیب

بسمل کا اس طریق سے ماتم نہ کیجئے

بسمل سعیدی

حکیم مارکس آریلیس

مارکس آریلیس ۲۶ر اپریل سنہ ۱۲۱ء کو بمقام روما پیدا ہوا۔ اسکا اصلی نام مارکس اینٹونیس ہونا چاہیئے مگر چونکہ اس نے اپنی زندگی کے مختلف حصص میں مختلف نام اختیار کئے ہیں (کیونکہ اس زمانہ میں نام کی تبدیلی بالکل ایک معمولی بات تھی) اس لئے یہ دیکھنا مشکل ہے کہ وہ کس نام سے زیادہ تر مشہور ہے۔ اسکا والد انیئیس وریس جو پریٹر (مجسٹریٹ) کے عہدہ پر ممتاز تھا، روما کے دوسرے بادشاہ نیوما کی اولاد میں سے تھا۔ اسکی والدہ ڈومیشیا کیلولا بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ان دونو کے کیرکٹر بہت اچھے تھے۔ ہمیں اس کے والد کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں اسلئے کہ آریلیس کی شیرخوارگی ہی میں اسکا انتقال ہوگیا تھا۔ مگر اپنی کتاب "غور و فکر" میں وہ اپنے والد کی بہت تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اپنے دادا سے میں نے اخلاقِ حسنہ سیکھے اور یہ بھی سیکھا کہ مزاج پر کس طرح قابو رکھا جاسکتا ہے۔ اپنے والد کی یاد سے میں نے بہادری اور حیا سیکھی اور اپنی والدہ سے خدا ترسی، فیاضی اور سادگی سیکھی۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ تمام برے افعال سے کیا برے خیالات سے بھی اجتناب کرنا مجھے میری والدہ ہی نے سکھایا تھا۔

ہمارے حکیم کا بچپن اور لڑکپن بادشاہ ہیڈرین کے عہدِ حکومت میں گذرا ہے۔ اس بادشاہ میں اگرچہ چند برائیاں بھی تھیں مگر بہ حیثیت مجموعی وہ دانشمند اور نیک بادشاہوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

یہ بادشاہ بہت قابل تھا اور اس نے اپنی فراست سے آریلیس میں وہ غیر معمولی اوصاف دیکھ لئے تھے جنہوں نے بعد میں سلطنت میں برکت دی اور عوام کے جذبات کو بہتر بنا دیا۔ یہ بادشاہ لاولد تھا اور اسلئے اس نے کیونٹیس کموڈس کو اپنا متبنیٰ بنایا جو اگرچہ بہت کم اوصاف سے متصف تھا مگر اسکی ذاتی خوبصورتی بہت بڑی سفارش ثابت ہوئی۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ میرا آخری وقت قریب آگیا ہے تو اس نے تمام اعیانِ حکومت کو جمع کیا اور ان کے روبرو اپنے متبنیٰ اور جانشین امپریس اینٹونینس کو بھی اس نے اس شرط پر بادشاہ بنانا منظور کیا تھا۔ کہ وہ اپنے بعد مارکس آرلیس کو ہی کو جانشین مقرر کریگا۔ تخت پر بیٹھنے کے وقت اینٹوتینس کی عمر ۵۲ برس کی تھی۔

حکیم آریلیس کی تعلیم کا ہمیں اگر کچھ پتہ چلتا ہے تو محض اسکی اپنی تحریر سے۔ اسکی تعلیم و تربیت اس کے دادا کے یہاں ہوئی جو تین مرتبہ کونسل دایک معزز عہدہ) رہ چکا تھا۔ وہ اس امر کے متعلق دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اسے کسی مدرسے میں نہیں بھیجا گیا ورنہ اخلاقی لحاظ سے اسکی بھی ویسی ہی دُرگت ہوتی جیسے دیگر طلبا کی ہوئی۔ وہ اپنے دادا کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے گھر پر اچھے اُستاد رکھدئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نہایت فراخدلی کے ساتھ تعلیم دی گئی۔ وہ مکہ بازی، اور لڑنت اور بھاگنے دوڑنے کا بہت شائق تھا۔ وہ بلّی میں اچھی طرح سے ماہر تھا، اور اسے جنگلی سور کے شکار کا خاص شوق تھا الغرض اسکے تفریحی مشاغل، اسکی اعلیٰ تعلیم، اسکی اخلاقی تربیت اور عزت نے اسکا کیرکٹر بہترین بنا دیا۔ اسکی تعلیم کے تین اوصاف۔

"محنت" "شکرگزاری" اور "نفس کشی" بالخصوص قابل ذکر ہیں کیونکہ وہ ان باتوں پر مذہبی عقیدت کے ساتھ زندگی بھر عامل رہا ہے۔

(۱) وہ اپنی کتاب "غور و فکر" میں بار بار وقت کی قیمت سے متعلق ذکر کرتا ہوا اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش مجھے علمی مشاغل کے لئے زیادہ فرصت مل جایا کرے۔ وہ نہایت مستقل مزاجی سے مطالعہ کی ہر صنعت میں محنت کرتا تھا اور اگرچہ اس نے دیدہ و دانستہ فن بلاغت کا مطالعہ نہیں کیا مگر اس نے فلسفہ، تعلیم اسلحہ اور رومن لا پر زیادہ محنت صرف کی۔ وہ اپنے اتالیق رسٹیکس کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے مجھے غور و فکر کے ساتھ پڑھنے کی عادت ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ایک منٹ کو بھی رائگاں نہیں کھوتا تھا اور اسی وجہ سے اسکی صحت بھی خراب ہوگئی تھی۔

(۲) کتاب "غور و فکر" کے ابتدائی ریمارکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام اُستادوں کا خواہ وہ کیسے ہی معمولی ہوں، نہایت شکرگزار رہے۔ اس نے اپنے ہر استاد سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا اور اسی وجہ سے وہ فرنٹو، رسٹیکس اور جولیس پر وکیولس کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ وہ دیوتاؤں کا بھی ان الفاظ میں شکریہ ادا کرتا ہے کہ "انہوں نے اسکے لئے اسکی خواہش کے موافق اتالیق مہیا کر دئے" وہ اگرچہ اپنے استادوں سے معاشرتی اور ذہنی لحاظ سے بزرگتر تھا مگر اس نے اپنی بلند پوزیشن کے باوجود ان سب سے دوستانہ مراسم رکھے اور مرتے دم تک ان سے عزت اور محبت کا سلوک کرتا رہا۔ اس نے ان کے بُت اپنے مکان میں رکھے اور ان کی قبروں پر جاکر

پھولوں کے ہار چڑھایا کرتا تھا۔

(۴۳) اسکی نفس کشی اور ریاضت اسکی محنت اور شکر گزاری سے زیادہ مشہور ہے۔ اس شخص کو اگرچہ ہر قسم کے عیش و آرام کے سامان مہیا تھے مگر اس نے تن پروری کو ہمیشہ تنفر کی نظر سے دیکھا۔ اسکی یہ مثال ان نوجوانوں کے لیئے قابل تقلید ہے جو سیکنڈ کلاس گاڑیوں میں سفر کرنا اپنے لیئے موجب فخر خیال کرتے ہیں جو انتہائی فیشن کے دلدادہ ہونے کے علاوہ بوٹوں اور شربتوں پر اسقدر روپیہ برباد کر دیتے ہیں جو ایک غریب شخص کے لیئے سال بھر تک کافی ہو سکتا ہے۔ یقیناً وہ اس زندگی کو پڑھکر یہ معلوم کرینگے کہ اس شریف رومن کی نفس کشی ہماری تن پروری سے نہایت ارفع و اعلےٰ ہے۔ وہ ابتدا ہی سے محنت کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا اور اسے ہر قسم کے سامانِ مسرت سے نفرت تھی۔ وہ جو کچھ کرتا تھا اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔ گیارھویں سال کے سن میں اسکی ملاقات حکیم ڈائگن ٹس سے ہوئی جس نے سب سے اول اسے اسٹوئک فلسفہ سے آشنا کرایا۔ بارھویں سال کی عمر میں اس نے فرقۂ اسٹوئک کا لباس اختیار کر لیا۔ اس فلسفہ نے اسے سکھایا کہ "لکڑی کے فرش پر سونا بہتر ہے" کہا جاتا ہے کہ وہ لکڑی کے فرش پر کسی جانور کی کھال اس لیئے بچھا لیا کرتا تھا کہ اسکی ماں نے بمنت اسے بچھانے کے لیئے درخواست کی تھی ورنہ وہ کسی تخت پر یا زمین کے فرش پر سونا زیادہ بہتر خیال کرتا تھا۔ لیکن وہ یہ کام کسی نمود اور تمنائے تحسین کے بغیر کیا کرتا تھا۔ اسکے دوست اسے ہمیشہ بشاش پاتے تھے اور اسکی سکوت آمیز طرزِ عمل میں ایک خاص وقار اور تفکر معلوم ہوتا تھا۔ بدمزاجی یا افسردگی اسمیں نام کو نہیں تھی۔

مارکس آریلیس کے سرپرستوں نے اسکے لئے زمانے کے ممتاز ادبی اُستادوں کو جمع کر دیا تھا۔ یونان یا اٹلی کے کسی شاہزادے کے لئے تعلیم وتربیت کا اتنا اہتمام نہیں کیا تھا جتنا اسکے لیئے کیا گیا تھا، اور ساتھ ہی واقعہ بھی یہ ہے کہ آجتک کسی اُستاد کو ایسا شکر گزار، منکسرالمزاج اور بے لوث شاگرد بھی میسّر نہیں ہُوا۔ کواڈی کی جنگ کے دوران میں اس نے ایک کتاب لکھی جسمیں اس نے اپنے تمام اوستادوں کا شکریہ ادا کیا۔ یہ کتاب بھی کتاب "غور وفکر" کا ایک جزو بن گئی ہے اگرچہ اسکی ساری عمر طرح طرح کے مصائب وواقعات سے لبریز ہے، لیکن اس نے ہمیشہ ان سے علیحدگی کی اور ان بڑی بڑی صفات پر غور کرتا رہا جو اسکے مشاہدے میں آتی ہیں اور ساتھ ہی وہ ان تمام اسباق پر بھی غور کرتا رہتا تھا جو اسکے نزدیک اس کے اوستادوں کی تعلیم سے اخذ کیئے جا سکتے ہیں۔

اپنے ایک نگران سے اس نے محنت کرنے اور مغلظات سننے سے احتراز کرنے کا سبق سیکھا۔ ڈائگنی ٹس سے اس نے اوہام باطلہ سے نفرت رکھنے اور نفس کشی کرنے کا سبق حاصل کیا۔ اپولونیس سے سیکھا استقلال اور برداشتِ مصائب کرنا چاہیئے اور بغیر کسی ظاہری نمود کے متانت اختیار کرنی چاہیئے۔ اسی حکیم نے اسے یہ سبق دیا تھا کہ ہر شخص سے زمن فیاضی، اور حلم سے پیش آنا چاہیئے۔ سیویرس نے اسے یہ سکھایا کہ ہر وقت طبیعت کو نیکی کرنے پر مائل رکھنا چاہیئے اور ساتھ ہی یقین کرنا چاہیئے کہ میرے دوست مجھ سے محبّت کا برتاؤ کرتے ہیں میکیمس سے اس نے یہ سیکھا کہ طبیعت میں بھاری بھرکم پن، اور وقار اور شیرینی پیدا کرنی چاہیئے اور جو کچھ کام سامنے رکھا جائے اسے بغیر

کسی شکایت کے کرنا چاہیئے،" اسکندر سے اس نے یہ سیکھا کہ "نہ تو اثنائے گفتگو میں کسی سے یہ کہا جائے اور نہ چٹھی میں کسی شخص کو یہ لکھا جائے کہ مجھے فرصت نہیں ہے، اور نہ ہمیشہ یہ کہکر چھوٹے کاموں کو بغیر کئے چھوڑ دینا چاہیئے کہ مجھے ضروری کام ہو گئے تھے"!

ان استادوں کے علاوہ اٹش کس نے بھی اسے سیدھی سادی عبارت لکھنے اور ہر قسم کی نمود سے بچنے کی ہدایت کی تھی۔ اینٹونی نس جس نے مارکس اریلیس کو متبنےٰ بنا رکھا تھا اور جو آریلیس کے نزدیک باحیا، وفادار اور مستقل مزاج بادشاہ کی زندہ مثال تھی۔ ہمیشہ ہمارے ہیرو کے پیش نظر رہتا تھا۔ یہ وہ بادشاہ تھا جسے خوشامد سے نفرت تھی اور جو تصنع کو حقارت کی نظر سے دیکھتا، جو دانشمند اشخاص کی عزت کرتا اور سخن اشخاص کو مراج عطا کرتا تھا اور جو سلطنت کے کاروبار میں نہایت مشغول رہتا تھا۔ مارکس آریلیس کسی دوسرے مقام پر بھی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے کہ خدا ترسی، پاکیزگی حلاوتِ سخن، استقلال، سادگی، صبر کی صفات اسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان الفاظ کے لکھنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ "تو اِن تمام باتوں کا تتبع کرتا کہ تیرا ضمیر مرتے وقت ایسا ہی پاکیزہ ہو جائے جیسا کہ اسکا تھا"!

اپنے استادوں اور آبیقون کی شکر گزاری کرنے کے بعد وہ دیوتاؤں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہی کی رہنمائی سے میں نے فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا اور انہی کا فضل تھا کہ میں گناہ سے اجتناب کرتا رہا۔ ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے کہ "میں اس لئے بھی دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی عنایت و فضل سے مجھ پر ایسی حالات طاری نہیں ہوئیں جن کے باعث مجھے آزمایش میں پڑنا پڑتا۔ مزید بر آن میں

ایک ایسے بادشاہ اور والد کے ماتحت تھا جنہوں نے میرے دل سے تمام غرور و تکبّر نکال دیا اور مجھے یہ سکھایا کہ محل میں محافظ سپاہیوں، کشیدہ کپڑوں، مجسموں اور اس قسم کی دیگر نمائشوں کے بغیر زندگی بسر کرنی ممکن ہے، نیز یہ کہ اگرچہ میری والدہ کا نوجوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ مگر اس نے اپنے آخری برس میرے ساتھ بسر کئے، یہ کہ بچپن میں میرے لئے بہت سے لایق اُستاد مہیا کیے گئے۔ اور ان امور کے لیئے دیوتاؤں اور قسمت کی امداد کی ضرورت ہے"۔

اس شہنشاہ اور حکیم کی کتاب "غور و فکر" اس قابل ہے کہ اس زمانے کے لوگ اسے گہری توجہ سے پڑھیں، حقیقت میں جس نفس کشی کا اظہار اسمیں کیا گیا ہے، وہ ہمارے روز افزوں سامانِ آسائش و آرایش کے لئے ایک زبردست تازیانہ کا کام دے سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں جس توکل برضائے خداوندی کا ذکر ہے، وہ ہماری مسلسل بے چینی اور بے اطمینانی کے لئے ایک زبردست دھمکی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں جو بلند پروازیاں دکھائی گئی ہیں وہ موجودہ زندگی کے مراسم کی لاانتہا چھوٹی بُرائیوں کو شرم دلانے کے لئے کافی ہیں۔

۱۳۸ء میں ہیڈرین کے انتقال کے بعد اینٹونینس پائس تخت پر بیٹھا اور متوفی شہنشاہ کی وصیت کے مطابق مارکس آرلیس اور ریوس کموڈس کو متبنےٰ بنالیا۔ مارکس کی منگنی ۱۵ برس کی عمر میں کموڈس کی ہمشیرہ سے قرار پاگئی تھی، لیکن جدید شہنشاہ نے اس قرارداد کو فسخ کر دیا۔ اور اسکی بجائے اپنی بیٹی فاسٹینا سے منگنی ٹھیرادی مگر شادی سات سال بعد یعنی ۱۴۶ء میں ہوئی۔

اینٹونینس کا عہد حکومت ان عمدہ زمانوں میں سے ہے جن کی کوئی تاریخ نہیں۔ اس زمانے میں ہر جگہ تقریباً امن ہی رہا۔ ٹیکس کم کر دیے گئے۔ لوگوں کی مصائب ہلکی کی گئیں، محکمہ جاسوس کم کیا گیا۔ ضبطیاں بہت کم عمل میں آئیں اور قتل و سازش کے واقعات بہت کم رونما ہوئے۔ ساری رعایا اپنے بادشاہ سے محبت کرتی تھی اور شہنشاہ کا بھی صرف یہ مقصد تھا کہ لوگوں کے آرام و آسایش کا خیال رکھے۔ اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ "جو چیز شہد کی مکھی کے لئے سود مند ہے وہی مکھیوں کے چھتے کے لئے بھی مفید ہے" اس نے جمہوریت کے طریقہ سے حکومت کیسی تھی۔ اسے لڑائی سے اصلی نفرت تھی اور یہی وجہ ہے کہ اسنے "امپریٹر" کے فوجی لقب کو اپنے لئے استعمال کرنا پسند نہیں کیا۔

ایسے دانشمند اور قابل تعریف بادشاہ کے ساتھ مارکس آریلیس نے ۲۳ سال کا زمانہ بسر کیا۔ ان دونوں کے تعلقات اسقدر قریب تھے اور ان کی محبت اسقدر زیادہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو باپ اور بیٹا سمجھتے تھے اور اس طول وطویل زمانہ میں آریلیس دو مرتبہ سے زیادہ اینٹونیس کے مکان سے باہر نہیں سویا۔ ان دونوں میں کسی قسم کا باہمی رشک وحسد نہ تھا، بلکہ برخلاف اسکے وہ ایک دوسرے کے مشیر تھے۔ شہنشاہ نے اپنے جانشین کو "سیزر" کا لقب عطا کیا تھا اور اسے ہر قسم کے اعزاز عطا کئے تھے۔ دیگر امرا کو ایسے تعلقات دیکھکر جلن پیدا ہوئی اور انھوں نے اس باہمی اعتماد کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اینٹونینس نے آریلیس کی والدہ کو دیکھا کہ دیوتا "اپالو" کے مجسمہ کے روبرو نہایت تضرع اور عاجزی کے ساتھ

دعا مانگ رہی ہے۔ ویلیرس آمیوس نے شہنشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کی اور کہا کہ "آپ کیا خیال کرتے ہیں کہ یہ اسقدر عاجزی کے ساتھ کیا دعا مانگ رہی ہے۔ یہ کہہ رہی ہے کہ خدا کرے کہ شہنشاہ مرجائے اور میرا بیٹا اسکی بجائے تخت نشین ہوجائے" یہ بات بظاہر معمولی سی دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس شہنشاہ کی بجائے کوئی اور معمولی ظرف کا بادشاہ ہوتا تو وہ یقیناً مارکس آرلیس کی طرف سے بدظن اور متنفر ہوجاتا مگر اینٹونیس نے اس بات کو نفرت آمیز خاموشی کے ساتھ سنکر ٹال دیا۔

یہ بادشاہ اکثر روما ہی میں رہتا اور ہیڈرڈ کی طرح اسے جہاں گشت بننے کا شوق نہ تھا۔ اسے عمارتوں سے بھی زیادہ کچھ دلچسپی نہ تھی اور نہ اسے اپنی خوراک و پوشش کا کچھ خیال تھا وہ عزلت نشین تھا اور اسکی ساری زندگی راہب درویش کی سی بسر ہوئی، مگر اس نے راہبوں کی طرح کبھی اپنے جسم کو ناجائز تکلیف نہیں دی۔

۱۶۱ء میں جبکہ بادشاہ کی عمر ۷۵ سال کی تھی اور مارکس آرلیس کی عمر صرف ۴۰ سال کی تھی، بادشاہ بمقام لوریم بخار میں مبتلا ہوگیا اور اس نے یہ محسوس کرکے کہ اب آخری وقت آپہنچا ہے، تمام امرائے سلطنت کو بلایا اور ان کے سامنے باضابطہ طور پر مارکس آرلیس کو اپنا جانشین قرار دیا۔ اس نے سب لوگوں کو تسلی و تشفی کرنے کی تلقین کی اور مارکس کے کمرہ میں قسمت کا طلائی مجسمہ بھجوادیا۔ یہ طلائی مجسمہ ہمیشہ شہنشاہوں کے پرائیوٹ کمروں میں رکھا رہتا تھا اور اسے خوشحالی کی نیک فال سمجھا جاتا تھا۔

جدید شہنشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے

اپنے برادر مجازی (جسے انیٹونینس نے مارکس کے بعد اپنے متبنیٰ بنایا تھا) لوسیلس ویرس کو تمام ملکی اعزازات سے مشرف کیا اور ساتھ ہی "سیزر" اور "آگسٹس" کے معزز لقب عطا کئے۔ مارکس نے اسے فوج کا کمانڈر انچیف بھی بنا دیا تھا اور تمام سول معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مگر یہ شخص اپنے عہدۂ جلیلہ کا اہل ثابت نہیں ہوا۔

ملکہ فاسٹینا سے مارکس کے یہاں بہت اولاد ہوئی عہدِ حکومت کے اول سال میں دو لڑکے ایک ساتھ پیدا ہوئے جن میں فقط ایک شہنشاہ کموڈس (۱۸۰ء سے ۱۹۲ء تک) زندہ رہا جس کی عیاشانہ اور جابرانہ زندگی نے سب رعایا کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی تھی۔ دو بچوں کا ایک ساتھ پیدا ہونا رومیوں میں ایک فال بد سمجھا جاتا تھا اور اس لڑکے کے پیدا ہوتے ہی با امن سلطنت پر مصائب کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ سب سے پیشتر دریائے ٹائبر کی طغیانی روما کے ایک حصہ کو برباد کرنے کے علاوہ ہزارہا مویشیوں کو بہا کر لیگئی، فصلیں تباہ ہوگئیں اور ان تمام باتوں کا نتیجہ خوفناک قحط کی صورت میں نکلا۔ اس عہدِ حکومت میں بہت سے زلزلے آئے، بہت سے شہر جل کر خاکستر ہوگئے اور طرح طرح کی خوفناک [illegible] پھیلیں۔ بادشاہ نے ان تمام قدرتی مصائب کو ہلکا کرنے کی اپنے [illegible] بھر کوشش کی، مگر اس اثنا میں لڑائیوں کے خوف اور لڑائیوں کی افواہوں نے ملک کی رہی سہی حالت کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ بادشاہ والوجیس نے شام کے صوبہ کو جو رومیوں کے ماتحت تھا، تباہ و برباد کر دیا۔ کیٹی کی اقوام جرمنی پر ٹڈیوں کی طرح چھا گئیں اور وہاں جا کر انہوں نے آگ اور تلوار کے ذریعہ غارتگری شروع کر دی۔

انگلستان سے ہی بغاوت اور شور وشغب کی خبریں آنے لگیں۔ الغرض مارکس آرلیس کے عہد میں شروع سے آخر تک یہی جھگڑے ہوتے رہے۔

چونکہ بادشاہ والوجیسس کا حملہ ان سب سے زیادہ بڑا تھا، اس لئے اس کے مقابلہ کے لئے ویرس کے ماتحت فوج روانہ کی گئی۔ اس معرکہ میں جنرل ایویڈس کیسیس کی اعلیٰ قابلیت کی بدولت سلطنت کی عزت برباد ہونے سے بچ گئی۔ یہ دونو جنرل اِس لڑائی کے فتح کرنے کے بعد اس تزک واحتشام کے ساتھ شہر میں داخل ہوگئے جو اس زمانہ میں فاتحوں کے لئے روا رکھی جاتی تھی۔ مگر رومی فوج واپسی پر اپنے ساتھ وبا لیتی آئی۔ چنانچہ ویرس بمقام ایکویئل اسی وبا کے نذر ہوگیا۔

بادشاہ نے کمانڈر ویرس کی لاس کو بادشاہ ہیڈرڈ کی قبر کے برابر نہایت اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ لوگوں نے اِس نیک دل بادشاہ پر ویرس کے قتل کا الزام عائد کیا مگر یہ سراسر حقیقت کے خلاف ہے اسی لئے کہ بادشاہ نے ہمیشہ اس کے قصوروں کی عیب پوشی کی اور باوجود اسکی نااہلیت کے اسکو ہر قسم کی عزت سے مشرف کیا۔

مارکس باوجود اس امر کے کہ شہنشاہ تہا، مگر اسمیں کسی قسم کا غرور وتکبر پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ حلیم الطبع رہا۔ وہ درحقیقت اپنے آپ کو تمام بندگانِ خدا کا خادم تصور کرتا تہا۔ حفاظتِ نابالغاں، سڑکوں کی درستی، درستیِ اخلاق، تقرر مجسٹریٹ وغیرہ کے مسائل ہمیشہ اسکے پیشِ نظر رہتے تھے۔ اسنے مقدمہ بازی کو کم کیا، گلیڈی ایٹرز کے خون آلود کھیلوں کو محدود کردیا اور اسکے علاوہ بہت سے رفاہِ عام کے کام کیئے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اسکی صحت خراب ہوگئی۔ بڑے بڑے تماشاؤں اور کھیلوں میں اگرچہ اسکی موجودگی ضروری تہی مگر یہاں بہی وہ پڑھتے یا نوٹ لکھنے

اقبال

تقریباً آٹھ برس ہوئے کہ اقبال نے یہ نظم یورپ کی مادہ پرستی کے خراب اثرات کو دیکھ کر یورپ کے قیام ہی میں لکھی تھی کہ سچ ہے کہ حقیقی شاعر تلمیذ الرحمن ہوتا ہے۔ جو کچھ آٹھ برس پیشتر شاعر کے دماغ میں تھا وہ آج ہو بہو پیش آ رہا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ روحانیت کو مادیت پر فتح ہوگی

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا ۔۔۔ سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے ۔۔۔ بنیگا سارا جہاں میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارہ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسینگے ۔۔۔ برہنہ پائی وہی رہیگی مگر نیا خار زار ہوگا

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر ۔۔۔ جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا ۔۔۔ سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں ۔۔۔ تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیار مغرب کے رہنیوالو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے ۔۔۔ کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی ۔۔۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنیگا وہ ناپائدار ہوگا

سفینہ برگ گل بنا لیگا قافلہ مور ناتواں کا ۔۔۔ ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

جنھوں نے میری زبان گویا کو محشرستان صد لکھا تھا ۔۔۔ مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوت مزار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو ۔۔۔ یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا ۔۔۔ یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اکدن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں ۔۔۔ تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے ۔۔۔ میں اس کا بندہ بنونگا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبش نظر بھی ۔۔۔ رہیگی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بیقرار ہوگا

میں ظلمت شب میں لیکے نکلونگا اپنے درماندہ کارواں کو ۔۔۔ شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا ۔۔۔ تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سر رہگذار بیٹھا ستمکش انتظار ہوگا

شب ماہ

بیساکھ کا مہینہ قریب اختتام کے پہونچگیا ہے گرمی اب غیر معمولی ترقی پر ہے باد سموم کے تند اور سخت جھونکے اس شدت کے ساتھ چلتے ہیں کہ راستہ چلنے والے اگر دو قدم آگے بڑھتے ہیں تو ایکقدم پیچھے کو بھی ضرور لوٹ جاتے ہیں اگر کوئی گل اندام نازک خرام کسی اشد ضرورت کی وجہ سے باہر نکلتا ہے تو ظالم لو اوسکے گورے گورے نازک رخسار ونپر طمانچے مار مار کر آگ بھبوکا کر دیتی ہے۔ کپڑوں کی حالت تو قابل بیاں نہیں۔ ٹوپی سر پر رکھنا محال ہوگئی ہے رومال اڑ کر کندھے پر ٹھیرتا ہی نہیں۔ اچکن کے دامن مور پنکھے کی طرح ہواؤں میں فرفر کرتے چلے جاتے ہیں۔ درختوں کا زمردی لباس لو کی شدت سے جل بھن کر خاکستر ہو چکا ہے۔ مگر قدرت کی نیرنگیاں دیکھیے کہ ادھر پیڑ پوری طرح پت جھڑ ہونے نہیں پاتے ادھر نئی نئی کونپلیں نکلنا شروع ہو گئیں اہاہا پلکھن کے درخت کو تو دیکھیے کہ کیا ہی خوشنما ننی ننی پتیاں سرخ و سبز نمودار ہوئی ہیں مگر ابھی تک لو کی تیزی کم نہیں ہوئی۔ اُف ہوا کے سنانے کے ساتھہی ساتھ وحشت ہی کچھ اسطرح سن سنا رہی ہے کہ ہر فرد بشر کے دل شگفتہ کے کنول کو پژمردہ کئے دیتی ہے بیچارے غریب اور مزدور پیشہ آدمی اپنی اپنی مزدوریوں پر لگے ہوئے ہیں معمار بلند اور اونچی اونچی پاڑونپر بیٹھے ہوئے بسولیاں پکار رہے ہیں مزدور اینٹیں اور مسالہ ٹوکریوں میں بھر بھر کر سر پر رکھے ہوئے ایک ہاتھ سے لمبی اور ہلتی ہوئی سیڑھیوں کے ڈنڈے پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے

نوکری تھامے ہوئے برابر پہنچا رہے ہیں۔ گرمی کی شدت سے پسینہ ٹپکتا جاتا ہے مگر وہ برابر اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں۔

اِن کی محنت سے بےخبر آرام و راحت کی زندگی بسر کرنیوالے امراو رؤسا اگرچہ اس تکلیف میں نہیں ہیں اور بہ نسبت ان غربا کے نہایت عیش و آرام کے ساتھ ٹھنڈے کمروں میں لیٹے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سے روشندان اور کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں جن میں خس کی ٹٹیاں لگائی گئی ہیں جن کی وجہ سے یہی باد سموم اونکے لئے نسیم سحری کی تاثیر پیدا کر رہی ہی فرشی پنکھا برابر اپنی رفتار کے ساتھ چرخ چوں چرخ چوں کی صدائیں لگاتا ہوا چل رہا ہے مگر پھر بھی شدت گرمی سے اکثر بیتاب ہو ہو کر "اُف گرمی اُف" پکار اوٹھتے ہیں۔ آفتاب عین مقیاس پر پہنچگیا ہے ٹھیک نصف النہار کا وقت ہے بازاروں کا ہنگامہ اور چہل پہل بالکل موقوف ہے کوئی اکا دُکا آدمی بڑی ضرورت کا مارا بیچارا اِدھر اُدھر نکلا تا پھرتا ہے۔ یا برف اور سوڈے والا اپنا ٹھیلا لئے ہوئے گلی کوچہ میں "سوڈا واٹر۔ سوڈا لیمونیڈ۔ یہ ٹھنڈا میٹھا برف۔ یہہ ملائی کا برف۔ یہہ ربڑی کا چھے دار برف" کی صدائیں لگاتا پھرتا ہے۔ موسم بہار نے باغوں میں اپنا رنگ جماتا شروع کر دیا ہے مگر دھوپ کی تپش سے سب بیل بوٹے پھول پھلواریاں کسی عاشق مہجور کے افسردہ دل کی طرح کمہلا گئے۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلنا شروع ہوا۔ امرا و رؤسا نازنیناں اپنے خواب ناز سے بیدار ہو گئے ہیں۔ اور بستر استراحت سے اوٹھ اوٹھ کر چلمنیں الٹ الٹ کر صحن مکان میں دھوپ کو دیکھ رہے ہیں اسوقت دھوپ دیواروں پر چڑھ گئی ہی کسی نے تو صرف منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن لئے اور اکثر صفائی پسند اور نفیس طبیعتوں

والے غسل کرکے لباس بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اب پانچ بج چکے ہیں بازاروں میں پھر وہی صبح کی طرح حسب معمول چہل پہل ہونے لگی مگر اسوقت کچھ عجیب لطف ہے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہو چکا ہے گرد وغبار کا نام نہیں اگرچہ لکھنؤ کے سارے ہی بازاروں میں خوب رونق ہے لیکن جو دلچسپی اور تفریح کے اسباب سبزی منڈی میں مجتمع ہیں وہ اسوقت کچھ عجیب لطف پیدا کر رہے ہیں۔ سبزی فروش اپنی دوکانوں پر قسم قسم کے میوہ جات اور ترکاریاں چُن چُن کر لگا رہے ہیں ایکطرف سیب رکھے ہوئے کیسی سیب زنخداں اور گلابی گلابی رخساروں کی یاد دلا رہے ہیں ہری ہری پتلی پتلی ککڑیاں کیا ہی نازک ہیں جنکو دیکھکر کسی کی نازک کلائیوں کی تصویر پیش نظر آجاتی ہے۔ ہر قسم کی ترکاریاں پھل پھلار رنگا رنگ کے میوے کچھ عجب بہار دکھلا رہے ہیں۔ ایک مقام پر مالی اور مالنیں گلاب کے پھول رابیل چنبیلی کے ہار چمپا موتیا جوہی کے پھول گجرے مولسری کے ہار لیئے بیٹھے ہیں آؤ چلیں ذرا قیصر باغ کی بھی سیر دیکھ آئیں۔ اہاہا وہ کمہلائے ہوئے درخت پھلواریاں سب سرسبز اور تر و تازہ ہوگئے ہیں چاروں طرف سے کیا ہی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ آنکھوں میں کھپ جانے والا سبزہ کس شان سے اپنا فرش بچھا رہا ہے کہ دیکھکر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے بلبلیں چہچہا رہی ہیں قمریاں سرو پر بیٹھی ہوئی آزادی کے گیت گا رہی ہیں کوئل کی آواز دلکو بیقرار کیئے دیتی ہے۔ آہ یہ سین دیکھکر ہم سے بھی خاموش نہ رہا گیا اور بے اختیار دلِ بیقرار سے یہ اشعار نکلے اور زبانی گراموفون میں آکر گونجنے لگے۔

غزل

ہمیں تو چین سے گذرا نہ اک لحظہ بھی بچپن میں — ہوا کمبخت یہ عشق بتاں پیدا لڑکپن میں

پھرا کرتے ہیں ہم چنتے ہوئے تنکے اسی فن میں — ترا سودا لیے پھرتا ہے ہمکو جنگل و بن میں

سدا آتا ہے خوش بزم حسیناں جہاں ہمکو — بہلتا ہے دل مضطر ہمیشہ سیر گلشن میں

حسینان جہاں غمزے کناں ہمسے کرتے ہوں — نظارے لُٹ رہے ہوں بیٹھے بیٹھے خود [illegible]

کوئی نازک بدن گلرو مرے پہلو میں بیٹھا ہو — گلے میں ہار پہنے ہو پڑے ہوں پھول دامن میں

مہکتے ہوں ادھر تو گل چہکتے ہوں ادھر بلبل — ٹہلتے ہوں پیا ہاتھ ڈالے اونکی گردن میں

پھر اک جلسہ ہو جسمیں ہر طرح کی ہوں بہم اشیا — کہ گلدستے رکھے ہوں سبز بچھا ہو فرش آنگن میں

سر پر بزم پہ پھر وہ پری سج بن کے آ بیٹھے — عجب انداز کا جادو بھرا ہو اوسکی چتون میں

گھٹائیں چھا رہی ہوں ننھی ننھی پڑتی ہوں بوندیاں — پڑے جھولے میں گاتے ہوں بہاریں ماہیا ساون میں

اگر اک دم کو ہو پنہاں مری آنکھوں سے وہ جاناں — کھلے دروازہ آنکھیں لگ رہی ہوں شوق دیدن میں

دل مضطر کی بیتابی مٹا کے جلد وہ آ کر — مسیحائی بھری ہو کوٹ کر اوس چشم پرفن میں

شراب وصل سے بیخود بنا دے ساقی گلرو — مزہ آئے وہ جس سے محو ہوں میں اوسکے جوبن میں

اثق دل کی تمنائیں جو نکلیں بھی تو کیا حاصل
نہ چھوڑیگا تجھے پیک اجل گلشن میں اور بن میں

دن ختم ہو چکا آفتاب کو غروب ہوئے کامل ایک گھنٹہ گذر چکا ستارے چمکنے لگے اور چاندکی آمدکی خوشخبری سنانے لگے اب چاندنی رات اپنی رونق دکھلا رہی ہے چندا شاہ اپنی معمولی آن بان شوکت و شان کے ساتھ جانب مشرق سے برآمد ہوئے آج چاندکی چودھویں ہے چاند اپنے پورے چہرے مہرے کے ساتھ نکلتا ہوا ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا کوئی نازنین مہ جبین اپنے رخ تاباں سے برقع اٹھائے ہوئے کسی عاشق مضطر

دیدار کی طرف دوڑی چلی آتی ہے اور واقعی عشاق جو اسوقت خوش ہوتے ہیں اوسکی یہی وجہ ہے کہ چاند میں چونکہ انسانی شکل دکھائی دیتی ہے پس وہ دیدار یار کا تصور باندھکر محو نظارہ مہتاب ہو جاتے ہیں۔ آہا ہا تمام روئے زمین پر چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے شجر جو دیوار درچاندنی کا لباس پہنے ہوئے چاندی کی طرح چمک رہے ہیں۔ دنکی گرمی کی ستائی ہوئی تکلیف اُٹھائی ہوئی مخلوق آرام سے پیر پھیلائے ہوئے ٹھنڈی چاندنی اور تاروں کی چھاؤں میں سو رہی ہے۔ واقعی اے چاندنی اللہ پاک نے تجھے ایک بڑی نعمت عظمیٰ بنایا ہے سبحان اللہ کیا نور ہے ہر شخص کا دل مسرور ہے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے مسجدوں کے صحن میں خشوع خضوع سے نمازیں پڑھ رہے ہیں کہیں خوش الحان قاری مصری عربی لہجوں میں قرآن پاک ایسے مؤثر اور دلکش آواز سے تلاوت کر رہے ہیں کہ سننے والوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل بیتاب ہوا جاتا ہے ایک طرف خدا ئے پاک کے دنیا دار شوقین مزاج بندے باغوں کوٹھیوں مکانوں کے صحنوں میں بیٹھے ہیں کرسیوں پر دوست احباب کا مجمع ہے اور اس وقت کی دلچسپیوں کا لطف اُٹھا رہے ہیں بیچ میں ایک تخت پر گھڑے اور نازک صراحیاں برف کے پانی اور شربت سے بھرے ہوئے رکھے ہیں صراحیوں کی گردنوں میں ہار پڑے ہوئے ہیں چاروں طرف گلدستے رکھے ہوئے ہیں ایکطرف میز پر ہارمونیم رکھے ہوئے کوئی خوش گلو اپنی سُریلی آواز اور اوسکے مست کر دینے والی دلکش آواز کو ملا ملا کر ایسے دلآویز لہجہ میں گا رہا ہے کہ سامعین کے دل پر ایک بیخودی کا عالم طاری ہے۔

چندا شاہ اُسی شان و شوکت کے ساتھ دربار کر رہے ہیں ستاروں کی

تمام فوج حاضر ہے مگر اپنے بادشاہ کے دبدبۂ رعب کی وجہ سے ایسے خایف ہیں گویا سب غایب ہیں۔ مگر نہیں برابر آہستہ آہستہ رعب استقلال کے ساتھ ملک مغرب کے فتح کرنے کو برابر بڑھی چلی جا رہی ہے۔

تقدیر کے یاور اور خوش نصیب عشاق اپنے اپنے معشوقان نازنین سے ہم آغوش ہیں اور عیش وصل میں مدہوش ہیں۔ ایک طرف بیچارے محرومانِ وصال پڑے ہوئے کبھی آہ کرتے ہیں کبھی بالکل خاموش ہیں کوئی حسرت بھری آواز میں اس غزل کو پڑھ رہا ہے اور خیال یار سے باتیں کر رہا ہے۔

غزل

لطف جب ہے کہ رلے دوست تو ہو چاندنی رات
محفل رنگ ہو مے نوشی ہو اور چاندنی رات

باغ میں لالہ و گل مہک رہے ہوں ہر سو
بھینی خوشبو بھی وہاں آتی ہو اور چاندنی رات

ساقی سیم تن اک جام پلا دے ہمکو
باہر و سامنے اک گاتی ہو اور چاندنی رات

ہو رقیبوں کا نہ کھٹکا نہ کسی شے کا غم
نازنیں پہلو میں اک سوتی ہو اور چاندنی رات

عیش ہو وصل ہو آرام ہو راحت ہو اُفق
دل کی حسرت مری بر آتی ہو اور چاندنی رات

آہ ایک دن وہ تھا کہ چاند رات کو چاند نہایت باریک کسی کے ہلال ابرو کی یاد دلاتا ہوا نکلا بڑھتے بڑھتے چودھویں رات تک بڑھا اور کسی کے روح تاباں کا تمام رات جلوہ دکھایا۔ پندرھویں سے گھٹنے لگا اور گھٹتے گھٹتے وہی ہلال رہ گیا۔ اور کوئی ارمان بھی اور دل حسرت کے ساتھ۔ وہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات" کہکر افسردہ ہوگیا۔ آہ اللہ بس باقی ہوس۔ فقط

سید حبیب احمد افق امروہوی

عرفجہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

عرفجہ نے اِس شاطرانہ کامیابی اور مساعدت احوال کی اطلاع اپنے ایک ایسے معزز و موقر رازدار (عمرو ابن طارق امیر (صوبہ دار) مدینہ کو کی. جسکے وعدے اوسکی طبع دُنیا و حرص جاہ کی کفالت سے ضامن ہو رہے تھے۔

عمرو ابن طارق کا نام چونکہ ناظرین کے لئے بالکل نیا نام ہے۔ پس واقفیت کے لحاظ سے نامناسب نہوگا اگر ہم اِس موقعہ پر عمرو ابن طارق اور عرفجہ کے تعلقات اور اونکے موجبات پر روشنی ڈالکر قصہ کی طرف رجوع کریں۔

اصل میں ہمارے قصہ کی جان نازک اندام سمیہ پر جو جبر و سختی، اور جس قسم کا سلوک ناروا ہو رہا ہے۔ وہ اِسی عمرو ابن طارق کے حُب دولت وجاہ سے مغلوب. کیا آفرین طبیعت کی اختراع خاص ہے۔ اوسے مال و متاع اور دُنیاوی عزت واقتدار کی چاہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اوسکا دِرِ مقصود جہاں سے حاصل ہوسکتا ہے وہ حجاج ابن یوسف کی سرکار عظمت مدار ہے جس کی شاہد پرست و بادہ گسار طبع رنگین پر فتح حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی کہ کسی معشوقۂ شیریں اَدا سے اوسکا خانۂ شوق منور و معمور کرایا جائے۔ اسی بُنیاد پر اوس نے کنایۃً عرفجہ کا استمزاج کیا کہ سمیہ کیلئے اگر کسی بڑی جگہ کی نسبت کا پیغام اوسکے سامنے پیش کیا جائے تو اوسکے

شرائط کچھ اہم تو نہوں گے۔ اور دوہی فقروں میں اوس نے اندازہ کرلیا کہ طمعِ زر کے سوا اوسکے مخاطب میں کسی قسم کا حوصلہ نہیں۔ اِس کے بعد صاف الفاظ میں اوس نے ظاہر کیا کہ اگر وہ خواہش رکھتا ہے تو حجاج ابن یوسف کے مخدرات عالیہ میں داخل ہونے کی عزت وسیمیہ کو دلا سکتا ہے۔

عرفجہ اِس منتہائے عروج پر پہونچانے والی مگر اپنے حاشیۂ خیال میں بہی نہ آنے والی تدبیر کو سنکر ششدر و حیران رہ گیا۔ اور مسرت خیز استعجاب کا اظہار کیا، جسکی اس تنگیٔ ظرف اور پستیٔ حوصلہ کو دیکھکر عمرو ابن طارق اپنی جگہ پر اوسکی طرف سے بالکل مطمئن ہوگیا۔ اِس لئے اوس نے پیشگاہِ حجاج میں بذریعہ ایک معروضہ کے سمیہ کے حُسنِ عالم افروز کی اطلاع کی۔ جس کے جواب میں دربار سے ایک ضروری فرمان آیا۔ جسمیں اظہار خوشنودی کے بعد اشتیاق و بیقراری کا مضمون تہا۔ اور لکہا تہا کہ جلد سے جلد اوس وحشی اور بڑی آنکہ والی ہرنی کو یہاں پہونچانے کی تدبیر کی جائے۔ تاکہ حسب قاعدہ شرع رسمِ عقد عمل میں آئے۔ اور تمہاری اعلےٰ ترین کارگذاری کا ثبوت پہونچے۔

بہرحال اِس طریقہ سے جب عرفجہ اور حجاج میں اوس کی آمادگی کی مریخ پہونچ گئی تو استحکام کی نسبت اور تمہید ایفاء وعدہ کے طور پر عرفجہ سے ایک رقم مشخصہ کا اظہار کر کے اوسکا نصف عمرو نے عرفجہ کے حوالہ کر دیا۔ نصف بعد عقد دینے کا وعدہ کیا۔ اور عرفجہ سے اوسکی روانگی میں تعجیل کی تاکید کی۔ مگر عرفجہ کو اسکے بعد جو ناگوار موانع اس کار خیر میں تعجیل کے پیش آئے۔ اوسمیں سبسے زیادہ اہم اور اندیشہ ناک خود سمیہ سے اوسکی خوش بختی اور طالع وری کا ذکر آنے پر اوسکا خلاف امید اختلاف بلکہ انکار بعد ازاں مدینہ میں حسن کا اتفاقی ورود اور اس سے سمیہ کے صبر و سکون میں یکایک اضطراب اور اوسکے دبے ہوئے جذبات عشق و شوق

۲۸ مئی ۱۹۱۱ء

جلد ۹ نمبر ۳

تمدّن

لکھنؤ

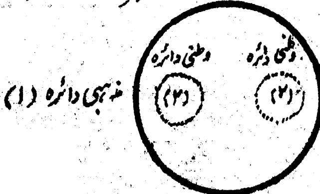
قومیت

افراد کے مجموعہ کا نام گروہ اور بہت سے گروہوں کے مجموعہ کا نام قوم ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا صرف چند گروہوں کے مجموعے سے قوم بن جاتی ہے اور اس میں قومیت کی صحیح روح پیدا ہو جاتی ہے اس کا جواب پورے طور پر نفی میں نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اگر ایک طرف چند گروہوں کا متحد ہو جانا بھی قوم کے مفہوم کا ایک حصہ ہے تو دوسری طرف ان گروہوں کا متحد المقاصد یا کم از کم متحد المقصد ہونا بھی ضروری ہے اگر سب گروہ مقاصد میں متحد ہیں تو یقیناً وہ بہت سے گروہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایک گروہ ہے جو تقسیم شدہ ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ کسی ملک کے تمام لوگ تمام مقاصد میں متحد ہوں اس لیے یہ ماننا پڑے گا بلکہ یہ اصول تسلیم کرنا پڑیگا کہ جب بہت سے گروہ جو مختلف مقاصد میں ایک دوسرے کے مخالف ہوں چند مقاصد کے لیے متحد ہو جائیں تو وہ ایک قوم بن سکتے ہیں جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ قوم کی [illegible] یہ ہے" تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قوم جو گروہوں کے اس مجموعہ کا نام ہے [illegible]

اپنے بعض مقاصد میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور ہر گروہ بہت سے افراد پر مشتمل ہے جن کے خیالات ایک دوسرے سے بالکل متحد نہیں ہیں اس معاملہ میں متحد الرائے ہے اس سب کے معنے یہ ہوے کہ قوم افراد کے اُس مجموعہ کا نام ہے جس کا بعض حالات میں انفرادی حیثیت سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے مگر کسی خاص امر میں تمام افراد کی رائے متحد ہے یہ ہی قوم کا صحیح مفہوم ہے اور اس قوم یا قومیت کے اصول پر مہذب دنیا نے ترقی کی ہے اسلام نے اجماع اُمت کے معاملہ کو غالباً مذہبی حیثیت سے تمام دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی تھی۔ آج مہذب ممالک میں انفرادی حیثیت سے کسی بڑے سے بڑے شخص کی رائے کو ہرگز وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو قوم کی رائے کو دی جاتی ہے یا ایک انجمن کی رائے کو۔ اب ہندوستان میں بھی کچھ عرصہ سے قومیت کی روح پھونکی جا رہی ہے بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے ہندوستان دنیا کے اُن ممالک میں سے ہے جہاں بیشمار فرقے ہیں جن کے رسم و رواج طرز معاشرت اور بہت سی چیزیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور اس لیے یہاں قومیت کے شیرازہ کا بننا زیادہ دقت طلب ہے ہندوستان سے قطع نظر کر کے اصولاً بحث کی جائے اور غور کیا جائے کہ کسی ایسے ملک میں جہاں بہت سے جداگانہ رسم و رواج جداگانہ طبائع کے لوگ موجود ہوں وہاں قومیت کا شیرازہ باندھنے کے لیے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک ملک میں فرض کر لیجیے کہ تین قسم کے لوگ آباد ہیں جن میں سب سے بڑا فرق مذہبی فرق ہے۔ ایک دوسرے کے رسم و رواج بالکل مختلف ہیں طبائع اور طریق معاشرت بھی اسی طرح علیحدہ علیحدہ ہیں تو کیا کوئی تدبیر ایسی ہو سکتی ہے کہ ان مختلف گروہوں کو متحد کیا جائے اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جن دونوں مذاہب کے لوگ ہمارے زیر بحث ملک میں رہتے ہیں ان دونوں میں علیحدہ علیحدہ طریقے پر بھی چند گروہ ہیں فرض کیجیے کہ ایک مذہب کے ماننے والے طبقہ میں ۲-۳ گروہ ہیں اور اسی طرح دوسرے مذہب کے

لوگوں میں دو تین فرقے یا گروہ ہیں اس تفصیل کے معلوم ہونے کے بعد اس شخص کی مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے جو اس ملک میں وطنیت کی بنیاد پر ایک قومیت قائم کرنا چاہتا ہے۔ ایک مذہب کو لیجیے اسکے تین فرقہ ہیں قومیت کے لیے پہلا کام جو ہمیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ان تینوں گروہوں کو متحد کیا جائے۔ جو بعض اوقات اپنے ہی مذہب کے دوسرے فرقہ سے نفرت رکھتے ہیں بعض اوقات اپنے مخصوص عقائد کی بنا پر مخالفت کا مادہ رکھتے اور بعض اوقات ان کی مخالفت بھی اپنی بہبودی کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں دنیا ایک دوڑ کا میدان ہے۔ یہاں ہر شخص کو انفرادی حیثیت سے دوسرے سے مقابلہ کرنا ہے اور مقابلتاً ترقی کرنی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بہبودی کے لیے جدوجہد نہیں کرتا تو وہ غلطی کرتا ہے۔ اسی طرح انفرادی حیثیت سے آگے بڑھنے کے بعد ایک کنبہ ایک خاندان کو دوسرے کنبہ اور خاندان کے مقابلہ میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی قاعدہ کے مطابق ایک گروہ یا ایک طبقہ کو اپنے گروہ کے مفاد اپنے فرقہ کی محافظت کے لیے بعض اوقات دوسرے فرقے کی مخالفت کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ایک مذہب کے لوگوں کو دوسرے مذہب کے لوگوں سے یہ تو وہ صورتیں ہیں جن کے لیے ایک دوسرے کو آپس میں مقابلہ کرنا چاہیے اور ہر زندہ گروہ یا طبقہ اور مذہب کے لوگوں میں اس جذبہ کا ہونا ضروری ہے۔ مگر دوسری طرف ان سب لوگوں کو بعض معاملات میں متحد ہونا پڑتا ہے فرض کیجیے ایک گروہ کے لوگوں پر دوسرے گروہ کے لوگوں نے زیادتی کی تو جس وقت تک اس گروہ کے لوگ متفق نہ ہوں گے اس وقت تک وہ دوسرے گروہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مقابلہ کرنے اور متحد ہونے کی ضرورت اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اگر ایک گروہ یا ایک طبقہ دوسرے گروہ کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دے تو اس سے اس گروہ کو بحیثیت مجموعی ایک نقصان پہنچے گا اور اس نقصان سے ہر شخص کو جو اس طبقہ میں ہوگا انفرادی حیثیت سے نقصان پہنچے گا اس انفرادی نقصان سے بچنے کی غرض سے ہر فرد مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے

گروہ پیش کے طبقات سے اتحاد کرے اور یہی قومیت کا اصول ہے دنیا کی ترقی کا اصول یہی ہے اور دنیا نے اسی بنا پر ترقی کی ہے جس طرح ہم نے ایک گروہ کے متحد ہونے کی ضروریات کا ذکر کیا اسی طرح ہمارے مذکورہ مذہب نمبر ایک کے تمام گروہ بعض معاملات میں ضرورتاً متحد ہونے پر مجبور ہوتے ہیں مذہب نمبر ۲ کے اتحاد کو بھی اسی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ اور اس کے بعد کسی ملک کی ترقی کے لیے جس میں ایسے دو توں مذہب موجود ہوں یہ بات بہت ضروری ہے کہ دونوں متحد ہوں۔ ناظرین مجھے معاف کریں کہ میں نے مثال میں مذہب نمبر ایک اور مذہب نمبر دو کو لیا ہے اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایشیا میں اس وقت تک مذہب کی بندش یا مذہب کا حلقۂ اخوت زیادہ وسیع خیال کیا جاتا ہے یہ بات ممالک متمدّنہ میں اب باقی نہیں رہی جب سے کہ مادیت نے زور پکڑا۔ ان ممالک میں اب قومیت کی بنیاد وطنیت پر رکھی جاتی ہے اور یہ وطن کی بندش سب سے بڑی بندش خیال کی جاتی ہے گو یہ خیال پرانے خیالات یا ان خیالات کے بالکل خلاف ہے جو مذہب کے ماتحت ہوں مثلاً دنیا کے چند مشہور مذاہب کو لیجیے۔ اسلام عیسائیت۔ موسائیت۔ تو یہ معلوم ہوگا کہ ان مذاہب نے مختلف دائرے رکھے تھے مثلاً مذہب کے ماتحت سب سے بڑا دائرہ اخوت (یعنی برادرانہ میل جول اور بھائی چارہ) مذہبی تھا اس دائرہ کے اندر وطنیت۔ رنگ وغیرہ کی تمیز نہیں تھی اگر ایک عیسائی ہندوستان میں رہتا ہے تو مذہبی حیثیت سے یقیناً اُس عیسائی کا بھائی خیال کیا جاتا تھا جو یورپ یا افریقہ میں ہو اور یہ مذہب کا ایک بڑا دائرہ تھا اسکے ماتحت چھوٹے چھوٹے دائرہ آتے تھے جو وطنیت۔ رنگ وغیرہ کے ماتحت رہتے تھے۔



دائرہ نمبر اول مذہب کا بیرونی دائرہ تھا جو تمام دنیا کے اُن لوگوں کو اپنے میں شامل کر لیتا تھا جو ایک مذہب کے ہوں اس کے اندر دوسرے دائرے تھے جو مختلف ممالک کے وطن کی بنیاد پر ہیں۔ مثلاً ایک ہندوستانی عیسائی ایک امریکن عیسائی اور ایک یورپین عیسائی وغیرہ اس میں جو بات سب میں مشترک تھی وہ عیسائیت تھی اور یہی مذہبی قومیت کی بنیاد تھی اب کچھ عرصہ سے مذہبیت کا دائرہ خصوصاً ممالک متمدنہ میں کچھ چھوٹا سا ہو گیا ہے۔ اور سب سے بڑی اہمیت ان چھوٹے چھوٹے دائروں کو دی جانے لگی ہے جو مذہب کے بڑے دائرے کے اندر آتے ہیں یہ دائرے پہلے بھی بالکل نظر انداز نہیں کیے گئے تھے چنانچہ اگر ایک عیسائی کے کچھ حقوق اپنے اُن بھائیوں کے لیے تھے جو اس ملک سے باہر رہتے ہیں تو اُسکے کچھ حقوق اُن لوگوں کے لیے بھی تھے جو اسی ملک میں رہتے ہیں مگر اُسکے ہم مذہب نہیں ہیں۔ دنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی اگر ایک طرف اپنے غیر وطن پیروان اسلام سے اپنا تعلق رکھنے کی ہدایت کی تھی تو دوسری طرف یہ بھی بتایا تھا کہ تم کسی غیر مذہب والے کی دل آزاری نہ کرو اگر اسلام نے ایک طرف ایک مسلمان کا تعلق اپنے مرکز مذہبی (کعبہ) سے قائم رکھنے کی تاکید کی ہے تو دوسری طرف یہ بھی بتایا ہے کہ تم کسی دوسرے مذہب والوں کے بتوں کو بُرا نہ کہو (لاتسبوا اصنامهم) کیوں؟ اسکے جواب میں اگر ایک صاحب یہ فرما سکتے ہیں کہ اس وجہ سے کہ وہ ہمارے خدا کو بُرا نہ کہیں تو دوسرے صاحب یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ محض اس وجہ سے کہ اُن کی دل آزاری نہ ہو۔ یہ وہ رواداری ہے جس کی تعلیم مذہب نے دی تھی جسکے ماتحت بیسیوں ایسی باتیں کی جاتی ہیں جو ہرگز نہ ہونی چاہئیں۔ جن لوگوں نے مذہب کے بیرونی دائرہ کو چھوڑ دیا ہے اُنھوں نے صرف اندرونی دائرہ کے اندر کے اُن حقوق کو اختیار کر لیا ہے جو اس صورت میں بھی ان پر عاید ہوتے تھے جس صورت میں کہ وہ بیرونی دائرہ کا بھی خیال رکھتے۔ اس

سوال کا جواب دینا بہت مشکل نظر آتا ہے کہ بیرونی دائرہ کی پابندی زیادہ ضروری ہے یا اندرونی دائرہ کی ہم اس کا جواب صرف یہ دینا چاہتے ہیں کہ دونوں دائروں کا خیال رکھنا بسا ضروری ہے اور لازم و ملزوم ہے اگر ایک شخص اندرونی یعنی چھوٹے دائرہ کے متعلق جو قیود اس پر عائد ہیں ان کی پابندی نہیں کرسکتا تو وہ ہرگز ان قیود کی پوری پابندی نہیں کرسکتا جو بیرونی دائرہ کے متعلق فرض کئے گئے ہیں اس لیے اس کو سب سے پہلے اندرونی دائرہ سے شروع کرنا چاہیے اب یہاں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے وسائل ایسے اختیار کیے جائیں جن سے اتحاد کی ضرورت معلوم ہو جانے کے بعد دو غیر مذہب کے گروہوں کے ہم وطن لوگوں کو متحد ہونے کا موقع ملے جس وقت وہ ایک ملک کے رہنے والے ہوں گے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کے گرد و پیش کے حالات ایک ہوں گے ان کے ذرائع ایک ہوں گے اور اسی طرح سوائے مذہب کے بہت سی باتیں۔ جس قدر زیادہ دونوں کے طریق معاشرت طرز زندگی اور دیگر باتوں میں یکسانیت پیدا ہوتی جائے گی۔ اسی قدر وہ متحد الخیال ہوتے جائیں گے اور اسی طرح جس قدر ضروریات متحد ہوتی جائیں گی اسی قدر وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے جائیں گے۔

ضرورت ایجاد کی ماں مانی جاتی ہے اگر ضروریات پیدا ہو گئیں تو جو ایجادات ان ضروریات کے لیے لازمی ہیں وہ آپ سے آپ پیدا ہوں گے اور پھر اتحاد سے یقیناً وہ مقاصد حاصل ہوتے جائیں گے جو تمام دنیا نے حاصل کیے ہیں۔

ایڈیٹر

گذارش

"تمدّن" بلا طلب جن حضرات کی خدمت میں نمونتاً یا کسی معزز دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم وہ اپنے ارادۂ خریداری سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائے گی اور دوسرے ماہ میں ان کا نام درج رجسٹر کرکے تیسرے ماہ کا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔ جس کا وصول کرنا ان کا قومی اور اخلاقی فرض ہوگا۔ مینیجر

"بانگ مسافر"

میں مسافر ہوں اُتر جاؤں گا پار اک دم میں　　تجھکو اے موج مبارک رہے ساحل تیرا

فضائے عالم میں رات دن ہزاروں پھول کھلے، اپنی آب و رنگ کا عالم دکھا کر ہزاروں بلبلوں کو اُنھوں نے محو تماشا کر دیا، اور پہر دو پہر میں پنکھڑیوں کی خوشنما چادر کھینچ تان کر سو رہے تھوڑی ہی دیر میں تند ہوا کا جھونکا غافل پا کر ایک ایک پنکھڑی کو اڑا لے گیا اور کوہ و بیابان کی سیر دکھا کر آغوش فنا میں اُن کو ڈال دیا۔

مگر افسوس ہزار افسوس، ابھی اندھیرا ہی تھا، چنبیلی کی کلیوں میں شبنم گدگداہٹ پیدا کر رہی تھی، سرمستیِ ناز کو خواب گراں سے جگانے پر تلی تھی، امکان نمو نے کے خیال سے نسیم سحری پنکھا جھل رہی تھی، کہ اتنے میں باغبان صبح دم ہی آ پہنچا ہائے کس لیے؟ مشتاقان جمال کا سلام پہنچانے؟ ورود مسعود کی مبارکباد دینے؟ اُف! کمبخت باغبان کی طبیعت میں رحم و شفقت ہی کہاں، اُسکے سینے میں دل ہی کہاں؟ وہ گھڑی آنکھ کھول کر بہار کی سیر دیکھنے بھی نہ دی جھٹ سے ہاتھ بڑھا کر پھولوں کے ساتھ ان مسکراتی ہوئی، کلیوں کو بھی شاخِ گل سے توڑ لیا، اور چپکے سے سبدِ گل میں ڈالدیا اور بازار جا کر کچھ پھول تو نازنینوں کے گلے کا ہار بنے حسینوں سے بغلگیر ہوئے کسی نے سہرہ بن کر سر پر جگہ پائی، اور کسی نے عطر بن کر روح و دماغ کو معطر کیا، مگر یہ ناشگفتہ کلی کسی کام کی ہی نہ رہی مسکرانے مسکراتے بسورنے لگی کمھلائی، مرجھائی، اور آخر سوکھ کر یاس و حرماں کا نمونہ بنگئی ؎

پھول تو دو دن بہار زندگی دکھلا گئے　　حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سبزہ، لاجوردی لباس پہنے موتیوں کا ہار زیب گلو کیے ہوئے انگڑائی لے نیند سے بیدار ہوا اور منتظر تھا کہ کسی سرو رواں کا ادھر گذر ہو اور اُسکی قیامت خیز چال پر نثار ہونے

اور قدم بوسی کرنے کا شرف حاصل ہو۔

اسی بیم و رجا کی حالت میں سبزہ نے بہت سی راتیں گذاریں اور بہت سی صبحیں شام غربت میں منتقل ہوئیں سرو آزاد باغ کے نگہبانوں کی طرح چاروں طرف کھڑے ہوئے صبوحی کش رندوں کی طرح جھوم رہے ہیں، ان کی رستی قامت و بلندی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نونہالان چمن کے پیغام ایک طرف سے دوسری طرف کو پہنچا رہے ہیں، کبھی قمری اس عالیشان ممبر پر سے سبحانہ کا خطبہ سُناتی ہے، کبھی پپیہا پی کہاں ؟ کی صدا لگاتا ہے، بہت سے بہار اور خزاں کے موسم آئے اور اپنے اپنے وقت پر باغ کے جوبن کو سنوارتے اور بگاڑتے رہے، مگر سرو آخر کب تک زمانہ کی گرمی و سردی سے عبرت حاصل کرتا، ایک دن اسکی بھی باری آئی، باد سموم کا ایک جھونکا چلا، بلندی سے پستی میں لایا، اسکی چوٹی جو کسی وقت سر بفلک تھی، آج زمیں دوز ہو گئی ؎

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا　　بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہر چمن میں بہت سے بلبلے اُٹھے، اور قبۂ نور کی آب و تاب آنا فاناً دیکھا نظر سے غائب ہو دریا کی موجوں میں فنا ہو گئے۔

طفلِ شیرخوار نے ابھی ماں کی گود سے جدا ہو کر چلنا پھرنا شروع کیا، بڑا ہوا مکتب گیا، تعلیم پائی، شادی بیاہ کیا، دنیا کے رنج و غم سے، عیش و عشرت کے لطف اُٹھائے، تکلیف پہنچی تو ایسی کہ جان بھی دو بھر ہو گئی، خوشی آئی تو ایسی کہ عمر نوح کی آرزو پیدا کر دی اطراف عالم میں گھوما، سر سبز مرغزار دیکھے، ڈوبتے ہوئے اُبھرتے دیکھے، بنتے ہوئے بگڑتے دیکھے، عالمِ ناپائدار کو کبھی تو عاشق کی نگاہ سے دیکھا، اور کبھی عبرت کی، پیری آئی دنیا کی سردی و گرمی نے بال سفید کر دیے، تیر سا قد کمان ہو گیا، عصا ہاتھ میں آ گیا، لنگڑا لولا مسافر، زادِ آخرت سر پر رکھکر غائب ہو گیا۔

قاضی محمد غوث فضا

میرا چراغ

اس مضمون کو "تمدن" میں جگہ دینے سے خاکسار ایڈیٹر کو خاص خوشی ہے کیونکہ جو حضرت "خاموش" کے پردے میں اوراق "تمدن" پر خامہ فرسائی فرما رہے ہیں وہ ہندوستان کی اخباری دنیا کے ایک ممتاز رکن ہیں اور خاکسار ایڈیٹر "تمدن" کو جرنلزم کی زندگی میں سب سے پہلے آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے ممکن ہے کہ جناب خاموش کو اپنے اس نام کی مناسبت سے اتنا تعارف بھی گراں گذرے مگر ہم اسکا ظاہر کرنا اپنا فرض خیال کرتے ہیں خاموش صاحب کی خاموشی سے بہت کم توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ "تمدن" کو اپنے مضامین سے زینت دیتے رہیں گے کیونکہ آپ ملک و قوم کی خدمت میں منہمک ہیں اور ہماری یہ خواہش نہیں ہے کہ وہ اپنے موجودہ مفید کام کو بسلسلۂ علالت چھوڑ کر چھ مہینے تک اچھی طرح اور کچھ آرام کریں اور اسکے بعد "تمدن" کے لیے ایک مضمون تحریر فرمائیں۔ آخری چند فقرے اس مضمون کے وجود کے متعلق ہیں، امید ہے کہ جناب خاموش صاحب ہماری اس جسارت کو معاف کرنے کے علاوہ "تمدن" پر نظر عنایت رکھیں گے۔

ایڈیٹر

طوفانی سمندروں میں، جب ساحل نظر سے دور اور دنیا والوں کی بستیاں آنکھوں سے بعید ہو گئی ہیں، جب مسافر کی چھوٹی سی کشتی موجوں کے طمانچے کھاتی ہوتی ہے، جب زندگی اور موت کے درمیان ایک نہایت باریک خط فاصل باقی رہ جاتا ہے، اس تاریک شب میں اور اس طوفانی سمندر میں جس طرف جاتا ہوں آسمان کے ننھے ستارے میرے ساتھ ہیں! مجھے معلوم نہیں کہ مشرق کدھر ہے اور مغرب کدھر! مجھے معلوم نہیں کہ سمندر کی لاانتہا وسعت

کہاں ختم ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کل صبح کو سورج کی روشنی دیکھ سکوں گا یا نہیں۔ موت کے خوف نے میرے دل سے اُن عزیزوں کی یاد بھی بھلا دی ہے جو ساحل کے کنارے عافیت میں بیٹھے ہوئے میری یاد میں آنسو بہا رہے ہوں گے۔ اس وقت میری مونس و رفیق ستاروں کی جھلک ہوگی۔ ان دریچوں سے میرے پاس ایک پیام رحمت و شفقت ایک بوند اُمید آ رہی ہے۔ میں جہاں جاؤں سمندر کی نا آشنا موجیں مجھے جس طرف لے جائیں آسمان کی یہ چمکیلی مخلوق میرے ساتھ ہے۔

چاند اپنے وقت پر نکلتا ہے اور کبھی دیر نہیں کرتا۔ میں اپنی چھوٹی سی کشتی میں پڑا ہوا اُس کا طلوع و غروب دیکھا کرتا ہوں۔ جب وہ طلوع ہوتا ہے۔ تو میں پہچان لیتا ہوں کہ یہ صرف میرے ہی لیے اپنی خنک شعاعیں لے کر آیا ہے۔ اور جب وہ غروب ہوتا ہے تو میں جانتا ہوں کہ وہ کل پھر آئے گا۔!

پانی کی وسعت کی آخری سرحد سے' یا یوں کہوں کہ میری حد نظر کے آخری نقطہ سے سورج ہر صبح کو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا پانی کے اندر سے نکل رہا ہے (شاید وہ شب گذارنے کے لیے سمندر کی تہ میں رہا کرتا ہوگا!) وہ اپنے وقت پہ آتا ہے اور میرے شبنم سے بھیگے ہوئے جسم کو اپنی تر مزی شعاعوں سے خشک کرتا ہے۔ میں گھبرا گھبرا کر (کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فوراً ہی غروب ہو جائے) چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا ہوں، شاید کہ اسکی روشنی میں ساحلِ امید نظر آئے گو میں ساحل کا پتہ نہیں پاتا لیکن میرا رفیق سفر اپنے وقت سے پہلے رخصت نہیں ہوتا۔ اور جب رخصت ہوتا ہے تو میں جانتا ہوں کہ کل صبح پھر آئے گا۔

دنیا کے کسی حصہ میں خشکی ہو یا تری، انسانوں کی سربفلک بستیاں ہوں یا ویرانے۔ دریا کا کنارہ ہو یا پہاڑوں کی چوٹی، موسم بہار ہو یا خزاں، چاند سورج اور ستارے اپنے وقت پہ آس دنیا کے ہر مسافر کی رفاقت کر جاتے ہیں لیکن

صبح ہوتے ہی آسمان کی چمکیلی مخلوق نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ چاند اور ستارے رخصت ہو جاتے ہیں اور رات کا درخشاں آسمان صبح کو ایک نیلی چادر سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح جب شام ہوتی ہے، تو سورج بھی اپنی تمام شان و شوکت۔ جاہ و جلال کے ساتھ مغرب کی تاریکی میں چلا جاتا ہے۔ اور اپنے وقت سے ایک لمحہ بھی زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔

تو کیا میں اسقدر مجبور و معذور ہوں کہ خواہ کتنا ہی چاہوں کیسی ہی کوشش کروں نہ چاند کو چند منٹ ٹھیرا سکتا ہوں نہ تاروں کو گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے روک سکتا ہوں۔ نہ مجھے سورج کی روشنی مقررہ امید سے زیادہ مل سکتی ہے۔

میں تو اپنے گھر کا حقیر سا چراغ جلاتا ہوں تو پھر اس وقت تک اس کو روشن رکھ سکتا ہوں جب تک کہ میرا جی چاہے۔ اگر چاہوں تو سر شام گل کر دوں اور اگر چاہوں تو دوپہر تک روشن رکھوں۔ کیا میرا چراغ اس چاند سے بہتر نہیں جو نہ میری خواہشوں کا پابند ہے نہ میری التجاؤں کو سن سکتا ہے؟

میرے اس مٹی کے دیے سے بہتر ایک اور چراغ بھی ہے جو میرے ماتم خانۂ دل میں روشن رہتا ہے۔ گھر کا چراغ تیل کا حاجت مند ہے اگر تیل نہ ہو تو میں کسی نہج اُسکو روشن نہ رکھ سکوں لیکن اندھیری کوٹھری کا یہ چراغ جو میرے دل میں ایک ستارۂ صبح کی طرح اپنی خنک شعاعوں سے میری روح کو روشن رکھتا ہے اور کبھی گل نہیں ہوتا اُس کا نور دنیا کے طوفان میں بھی اپنی پوری طاقت سے ضیا باش رہتا ہے اور اُسکی شعاعیں زندگی کی سخت سے سخت آندھیوں میں بھی اس پرانی پسلیوں کے قفس کو روشن رکھتی ہیں۔ جب شام ہوتی ہے تو میں ماہتاب کا انتظار نہیں کرتا کیونکہ میرا ماہتاب پہلے ہی سے روشن ہوتا ہے۔ جب رات ہوتی ہے تو میں ستاروں کو نہیں دیکھتا اس لیے کہ میرا تمام وجود روحانی اُس ایک ستارے سے بقعۂ نور بنا ہوتا ہے۔ جب صبح ہوتی ہے تو میں طلوع آفتاب کی

پروا نہیں کرتا اس لیے کہ میرا ہمہ وقت روشن رہنے والا چراغ دنیا والوں کے سورج سے بدرجہا بہتر ہے! اس نور کا مرکز میرے دل کے کسی ایسے گوشے میں ہے جہاں جرّاحوں کا تیز سے تیز نشتر نہیں پہنچ سکتا' جہاں فلسفی کی گہری سے گہری نظر بھی اسکو نہیں پا سکتی؛ جہاں ماہر سائنس کی نکتہ رس عقل کے پر جلتے ہیں! جو کوئی اس سیہ خانہ کے اندر جا سکے وہ میرے چراغ کو دیکھ لے..... شاید کوئی بھی نہ جا سکے میں چاہتا ہوں (بعض اوقات یہ خواہش مجھے بے اختیار کر دیتی ہے) کہ سارا عالم میرے اس چراغ کو دیکھ سکے لیکن میں خود اس حجرہ کا دروازہ بند پاتا ہوں اور مجھے یقین نہیں لیکن شبہ ہے کہ شاید اب وہاں باہر کے سیاحوں کے لیے قدم رکھنے کی گنجائش باقی نہیں!!

"خاموش"

غزل

غم سے جو عمر بھر رہا نہ ہوا — چارہ گر سوچ اُس پہ کیا نہ ہوا
دل نے کن قوتوں سے کام لیا — کہ ترے تیر سے جدا نہ ہوا
اک نظر اور دیکھیے دل پر — زخم کیا وہ جو لا دوا نہ ہوا
معجزہ ہے مری پرستش کا — آپ سا کوئی دوسرا نہ ہوا
اُس نے خود پردۂ حجاب اُٹھا — پھر بھی دل صورت آشنا نہ ہوا
میکدے ہی میں چھوڑ آؤں گا — دل اگر قائلِ خدا نہ ہوا
اُن کے زیرِ قدم ہزار افسوس — میری تقدیر کا لکھا نہ ہوا
ہر رگِ قلب ہو گئی نشتر — پھر بھی مجھ سے ترا گلا نہ ہوا
جب یہی شان ہے تغافل کی — کس سے کہیے کہ مدعا نہ ہوا
جان لے لی اسی تمنا نے — تو کبھی خنجر آزما نہ ہوا

دستِ اشہر قدح طلب ہے ہنوز
شاید اس دور میں بلا نہ ہوا

اشہر لکھنوی

دلؔ

آہ کیا چیز ہے دل کوئی بتاتا مجھکو — اس کی تصویر کوئی لاکے دکھاتا مجھکو
قصۂ رنج و غم و درد سناتا مجھکو — کیوں شب و روز مرا دل ہے ستاتا مجھکو

دل کی کیوں قدر حسینانِ جہاں کرتے ہیں
دل کو کیوں تھام کے عشاق فغاں کرتے ہیں

پارۂ گوشت میں کیا بات ہے اللہ اللہ — معجزہ ہے کہ کرامات ہے اللہ اللہ
یہی دل قبلۂ حاجات ہے اللہ اللہ — یہی دل موردِ آفات ہے اللہ اللہ

شکل اس دل کی جو ظاہر میں صنوبر کی ہے
اس میں تصویر نہاں قامتِ دلبر کی ہے

جو کہ اللہ کو مرغوب ہے وہ دل ہے یہی — جو کہ معشوق کو مطلوب ہے وہ دل ہے یہی
جو کہ ہر شے سے بہت خوب ہے وہ دل ہے یہی — مجھکو جو جان سے محبوب ہے وہ دل ہے یہی

حق نے کیا مطلعِ انوار بنا رکھا ہے
گنجِ اسرار اسی دل میں چھپا رکھا ہے

دل ہے کیا چیز بیاں کر نہیں سکتا کوئی — بات پردے کی عیاں کر نہیں سکتا کوئی
خود کو رسوائے جہاں کر نہیں سکتا کوئی — آئینہ ہے یہ گماں کر نہیں سکتا کوئی

اہلِ دل دل پہ نظر اپنی سدا رکھتے ہیں
اسی دل میں وہ نہاں نورِ خدا رکھتے ہیں

اے رسا سخت جگر ماہ جبیں ہوتے ہیں — کس قدر ظالم و بے رحم حسیں ہوتے ہیں
مہرباں یہ کسی عاشق پہ نہیں ہوتے ہیں — بت کافر بھی مسلمان کہیں ہوتے ہیں

مفت انساں کا دل چھین لیا کرتے ہیں
غمزوں سے اسے برباد کیا کرتے ہیں

سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی

مرزا غالب کے اخلاقی نکات

ایک زمانہ وہ تھا کہ ایشیائی شاعری کی گرم بازاری چاروں دانگ میں تھی بادشاہوں کے دربار اور سلاطین کی مجلسیں اُمرا کی محفلیں علما کی جماعتیں صوفیا کی انجمنیں بغیر شاعروں اور شاعری کے بے رونق اور پھیکی پھیکی کہی جاتی تھیں کوئی مجلس ایسی نہ تھی جس میں ادبی کمالات کے ماتحت شاعری کا ذکر نہ ہو بڑے بڑے بادشاہ اور امیر شاعری کو طرۂ لیاقت سمجھتے تھے یا سند سودیی۔

ایک زمانہ اب ایسا آیا ہے کہ بعض کے نزدیک ایشیائی شاعری مخرب اخلاق اور ننگ ادب کہی جاتی ہے اور بعض کے خیال میں محض ایک تضیع اوقات۔

فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست

ایشیا والوں نے شاعری اور نظم میں جس قدر ترقی کی اور شہرت پائی ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں عربی، فارسی، سنسکرت، بھاشا اور اردو میں ایسے ایسے نادر الکلام شاعر ہو گذرے ہیں کہ آج اُن کی نظیر دنیا کے دوسرے حصوں میں ملنا مشکل ہے ایشیا اگر اس پر فخر کرے تو بیجا نہیں۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ایشیائی شاعری خصوص ہندوستان کی شاعری میں نیچرل مضامین یا تو ہوتے ہی نہیں اور یا بہت ہی کم۔ ایشیائی شاعری پر یہ ایک الزام ہے اس میں صدہا نیچرل مضامین پائے جاتے ہیں صرف طرز بیان یا طرز استدلال کا فرق ہے۔ اگر ایک پھول۔ ایک سبزی ایک چٹان ایک پہاڑی آفتاب ماہتاب سیارے، ستارے، چاندنی۔ اور ظلمت سامان یا منظر نیچر ہے تو دل۔ ضمیر۔ قلب۔ خیالات۔ خواہشات۔ عزم۔ ارادہ۔ یاس۔ امید۔ خوشی۔ اور

غم بھی تو نیچرل کیفیات ہی ہیں اگر وہ بیرونی مناظر ہیں تو یہ اندرونی کیفیات ہیں اگر اُن کا نظارہ آنکھیں کرتی ہیں تو ان کا نظارہ ضمیر اور دل کرتا ہے کیا بستان ضمیر اس بیرونی بستان سے کچھ کم کیفیت اور کم نظارہ رکھتا ہے اگر باغ میں مختلف قسم کے گل و ثمر ہوتے ہیں تو باغ دل میں اس سے بھی زیادہ گل و ثمر موجود اور مثمر ہیں اگر آسمان پر ستارے اور سیارے نظر آتے اور اپنے اپنے وقت پر چمکتے ہیں تو دل کے آسمان پر اس سے بھی زیادہ منظر ہوتے ہیں آسمان تخئیل وہ آسمان ہے جس کی ریس اس دنیا کا آسمان نہیں کرسکتا۔ اگر نجوم کی حقیقت اور کیفیت کچھ نہ کچھ دنیا کے ماہرین اور ذہین لوگ دریافت کر چکے ہیں تو ضمیر اور دماغ کی صفتیں اور حکمتیں اب تک بہت کچھ دریافت کے قابل ہیں، یہ وہ کوچہ ہے جس میں ہم میں سے بہت سے لوگ گئے بھی مگر اب تک کوئی اس کے آخر تک نہ پہنچا اگر ایشیا کے بعض شاعروں نے اس دریائے بے کنار میں اپنی اپنی بساط کے مطابق غوطے مارے ہیں تو وہ بھی حدود نیچر سے باہر نہیں گئے۔

بڑی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ایشیائی شاعری میں عشق و محبت کا بہت جھگڑا ہوتا ہے بالکل درست مگر کبھی یہ بھی سوچا کہ محبت کے سوائے دنیا میں اور ہے ہی کیا ایک مذہب میں لکھا ہے اور بڑے فخر کے ساتھ

"خدا محبت ہے۔"

ہاں یہ کہو کہ عشق و محبت کے طریق اظہار میں ذرا احتیاط نہیں کی جاتی ورنہ یہ کوئی برائی تو نہیں جہاں محبت نہیں وہاں اور ہوتا ہی کیا ہے محبت ہی کا تو سب قصہ ہے عشق و محبت انسان کی گھٹی میں ہی ملا لا گیا ہے۔ رہا اب اُسکا استعمال اور اُس کا محل یہ ہمارے اپنے اختیار کی بات ہے کون سی ایسی چیز اور ایسی طاقت ہے جو برے استعمال سے برائی نہ پیدا کرے۔

جس روز حرف عشق ہم آہنگ صور تھا
اے مشت خاک تجھکو تامل ضرور تھا

جس تمدن پر متمدن اور ترقی یافتہ قومیں فخر کرتی ہیں اُس کی بنیاد بھی تو یہی عشق والفت ہے۔ کون ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ سوائے عشق و محبت کے یہ تمدن نشوونما پا سکتا ہے قومی جوش اور قومی وابستگی مذہبی اخوت کی بنیاد بھی تو یہی عشق و محبت ہے محبت کا دوسرا نام خلوص ہے کیا جس قوم میں خلوص نہیں وہ کبھی متمدن اور ترقی یافتہ کہی جا سکتی ہے۔ اگر ہم ایشیائی شاعروں کا کلام غور سے پڑھیں تو اُن میں سے بھی ایسے ایسے اخلاقی اور ادبی نکات نکل سکتے ہیں کہ جنھیں دوسرے الفاظ میں فلسفۂ اخلاق کہنا چاہیے۔ یا سبق اخلاق۔

ہم حضرت غالب کے کلام میں سے ایک ایسی غزل پیش کرتے ہیں جو عاشقانہ رنگ میں کہی گئی ہے اور سرسری نظروں میں سوائے عشق و محبت یا شکایت کے اُس سے اور کچھ نہیں نکلتا۔ یہ ہماری سرسری نگاہوں کا اندوختہ اور بصیرت ہے ذرا تعمق اور غور سے دیکھنے پر کھل جاتا ہے کہ اسی کلام سے ایسے دل آویز نکات نکل سکتے ہیں کہ اُنھیں دوسرے الفاظ میں کلید اخلاق بھی کہہ سکتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

اس شعر میں حضرت غالب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں تیرے در پر یا تیرے سہارے میں تو دائم پڑا رہتا ہوں یہ میری زندگی بھی کچھ زندگی ہے میں تو گویا ایک پتھر ہوں۔

مطلب یہ کہ ہمیشہ اپنی ہمت اپنے عزم اور اپنے استقلال کو جواب دے کر ایک ہی ناگفتہ بہ حالت میں پڑے رہنا کچھ زندگی نہیں ہے ایسی زندگی ایک پتھر کی

کیفیت رکھتی ہے جو دوسروں کے ہلانے سے ہلتا ہے اور دوسروں کے اُٹھانے سے اُٹھتا ہے۔ دیکھیے کیسی نازک خیالی ہے اور کس خوب صورتی سے اس کا ثبوت دیا گیا ہے۔

(۲) کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

سبحان اللہ کس دلاویزی اور کس خوبی سے گردش نامطبوع کی کیفیت تکلیف دہ کا ثبوت دیا گیا ہے اور کس عمدگی سے یہ ثابت کیا ہے کہ میں تو ایک زندہ ہستی ہوں جو ایک حس رکھتی ہے میں کوئی پیالہ اور ساغر نہیں کہ گردشِ مدام سے دل برداشتہ نہ ہوں انسان کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ جہاں وہ حرکت پسند ہے وہاں گردش نامطبوع یا گردش مدام سے بھی خوش نہیں رہتا اُسکی طبیعت فطرتاً اعتدال پسند واقعہ ہوئی ہے جب اُس کا مقابلہ کسی واقعی نامطبوع کیفیت سے ہوتا ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور یہ لازمی ہے بے جان تو نہیں کہ گھبرائے نہیں اگرچہ حرکت برکت غماز ہوتی ہے مگر حرکت اور گردش میں فرق ہے۔ گردشِ مدام ایک ایسا چکر ہے کہ جو انسانی طبیعت کو چکرا دیتا ہے اور انسانی طبیعت قابو سے نکل جاتی ہے انسان کا یہ فرض ہے کہ ایسی گردش مدام میں سے نکلنے کی راہ سوچتا رہے کیونکہ اس حالت میں ایک ذی حس ہستی کی طمانیت باقی نہیں رہتی۔

(۳) یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

عالم تحیر میں فرماتے ہیں:۔

مجھے زمانہ کیوں مٹاتا ہے میری ہستی کے درپے کیوں ہے میں تو ایک ایسا حرف (یعنی ایک ایسی ہستی) ہوں جو اس جہاں کی لوح پر مکرر نہیں یعنی جو ہستی اس دنیا میں ہستی نے پیدا ہوتی ہے وہ اپنی آپ ہی نظیر ہوتی ہے نہ پہلے کوئی

پہلے گذری ہوتی ہے اور نہ پھر کر آتی ہے جو نقش ایک وقعہ قدرت بناتی ہے وہ دوسری دفعہ نہیں بناتی ایک نقش دوسرے سے نہیں ملتا جو آچکا وہ پھر نہیں آتا جو گذر گیا وہ پھر رخ نہیں بدلتا۔

سلسلہ کتابت میں سے وہی حرف مٹا یا جاتا ہے جو مکرر ہو کیونکہ مکرر حرف کے رکھنے سے عبارت اور معانی میں فرق آتا ہے جو مکرر حرف نہیں ہوتا وہ تو مٹایا نہیں جاتا کیونکہ اس کے مٹانے سے بھی عبارت کا سلسلہ ٹوٹتا ہے۔

تحیر کے ساتھ یہ سوال کیا گیا ہے کہ ہیں (یعنی انسان) اس دنیا میں یا اس صفحہ دنیا میں حرف مکرر تو نہیں تھا پھر اُسے مٹایا کیوں جاتا ہے یہ ایک نکتہ ہے ہر انسان سوچ سکتا ہے کہ اُس کی ہستی فنا کیوں ہو جاتی ہے یا فنا اُسپر لازم کیوں کی گئی ہے حالانکہ وہ کوئی فضول ہستی نہیں یہ وہ سوال ہے جو سوچنے والے کے واسطے وہ مرحلہ پیش کرتا ہے جو حشر ثانی کی صورت میں زیر بحث ہے اور اسپر غور کرنے سے ثابت اور معلوم ہو سکتا ہے کہ

جب انسان اس صفحہ دنیا پر حرف مکرر یا فضول ہستی ہی نہیں تو اُسکی فنا سے قدرت کی غرض کیا ہے مٹایا تو وہی حرف جاتا ہے جو فضول اور مکرر ہو ایک طرف جب ہم خود کو حرف مکرر اور فضول نہیں کہتے تو اُس کا مٹایا جانا کوئی اور حقیقت رکھتا ہوگا جس سے ہم ناواقف ہیں یوں کہیے کہ

(الف) حرف مکرر مٹایا جاتا ہے یا مٹانے کے قابل ہے۔

(ب) ہم حرف مکرر نہیں ہیں۔

(ج) ہمیں باوجود اس کے مٹایا جاتا ہے۔

(د) ثابت ہوا کہ ہمارے مٹانے میں کوئی حقیقت مخفی اور کوئی راز ہے۔

(ہ) جسے ہم تفصیل سے جان نہیں سکتے۔

(ز) ثابت ہوا کہ ہمارا سٹایا جانا عبث اور فضول یا بے حقیقت نہیں۔
(ح) کوئی نقش ثانی اس میں مخفی ہے۔

(۴) حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

اللہ اللہ کس پایہ کا شعر ہے سامکرر سہ کرر اسے پڑھیے سوچیے کہ ملازمات شاعری کے علاوہ اسکی تہ میں کیسے کیسے نکات بھرے ہیں پڑھنے میں الفاظ تو سادہ ہی ہیں مگر اس سادگی کے ساتھ جو دلچسپی اور جو دلاویزی ہے اُسکی کون داد دے گنہ گار اور کافر یا گناہ اور کفر میں جو فرق بتایا ہے وہ اس وسعت ضمیر اور وسعت خیال حضرت غالب علیہ الرحمہ کا ثبوت ہے جو خدا نے اُنھیں بخش رکھا تھا ایک طرف خود کو گنہ گار مان کر طالب مغفرت ہونا اور دوسری طرف یہ کہنا کہ مَیں کافر تو نہیں ہوں کہ میری سزا کی کوئی حد ہی نہ ہو آخر تیری رحمت بھی تو کوئی شے ہے اس طلب مغفرت اور طلب رحمت کے ساتھ آپ فرماتے ہیں کہ یہ سزا تنبیہ اور عقوبت کے واسطے دی جاتی ہے جس کی کوئی حد نہ ہو وہ سزا تو نہیں ہوتی وہ اُن حدود اور اُن قیود سے باہر ہوتی ہے جو ایک ضابطہ یا ایک قانون مقرر کرتا ہے خدا کا ضابطہ سب ضابطوں سے زیادہ تر واضح اور مکمل ہے کیا اُس میں سزا کی کوئی حد نہیں ہونی چاہیے۔

جب ایک عاصی کے واسطے حد سزا ندامت صادقہ اور توبہ حتمی رکھی گئی ہے تو کیا عاصی کا یہ حق نہیں کہ طالب رحمت ہو گنہ گار اور کافر میں فرق ہے گنہ گار ایک غلطی کرتا مقابلہ نہیں کرتا اور کافر مقابلہ کرتا ہے گنہ گار دوسرے الفاظ میں ایک خطا کار ہے اور کافر باغی ان دونوں میں فرق ہے۔

(۵) غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اس شعر میں آزادی اور نوکری کا فرق بتلایا گیا ہے فرماتے ہیں تم تو ایک وظیفہ خوار ہو نوکر ہو پابند ہو آقائے نعمت کو دعا دو کیونکہ خدمات کے سوائے پابند اور نوکر وظیفہ خوار کا یہ بھی فرض ہے جس کا کھائے جس کا ہوا ہے جس کا سہارا ہو اُسے دعا دے اُسکے اقبال اُسکی فارغ البالی کی خیر مانگے نوکری کی حالت میں ان مراعات ملازمت اور لوازم خادمیت سے غافل رہنا شرط خادمیت کے خلاف ہے ایسی بے اعتنائی تو اُسی صورت میں زیبا تھی جب کہ تم پابند اور نوکر نہ تھے اب تو نوکر ہو وہ دن گئے جب یہ زعم اور یہ گھمنڈ تھا کہ ہم کسی کے نوکر ہیں؟ آزادی اور پابندی میں عملی طور پر فرق جتایا گیا ہے اور ضمناً یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نوکری اور وظیفہ خواری بہر حالت آزادی کے مخالف ہے اور مراعات نوکری میں سے یہ مقدم ہے کہ فرائض ملازمت اور شرائط خادمیت کو بوجہ احسن پورا کیا جائے نوکر ہو کر شرائط اور فرائض نوکری سے بے پروا رہنا ضابطہ ملازمت کے خلاف چلنا ہے اور ملازمت یا پابندی کی تحقیر کرنا ہے۔

بالفاظ دیگر اس شعر میں اعتراف خادمیت فرائض ملازمت شرائط معاہدہ یا شرائط پابندی کی یاد دلائی گئی ہے اور ذاتی مثال سے جتایا گیا ہے کہ نوکر ہونے کی صورت میں آقائے نعمت کے احترام علیا اور شرائط معاہدہ کو مد نظر نہ رکھنا صحیح اور درست نہیں ضابطہ ملازمت اور قانون معاہدہ ہی کے خلاف نہیں ضابطہ اخلاق کے بھی خلاف ہے کیونکہ ضابطہ اخلاق کا مدعا بھی یہی ہے کہ جو معاہدہ کیا جائے وہ ایک خوبی کے ساتھ پورا ہو اور کوئی نقص عائد نہ ہوئے (وہ دن گئے) کا مفہوم یہ ہے کہ جب آزادی نصیب تھی پابندی سے فراغت تھی اپنی نیند سونا اور اپنی جاگ اُٹھنا ایک نعمت غیر مترقبہ تھی ایسی زندگی کی ریس نہیں ہوسکتی۔ افسوس احتیاجات اور تنگ زندگی ضروریات نے یہ حالت باقی نہ رہنے دی اب اُس حالت کو یاد کر کے دلکو سمجھانے کے لئے رہنا خود کو مدنام کرتا اور ایک کلفت میں

ڈالتا ہے (وہ دن گئے) اب تو رسن کسی اور کے ہاتھ میں ہے باگ کوئی اور پکڑے ہوئے ہے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

سلطان احمد

آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

مبتلائے حرص بیجا آج خاص و عام ہے — فکر جمع مال و زر کمبخت صبح و شام ہے
سعت بیجا ری ضرورت ہر جگہ بدنام ہے — ابن آدم اپنے ہاتھوں مورد آلام ہے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست — آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

جسم میں اچکن تو ہے۔ گو کوٹ سے زینت نہیں — ہے سلیم شاہی۔ تو بوٹ اور شو نہ کی حاجت نہیں
خشک ٹکڑا بس ہے کھانے کو۔ اگر نعمت نہیں — تنگدستو! تنگ دل کیوں ہو۔ اگر وسعت نہیں
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست — آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

اپنے ہاتھوں آپ اے ناداں ذلیل و خوار ہے — کچھ بھی غیرت ہے تجھے ظالم ذرا بھی عار ہے
جسقدر ہے۔ وہ بھی جان ناتواں پر بار ہے — اے ہوس پیشہ۔ تجھے اب اور کیا درکار ہے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست — آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

لیمپ برقی چاہیے نادوں کے پالے کے لیے — بیکسوں کو چاندنی بس ہے اُجالے کے لیے
کملی والو! مر رہے ہو کیوں دوشالے کے لیے — ہے جو کچھ وہ بھی بہت ہے مرنے والے کے لیے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست — آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

اے حریص مال و زر اے صاحب صد گونہ زور — تنگ چشمت را قناعت پُر کند یا خاک گور
تا کجا حرص و ہوا اے مالک اسپ و ستور — دانہ دانہ می کنی انبار تا کے مثل مور
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست — آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

جنسِ لطیف

عورت۔ ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کے اُسے تازگی اُسے زینت بخشتی ہے وہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد سخت دل ہوجاتا ہے۔ اکھل کھرا بن جاتا ہے۔ یہ عورت کی شفقت دنوازش ہے۔ یہ اُسکے مسکراہٹ ہی کا اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی اور رقیق حسیات سے منور ہوجاتا ہے عورت میں حسن نہوتا تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہوتی۔ مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوب صورتی اور دلبری رائگاں جاتی۔

عورت کا جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک تیامت ہوجاتی ہے۔

عورت۔ جب مُنہ پھیر کر چلنے کے لیئے کھڑی ہو تو اُسکے یہ معنی ہیں کہ وہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑلے۔

عورت تفتیش حالات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنا چاہتی ہے۔

عورت۔ کو فتوحات حُسن کا وہ شوق ہوتا ہے کہ کسے باشد۔ اُسے اپنی اداؤں کی فوج اور حُسن کی باڑھ سے اس پر حملہ کرنا ضرور چاہیئے۔ اسکے نتائج خواہ کیسے ہی کچھ ہوں مگر اُسے تو لوگوں کو چکا چوندھ میں ڈالنے سے کام ہے۔ عورت کی ذات میں یہ شوق اسقدر عام ہے اور اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ اب وہ بالارادہ عمل میں نہیں لاتی بلکہ از خود اس سے سرزد ہوتا ہے۔

عورت۔ عورت کی چالوں کو عورت ہی خوب سمجھتی ہے۔

عورت۔ دنیا کی سب مصیبتیں اور سب باتیں ٹھنڈے دل سے برداشت کرلے گی مگر یہ کہ حُسن کے معاملہ میں کوئی اُس سے بڑھ چڑھ کر رہنا چاہے۔ صرف وہ رقابت جو حُسن کی

کشمکش سے پیدا ہوتی ہے اور جس سے اُسکی عزت نفس پائمال ہوتی ہے عورت کو سب سے زیادہ تکلیف دیتی ہے۔ اور اکثر موقعوں پر عورت کی رنجیدگی جس کا کوئی باعث نظر نہیں آتا اور جس کو دیکھکر مرد حیران اور پریشان ہوتے ہیں اسی پر مبنی ہوتی ہے۔

عورت۔ کو پھول سے تشبیہ دیتے ہیں یہ تشبیہ بالکل صحیح ہے مگر یہ بھی ملحوظ رہے کہ مایوسی اور غصہ کی حالت میں وہ سراسر خار ہے۔

عورت۔ ضعیف اور دل ہی دل میں گھٹنے والی ہی۔ مگر جب ناچار ہو جاتی ہے تو اُس میں ایک غیر معمولی جرات پیدا ہو جاتی ہے۔

عورت۔ کا دل جہان محبت کے لیے آئینہ جم ہے۔

عورت۔ ہونا اور اک ذرا حسین ہونا ایک ایسا قہر ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں۔

عورت۔ کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق دوسروں کی رائے سنی سے جسقدر خوش ہوتی ہے۔ اتنی وہ خود آئینہ بھی دیکھکر کبھی نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہ گھنٹوں اسکے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسکی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو۔ اخلاق و عادات سے ذرا بحث نہو۔ وہ اپنے تئیں شوخ اور چلبلی سُن کر خوش ہو سکتی ہے۔ مگر اپنے شباب کے متعلق صلاح و تقویٰ کے نسبت سُننا پسند نہیں کر سکتی۔ کیونکہ شوخی اور چلبلے پن میں تو اسکے شباب کے اقتضاء کا ذکر ہے زہد و عبادت ایک طور سے اس کے شباب کی توہین ہے۔

عورت۔ جس وقت تک اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی اُس وقت اسکی زندگی ایک کلی کی سی آزمیدہ زندگی ہے۔ نہ وہ کہیں جانا آنا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جائے۔ جب اُسکی حیات معاشقہ ایک کھلی صورت اختیار کرے تو وہ تنہا ہونے پر بھی بجائے خود ایک انجمن ہے اور خلوت سرا سے بیزار

جبتک کہ اُسکی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں ہوتا وہ یہی آرزو کرتی ہے کہ کوئی اُسے یہ بتائے کہ اُسکے حُسن و شباب میں کچھ لذتیں بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن جب کوئی شخص اُسے مل جاتا ہے اور اُس کی جوانی کی لذتوں کو اپنے اعترافات فعلی سے اس کے لیے قابل الفہم بنا دیتا ہے تو پھر عورت اپنے مسرت کے بار کو برداشت نہیں کرسکتی اور اپنے جنس و عمر کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے جس سے وہ اپنی لذتوں کو بیان کرے یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اب اپنی مسرور شاد کام حالت میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا اُس پر رشک کرے۔

عورت۔ معاملات محبت میں جس قدر جلد نتیجہ پر پہونچ جایا کرتی ہے اتنی ہی خلش اس بات کی بھی رہتی ہے کہ اگر میں کسی کو چاہتی ہوں تو وہ بھی مجھے ضرور چاہے۔

عورت۔ نام ہے عشق کا۔ اور اُسکی ادائیں اُس عشق کا نعلق ہے۔

انتخاب شوہر کی حس "عورت" کی پُرشباب زندگی کی تنہا حس ہے۔

عورت۔ اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہی ہے جسکا تعلق صرف اُس کے شباب سے ہے

عورت۔ اپنی کمزوری اور بُرائی کی ترغیب دوسری عورت کو نہایت دلی اطمینان سے دیتی ہے۔

عورت۔ جب کسی عورت سے بے انتہا محبت کرتی ہے تو وہ یعنی دوسری عورت خیال کرتی ہے کہ وہ چاہتی ہوگی کہ میں بھی کسی دن اُس سے اسیطرح محبت کروں۔

عورت۔ کو کوئی مرد کہے کہ وہ جوان ہے تو اس کی سچی تعریف میں داخل ہے۔ اگر کوئی عورت کسی مرد کو جوان کہے تو اس کی گفتگو کی توہین ہے۔

عورتیں۔ صحیفہ جس کی وہ مالک نہیں۔ اُس کا ضد چاہتی ہیں۔

عورت۔ کے لیے یہ نہایت خوش قسمتی ہے کہ کوئی ڈاکٹر انکے دل کا آپریشن نہیں کرسکتا

عورت - بغیر مدح وثنا کے خوش نہیں رہ سکتی - مرد کے لیے تھوڑی تعریف زیادہ ہے-
عورت - کو اگر ٹھیک مشورہ دیں تو اُسکے ناگوار خاطر ہوتا ہے اسلیے کہ وہ ایسا نہیں چاہتی
عورتیں - عورتوں سے بہت جلد خلا ملا نہیں کرتیں جیسا کہ مردوں کا طریقہ ہے - وہ اپنے رازدوں کو بہت پوشیدہ رکھتی ہیں-
عورت - خود فراموشی کا نہایت تعجب خیز حافظہ رکھتی ہے -
عورت - کے کیرکٹر کا پتہ عورت کی ملنے والیوں سے ممکن ہے - مرد کے کیرکٹر کا پتہ مرد کے دوستوں سے مل سکتا ہے - لیکن یہ ناممکن ہے کہ عورت کے کسی مرد دوست سے عورت کا پتہ چلے -
عورتیں - مرد کے اخلاق کا اندازہ اپنے ساتھ کے طریقۂ برتاؤ سے کرتی ہیں (مثلاً عورت کہے گی کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ قاتل ہے اس لیے کہ اُس نے مجھے قتل نہیں کیا)
عورت - تم سے اس لیے محبت کرتی ہے کہ تم نے اور عورتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے لیکن جب تم اُسکو سمجھ لوگے تو وہ تم سے نفرت کرے گی -
عورت - کی محبت ایک مقوی معجون ہے - جیسا زمانہ گذرتا ہے وہ اکثر افلاطونی ہوجاتی ہے -
عورتیں - بہت کم مستقبل کا خیال کرتی ہیں - عموماً ماضی پر نظر نہیں ہوتی ہے - خدا جانے کہ آخر اُن کو کیا سوجھتا ہے -
عورتیں - بے غرض ہوتی ہیں - وہ جس نے یہ کہا "گھر سے خیرات کرنے کا" مقولہ ایجاد کیا -
عورت - جب خود محبت کرتی ہے تو دو روز کے اندر ہی اندر اپنے عاشق کی آغوش محبت میں دکھائی دے گی - بخلاف اسکے کوئی مرد کسی عورت کے لیے دو سال سے کیوں نہ دیوانہ ہو -
عورت - کے لیے جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو وہ قبول کر لیا جاتا ہے - جو کچھ کہ تم کرتے ہو کیے چلے جاؤ تمھیں کوئی شکریہ نہیں ملے گا - اگر کوئی ذرا سی بات بھی تم بھول جاؤ تو تم پر

لعنت برسائی جائے گی (خیرات گھر میں ختم ہوتی ہے)

عورت۔ مرد کے نیک خصلتوں کی عزت کر سکتی ہے لیکن وہ اُسکی بُرائیوں کی عاشق ہو جاتی ہے۔

مہربان؟ ہاں! کیا عورتیں؟ نہیں! مرد۔

غزل

محمد عبدالرزاق بسمل (دارالعلوم)

حضرت حضور نعیمی ہیں بھوپال سے اطلاع دیتے ہیں کہ "تمدن" کے کرمفرماے جناب مولوی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی کی شادی خانہ آبادی منشی ابو محمد چراغ دین صاحب لائق لاہوری کی دختر نیک اختر سے گذشتہ ماہ میں بمقام بھوپال ہوئی۔ ہم جناب محوی کو ان کی اس شادی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ایڈیٹر

نہ کچھ تقدیر اچھی ہے نہ کچھ تدبیر اچھی ہے
ستم کش صرف تیرے صبر کی تاثیر اچھی ہے

بہار آتے ہی رسم چاک دامانی ہوئی تازہ
جنوں کے واسطے اس فصل کی تاثیر اچھی ہے

لہو آنے لگا ہے اب بجائے اشک آنکھوں سے
ارے او موت کے طالب تری تقدیر اچھی ہے

وفا کی داد دی تو نے جفا سے واہ کیا کہنا
تری ہر اک ادا اے حُسن عالمگیر اچھی ہے

تمھیں آنسو بہاتے میرا آسانی سے دم نکلے
ذرا بالیں سے ہٹ جاؤ یہی تدبیر اچھی ہے

سُنا ہے سانس آخر ہو چکی بیمار فرقت کی
ابھی تک تم نہ نکلے گھر سے یہ تاخیر اچھی ہے

ہوا ہے اُس جفا پرور کو پھر ذوقِ نمک پاشی
دلِ مجروح کے ہر زخم کی تقدیر اچھی ہے

کسی دن پوچھنا ہے کاتبِ تقدیر سے مجکو
مری لوحِ جبیں میں بھی کوئی تحریر اچھی ہے

جگر کے داغ دل کے زخم جل اُٹھتے ہیں سینے میں
یہ کس نے کہدیا اُس حُسن کی تنویر اچھی ہے

کبھی اے عاشقِ درماندہ تو نے یہ بھی سوچا ہے
کہ اُس کوچہ کی تجھ سے خاک دامنگیر اچھی ہے

زباں محوی کی کھنچوائی گئی اللہ ری خودداری
کہیں یہ کہدیا تھا "آپ کی تصویر اچھی ہے"

محمد حسین محوی لکھنوی (بھوپال)

بیکس عورت

اکثر حضرات کو یہ مضمون بعض بعض مقامات پر واقعات سے مبرا اور صاحب مضمون کی خیال آرائی نظر آئے گا۔ گو ہم اس مضمون کے کسی صحیح واقعہ پر مبنی ہونے کا یقین نہیں دلا سکتے تاہم اس دنیا میں بعض ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو بعید از عقل معلوم ہوتے ہیں اپنی بہو کا ایک چپراسی سے شادی کر دینا ہم بالکل خلاف عقل نہیں خیال کرتے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے خاص اعزا کو اپنے ادنی ملازمین بلکہ ملازمین کے بھی ملازمین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ہمیں ایک واقعہ معلوم ہے جس میں ایک معزز خاندان کے معزز رکن نے اپنی ایک قریبی رشتہ کی ہمشیرہ کی اپنے ایک ملازم سے شادی کر دی۔۔۔!

(۱)

ذاکرہ کی شادی کو ایک سال بھی نہیں گذرا کہ جیٹھ و دیوروں کی مہربانی سے سسرال میں نکو بن گئی۔ مردوں کے تیور بدلے دیکھ کر عورتیں بھی متاثر ہوئیں اور مخالفت کی آندھیوں نے ایک دن بھی خوشی سے نہ رہنے دیا۔ بیچاری کے لیے شادی نہیں بلکہ مصیبت ہوئی۔ میاں کے گھر آکر ایک دن چین آرام نہیں پایا۔ جس دن سے سسرال میں قدم رکھا۔ راحت و آرام کو سلام کیا آزادی کو رخصت کیا۔ دلی آرزوؤں کو خیرباد کہا۔ اور بغیر کسی جرم کے ایسی قید میں رکھی گئی جس سے ساری عمر روتے کٹی نہ بیچاری کا کوئی ہمدم نہ ہمدرد۔ نہ مونس ہے نہ غمخوار۔ عجب مصیبت میں جان آگئی۔ ماں باوا کی خوشی ہوئی لیکن شادی والی کی کسی نے پرواہ نہ کی۔ اس سے سب بے خبر رہے اسکے خیالات کسی نے معلوم نہیں کیے اس کی مرضی کسی نے دریافت نہیں کی اسکے

جذبات کی کسی نے پرواہ نہ کی۔ اور ایک ناصورت شناس مرد سے شادی کر دی۔

اس وقت تک ایک دن تو کیا ایک منٹ کے واسطے بھی چین نہ ملا۔

ذاکرہ کے لیے یہ مدت برسوں سے کم نہ تھی۔ علاوہ سارے گھر کی مخالفت کے میاں کے بھی تیور چڑھے۔ مزاج الگ تیز۔ بات بات پر ناراضگی۔ تنک مزاجی۔ انسانیت و شرافت کی بات ہی نہیں۔ کسی دفعہ محبت۔ اخلاص۔ پیار کی باتیں نہیں سنیں۔ بلکہ روزانہ طعن تشنیع، اتہام و بہتان کی بوچھار رہی۔ ہر لحظہ کوفت و رنج۔ معلوم ہوا تھا کہ دولہا میاں بی۔ اے ہیں۔ لیکن خود غرضی و ظلم کی تعلیم پائی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مولوی ہیں لیکن شریعت اور اسلامی تاریخ سے بالکل ناواقف اخلاقی تعلیم بالکل نہیں پائی بلکہ بد اخلاقی ہیں۔ ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ اگرچہ بی۔ اے اور مولوی ہیں لیکن اُس شخص سے کسی کو کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ وسیع الاخلاق ہوگا جس نے جاہل ماؤں کی گودوں میں پرورش پائی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بیچاری مظلومہ (بیوی) کو ایک دن آرام نہیں دیا۔ بلکہ شادی کے کچھ دن بعد سے سارے گھر کا کام نئی دُلہن کے سپرد کیا گیا۔ جو ذاکرہ نے لونڈی غلاموں کی طرح کیا۔ مگر جب بھی سسرال والوں کے دانت تیز۔ یہ بیچاری مصیبت زدہ سب ظلم سہ رہی ہے۔ طعن تشنیع کو برداشت کر رہی ہے لیکن اُف نہیں کرتی۔

(۲)

میاں دفتر سے آئے۔ اور بیہوش ہو گئے۔ اس وقت بیچاری۔ بھاگی ہوئی آئی۔ محبت کے مارے بیقرار ہو گئی۔ عرق گلاب مُنہ پہ چھڑکا۔ کیوڑہ سینے پر ملا حکیم کو بلوایا۔ غرض ذرا سی دیر میں برسوں کے کام کر دیے۔ نہ والدہ صاحبہ تشریف لائیں نہ بہن صاحبہ۔ نہ والد صاحب آئے نہ ہمدرد (ظاہری) بھائی صاحب نے کروٹ لی۔ ذاکرہ چاروں طرف دیکھتی ہے ہر کمرے کی طرف نظر ڈالتی ہے سارا آنکھوں ہی آنکھوں

میں مدد کی درخواست اور معائنہ مرض کی التماس کرتی ہے۔ لیکن کوئی سنگدل نہیں اُٹھتا کوئی کام کرنے والا۔ مدد دینے والا نظر نہیں آتا ہاتھ پاؤں دبا رہی ہے۔ سر میں تیل ڈال رہی ہے عطر سنگھا رہی ہے۔ لیکن گھنٹہ بھر ہو گیا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ بلکہ زہر ظلم وستم کا نشہ ترقی کرتا رہا اور رگ رگ میں سرایت کر گیا۔

ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا ہے ابھی تک ہوش نہیں آیا والدہ صاحبہ نے اپنی پلنگڑی پر سے پڑے پڑے پوچھا "لو کیا ہوا کیسے ہیں؟" اس بیچاری نے ایک آہ سرد بھری اور کہا "بیہوش ہیں"! والدہ صاحبہ نے کچھ پرواہ نہ کی۔ اور معمولی بات سمجھ کر سو رہیں۔ ان کے سونے کے بعد ہی اس نئے دولھا کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کیا۔ نئی دُلہن نے اپنے رنڈاپے اور کنبہ والوں کی کس میرسی پر رونا شروع کیا۔ ساس بے اختیار انہ رونے پر جاگیں۔ اُٹھیں۔ آکر دیکھا۔ بڑبڑائیں اور

اُلٹا چور کوتوال ڈانٹے

کی ضرب المثل کو خلعت صداقت پہنا کر ڈاڑھیں مارنی شروع کیں۔ سب کنبہ والے جمع ہو گئے چیخوں سے بے آنسو کے رونے کی مجلس گرم ہوئی۔ صدمہ ایک کے دل پر نہیں مگر صدائے آہ و بکا سے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ لیکن جس کو حقیقی محبت تھی۔ اور جس کے دل میں معنوی ہمدردی و غمخواری تھی جس کی زندگی تلخ۔ جس کی اُمید یں ختم جس کی آرزوؤں کا خون جس کا دل مجروح ہوا۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی ہیں۔ لیکن آواز نہیں نکلتی آنکھیں پُرنم ہی نہیں بلکہ پُر آب ہو گئیں۔ ہچکی بندھی ہوئی ہے۔ آنکھوں سے دریا بہہ رہا ہے لیکن چیخ نہیں۔ علاوہ اشک چشم کی سیل کے دل بھی پانی پانی ہو گیا۔ جوش اُٹھتا ہے۔ اور روکتی ہے لیکن ماتم ظاہری نہیں کرتی۔

(۳)

جنازہ ابھی دفنایا نہیں گیا۔ نوجوان ذاکرہ۔ محبت کی دیوی ذاکرہ۔ ماہ پارا ذاکرہ کی

دنیا ختم ہوگئی۔ طعن تشنیع کا انبار لگ گیا۔ ہجوم نحوست کی سختیوں سے گھبرا گئی۔ "ناگن" کے پُر وحشت لقب کو سُنتی تھی اور صبر کرتی تھی۔ "ڈائن" کے پر ہیبت خطاب کے چرچے کو سماعت کرتی تھی۔ اپنے اسی خیال میں غرق رہتی تھی اور کسی بات کا خیال نہ کرتی تھی۔ لیکن تا بہ کے ناسوروں کا مُنہ پھوٹا اور زخم جگر کا مواد نکلا ضبط نہ کر سکی۔ اور پُر ارمان دل کی متالم سوگواری میں روتے روتے بیہوش ہوگئی۔ میاں کی مغفرت کا خیال دامنگیر تھا۔ حقوق و فرائض سے واقف تھی۔ مصیبت زدہ دل کو ہاتھ میں لیے گورِ شوہر میں پہنچی۔ نکیرین کو سزا دیتے دیکھا۔ بے اختیار کہہ دیا "اگرچہ میرا دل ان کے تیر سخن سے چھلنی اور (ان کے) والدین کے ظلم و ستم سے چور ہے کبھی ایک پل کے لیے اس پُر حسرت دل نے عیش نہیں پایا۔ لیکن معاف کرتی ہوں۔ اپنا صبر ان کے میزان اعمال میں رکھتی ہوں۔ میرا بیقرار دل گوارا نہیں کرتا کہ اپنے شوہر کو عذاب قبر کی سخت مصیبت میں دیکھے۔ وہ دست بردار ہے داد نہیں چاہتا۔ بلکہ درخواست عفو نہایت عجز و ادب کے ساتھ پیش کرتا ہے" نکیرین نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا عتاب آمیز جواب سُن کر نکیرین کے رونگٹے کھڑے ہوگئے لیکن روح ذاکرہ نے اپنے ظالم شوہر کی خطائیں معاف کرائیں اور واپس آئی۔ تین گھنٹے بیہوش رہی ساس خوش تھی کہ اچھا ہو جو یہ پاپ بھی کٹ جائے۔

ذاکرہ کو ہوش آتے ہی خوشیاں رنج و غم سے مبدل ہوگئیں "خاک میں مل گئیں۔"

(۴)

ذاکرہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کا بھی صدمہ اُٹھا چکی تھی۔ اب میاں بھی چل بسے۔ کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ ساس سُسرے نے بصد مشکل چار مہینہ دس دن گویا سولی پر رکھا۔ اسکے بعد گویا جواب ہی دیدیا۔ اب بیچاری حیران ہے۔ پریشان ہے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ گلی کوچوں کی صورت نہیں دیکھی روتی ہوئی

بُرقع اوڑھ کر دروازہ کے باہر نکلی لیکن ہمت نہ دیکھی۔ جرأت نہوئی۔ گھر میں واپس آگئی۔ نند صاحبہ نے دبی زبان سے کہا "لو وہ منحوس پھر آگئی۔ نہیں معلوم اب کس کو مارے گی ڈائن ہے۔

خسر صاحب بڑے مولوی ہیں۔ سُنا ہے کہ مفتی بھی ہیں بڑے عالم ہیں۔ بہو کی صورت دیکھکر آگ بگولا ہوگئے کہنے لگے "میرے جوان بیٹے کو تو کھا چکی۔ اب کس کا ارادہ ہے جا۔ یہاں سے دفان ہو ہم کو تیری صورت دیکھنی منظور نہیں۔ تجھکو اپنے گھر کا پانی پلانا بھی ہم کو حرام ہے۔ مظلومہ نے پاؤں پر سر رکھدیا۔ اور کہا "آپ مجکو غلام بنالیں گھر کا سب کام کاج کروں گی شریف زادی ہوں۔ آپ ہی کی رشتہ دار ہوں میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھکو اب سوائے خدا کے بظاہر کسی کا سہارا نہیں ہے دروازہ کے باہر آج تک کبھی قدم نہیں رکھا۔ میں راستوں سے ناواقف۔ کہیں جا نہیں سکتی۔ میری حالت زار پر براے خدا رحم فرمائیے۔ بیکس و بے بس ہوں۔ لاچار و مجبور ہوں۔ اسلام نے رحم کی تعلیم دی ہے۔ رسولخدا صلے اللہ علیہ وسلم بھی مجسم رحم تھے۔ خدارا میری حالت زار پر رحم فرمائے۔ سارے گھر کے کپڑے سینے جھاڑو بہارو۔ پیسنا پکانا۔ (غرض) سب کام کروں گی لیکن اس چاردیواری سے نکلتے ہوے شرم آتی ہے"۔ ان الفاظ نے اگر اثر کیا تو رقیق القلب رحم دل عورتوں ہی کے دل پر۔

اگرچہ ذاکرہ صبح ۴ بجے سے اُٹھتی اور سارے گھر کا کُل کام کاج کرتی ہے اور رات کو ۱۲ بجے کمر سیدھی کرتی ہے۔ مگر کوئی خوش نہیں روزمرہ طعن تشنیع کی بارش اور کوسنوں کی برسات رہتی ہے لیکن یہ اللہ کی بندی سب باتوں کو سہتی ہے۔ اور صبر کرتی ہے

(۵)

مفتی صاحب کے گھر پر ایک چپراسی رہتا ہے سب سے اتفاق سے اب ذاکرہ

چپراسی کی زوجیت میں ہے۔ آج تک لکڑیوں اور جوتیوں کی مار زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اب اغوائے ظلم نے کثرت کام کے ساتھ شدت مار بھی کرا دی۔ لیکن یہ تحمل کی دیوی راضی بہ رضائے الٰہی سب باتیں برداشت کرتی تھی۔ راتیں روتے روتے کاٹتی تھی۔ اور دن کام میں۔

(۶)

ذاکرہ انسان تھی حیوان نہیں۔ شرافت اور ادنیٰ درجہ کے ہیچ ذات ذلیل چپراسی کی زوجیت حسرت جوانا مرگی افسوس بدنصیبی۔ کام کی زیادتی پر از دیاد مار نصف پیٹ خوراک۔ کب تک صدمہ دل کو ضبط کرتی۔ رنج و آلام کو برداشت کرتی جب سختیوں اور مصیبتوں کی انتہا ہو گئی تو صبر بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن آفریں ذات ذاکرہ کو۔ اور شاباش حسن مثالم کہ بیماری میں بھی برابر کام کیا۔ خانۂ والدین کا ناز و نعم شوہر کے مصائب سے بدل گیا میکہ کا عیش و آرام سسرال کے رنج و مصیبت۔ اور ہر وقت کی کوفت کی حیثیت میں نمودار ہوا۔ اُس نے بیماری تو کجا کبھی تندرستی میں بھی ایسے کام نہ کیے تھے۔ یہاں کی مار دھاڑ۔ کوسنے اور گالیوں کی کوفت و افسوس نے نہایت مضمحل و نقیہ کر دیا جس کی وجہ سے اچھی طرح کام نہ کر سکی باوجودیکہ سب کی آنکھیں تھیں لیکن اسکی بیماری کو کسی نے نہ دیکھا۔ حالانکہ عقلیں اور دماغ خدا تعالیٰ نے عنایت فرمائے تھے۔ لیکن کسی نے تعلیم توجہ و التفات اور سایۂ رحم میں پرورش ہی نہیں پائی تھی۔ اس لیے اپنی بےبسی و بیکسی و خفتہ بختی پر رونے کو دیکھکر سینکڑوں گالیاں دی گئیں اور چپراسی کے حوالے کی گئی کہ اسکی گردن میں ہاتھ دے کر اس محلہ کے باہر کر آئے۔ اور سر بر سر راہ خوب مارے۔

(۷)

تین دن ہو گئے۔ اور روٹی کی صورت نہیں دیکھی جوڑوں میں درد ہو رہا ہے۔

عزت ریزی پر افسوس کر رہی ہے۔ اور مسجد کے ایک گوشہ میں رضی بہ رضائے الٰہی سکڑی بیٹھی ہے۔ شرافت نے فاقہ کشی کو بھیک پر ترجیح دی۔

مسجد کے قریب ایک دو منزلہ مکان تھا۔ اتفاق سے اس پر صاحب خانہ کی بیٹی شام کے وقت ٹہل رہی تھی۔ اس نے ایک مظلوم پردہ نشین کو نہایت بُری طرح بیٹھا دیکھکر اپنے ہاں کی ماما کو بھیجا۔ اور گھر میں بلوایا۔ بصد مشکل وہاں پہنچی۔ تین دن کے فاقہ پر طرہ یہ کہ نحاہت و اعصاشکنی۔ آواز نہ نکل سکی۔ ان لوگوں نے اسکی حالت زار متاثر ہو کر روٹی کھلائی اور ماجرا دریافت کیا۔ اس نے مجبوراً اپنی کُل کیفیت بیان کی سب گھر کی عورتیں ذاکرہ کی مصیبت زدہ زندگی پر رونے لگیں۔ اور اس بیچاری کو اپنے ہاں رکھ لیا۔ اب یہ بیتی ہے۔ ماماگیری کرتی ہے اور زندگی بسر کرتی ہے۔

(۸)

کہاں ہیں آزادی نسواں کے مخالف کیا یہی وہ اخلاق و الطاف ہیں۔ جن کے گھمنڈ پر نازاں ہیں اور عورتوں کو آزادی نہیں دیتے! کیا اسی لیے عورتوں کو قید کر رکھا ہے کہ ان کے ساتھ ایسے سلوک کیے جائیں!؟ کیا اسی لیے ان کو تعلیم سے محروم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اس ذلت و نکبت میں بسر کریں؟ کیا کوئی شریف یہ گوارا کر سکتا ہے کہ پہلے وہی عورت جو اسکی بہو ہو۔ بیٹے کے مرنے کے بعد اسکو اپنے ایک ادنیٰ درجہ کے ملازم کی زوجیت میں دے؟ کیا تمھاری حمیت اسکو بہتر سمجھتی ہے کہ ایک شریف خاتون کو نیچ ذات چپراسی سے برسر بازار ذلیل کراؤ؟ کیا تمھاری عزت اسکو شرافت یقین کرتی ہے کہ تمھاری دینی بہن ہونے کے علاوہ نسبی رشتہ دار ہو اور تم اسکی حالت پر رحم نہ کھاؤ!؟ کیا یہی وہ معارف ہیں جن کے علم نے تم کو خدا کی عطا کی ہوئی نعمت کو ذلت کے ساتھ قید میں رکھنے کی تعلیم دی ہے؟ افسوس کہ تم ظالم ہو۔ اور کیا عجب ہے کہ تم کو اس نافرمانی کا جلدی بدلہ ملے افسوس کہ تم جانتے ہو۔ کہ کفران نعمت

کتنا بڑا جرم ہے۔ لیکن کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ تم نے ہزارہا دفعہ قرآن شریف میں حضرت ایوبؑ کے واقعہ کو دیکھا ہوگا۔ اور انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین نظر سے گذرا ہوگا اور اسکے حسن قبول کے مژدہ سے بھی تمہاری آنکھیں واقف ہوئی ہونگی لیکن افسوس کہ اهلہ ومثلهم معهم نے تمہارے قلوب سنگی پر کچھ اثر نہ کیا۔ باوجود دعوے مسلمانی کے تمہاسے وجود۔ آواز قرآن سے مختلف تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم اپنے اس ظالمانہ طرز عمل سے باز آؤ۔ ظلم کاری سے ہاتھ دھوؤ۔ اپنی حالت نا پر رحم کھاؤ۔ اور خدا تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمت کو اپنے ظلم و تشدد سے آزاد۔ قید سے رہا اور ان کو اپنے ہر فعل میں مختار کردو۔ تمہارا یہ خیال محض غلط ہے کہ عورتیں مردوں سے ملکات ادبی میں کمزور ہیں۔ یورپ کی جدید تشریحی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو مہمات مرد سر کر سکتے ہیں ان کو عورتیں بھی باحسن وجوہ انجام دے سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرد ان ہی کی تربیت سے اس لائق ہوتے ہیں۔ جب زمین خراب ہوگی اور تربیت کرنے والیاں ناقص العقل ہوں گی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد کیسے کامل العقل ہو سکتے ہیں۔ تمہاری یہ محض جہالت ہے۔ نوح کے ہاں کنعان ممکن ہے لیکن کنعان کے ہاں نوح ممکن نہیں بنجر یلی و پتھریلی زمین ہرگز اچھے ثمر پیش نہیں کر سکتی۔ بلکہ بعض اوقات عمدہ زمین بھی ناقص بیل نمودار کرتی ہے۔ بس معلوم ہوا کہ عورتوں کی ناقص العقلی سے مرد نا قص العقل ہیں۔ یہ تمہاری کم ظرفی ہے کہ جس ہنڈیا میں کھاتے ہو اس میں سوراخ کرنے کی آغوش میں پرورش پاتے ہو۔ ان ہی پر باوجود اس علم کے

بہشت ماں کے قدم نیچے

ظلم و حکمرانی اپنا فخر یقین کرتے ہو۔ شدتِ غرور سے ان کے جذبات اور احساسات کو پامال کرتے ہو۔ قریب ہے کہ کفران نعمت کی پھٹکار تم کو ننا کر دے۔ تمہاری زندگیاں مٹ جائیں۔ اور تمہارے یہ ظالم وجود سینکڑوں من خاک کے نیچے دب کر مٹی ہو جائیں

اور اس مٹی کا مسکن بھی خدا تعالیٰ نافرمانی کی سزا میں جہنم بنا دے "الیس فی جہنم مثوی للمتکبرین"

تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم طبقۂ نسواں کو آزاد کر دو۔ اور اپنے دامن کو ظلم کے سیاہ دھبے سے پاک کرو۔

زاہد المودودی

جیسی آپ کی مرضی

اندازاً رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہونگے۔ گرمیوں کا موسم ہے آسمان پر اسوقت غضب کا نکھار ہے اسکی نیلگوں رنگت مغربی پری جمالوں کی نغیر سرگیں آنکھوں کا مقابلہ کرتی ہوئی نگاہوں میں کھُبی جاتی ہے۔ قمری مہینے کی ساتویں تاریخ نصف چاند ایک سیاہ رنگ لیے ہوئے ابر کے ٹکڑے سے آہستہ آہستہ نکل کر شبِ اول کی عروس چاردہ سالہ کے حجاب کا سماں دکھا رہا ہے جسکی روپہلی کرنیں ایک خوش جمال آئینہ رخسار کی اُن زلفوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں جو کچھ تو بکھر کر شعلہ عارض کی بلائیں لینے میں مصروف ہیں۔ کچھ شانوں کے ادھر اُدھر بل کھا رہی ہیں اور قدرتی شباب کے دلکش بہار کو اپنی آغوش میں لے کر اس بات کی دعویدار ہیں کہ ہم اس خزانۂ حُسن کے نگہبان ومحافظ ہیں جن سے بیگانہ نگاہیں دلچسپی لینے کے لیے خانۂ چشم سے مچل مچلکر بیتابانہ طور پر نکل رہی ہیں سیاہ سیاہ لمبے لمبے بالوں پر شعاع مہتاب کا اس ادائے دلفریب کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنا کچھ اس بلا کا نظارہ ہے کہ مچلے ہوئے مضطرب دل مشکل سے بھی قابو میں رہ سکتے ہیں جب ایک جنس لطیف کے نظارہ رکن کا یہ حال ہے تو مردانہ جذبات کا خدا معلوم کیا حشر ہوگا۔

اتنے میں کسی نے نہایت مہذب پیرایہ میں متانت کے ساتھ دریافت کیا۔ اچھا اب اجازت ہے۔ جس کے جواب میں کسی کے نازک نازک گلاب کی پتی سے ہونٹوں کو ایک خفیف سی جنبش ہوئی اور ایک دلکش ملائم آواز ہوا میں گونجتی ہوئی سُنائی دی۔ جیسی آپ کی مرضی۔

سُننے والے کم بخت کے خرمن دل پر اس رسیلی آواز نے بجلیاں گرا دیں۔ اور وہ مایوسی کے

ساتھ اپنا زخمی جگر تھام کر رہ گیا۔ منٹ بھر کا وقفہ نہایت ہی قلیل وقت گنا جاتا ہے۔ لیکن اس تھوڑی سی دیر میں بھی خدا جانے کتنے خیال اس مصیبت زدہ کے دل میں آئے اور گذر گئے۔

- اچھا۔ جیسی آپ کی مرضی۔

اِن فقروں میں الٰہی کس بلا کا قیامت خیز جادو بھرا ہوا ہے۔ کہ پہلو میں دل کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ خرمنِ صبر و قرار پر مایوسیوں کی بجلیاں کوند گئیں۔ کہنے والے ناز آفرین نازنین کی مایوسی، حسرت غم و اندوہ کے ساتھ اُس کی بیکسی اور بے بسی کی تصویر عبرت انگیز آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ ان لفظوں میں اللہ کس قیامت کا اثر پنہاں ہے۔ کہ سُننے والے کا چوٹ کھایا ہوا دل اُس کے قبضۂ اختیار سے نکل گیا۔ اور وہ نیرنگ خیال کے حیرت افزا طلسم میں پھنس کر اپنے دل ہی دل میں کہنے لگا۔

اچھا۔ جیسی آپ کی مرضی۔ اس کے کیا معنی ہوے۔ کیا کہیں یہ مطلب تو نہیں۔ کہ ہمیں آپ کی موجودگی کی ضرورت ہے اور آپ تشریف لیے جاتے ہیں۔ آپ کو گھر سے بغیر اطلاع کیے رات بھر رکھنا منظور نہیں ہے۔ لیکن اپنی بے کسی اور بے بسی کا خیال بھی اجازت نہیں دیتا کہ خوش دلی کے ساتھ آپ کو کہدیا جائے کہ بسم اللہ تشریف لیجائیے۔ بیشک یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ بے محل سر شام سے آدھی رات تک خاموش رہنے سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اندرونی تکالیف نے نازک دل کو پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن ابھی تک اسکا فیصلہ کرنے کے لیے ہماری نگاہِ دوربیں قاصر ہے کہ یہ تکلیفیں اندرونی جسمانی ہیں یا روحانی گو انسانی تشخیص دونوں کا صحیح اندازہ لگانے میں یقیناً معذور ہے لیکن پھر بھی چہرہ ترجمان دل ہوا کرتا ہے۔ جسمانی تکلیف تو حالت بار آوری کو مدنظر رکھتے ہوئے ظاہری طور پر محسوس ہونے کے قابل ہے لیکن طبیعت چونکہ تکلیف پسند واقع ہوئی ہے اس لیے عادات کا لحاظ رکھتے ہوے جسمانی تکلیف کا خیال زیادہ تشویش میں نہیں ڈالتا ہے اس لیے لامحالہ ثابت ہوتا ہے کہ روحانی خلش زخم جگر پر نشتر زنی کر رہی ہے جسنے مہر سکوت دہن پر لگا رکھی ہے۔ اور اس امر کو زیر نگاہ رکھتے ہوے بلا پس و پیش کیے ایک تجربہ کار کہہ سکتی ہے کہ جنس لطیف کے لیے سب سے زیادہ رنج دہ خیال جو دنیا بھر میں ہے وہ ایک مرد کی بیوفائی۔ لاپروائی اور اسی قبیل کی باتیں ہیں۔ غالباً یہ کہ ضرور اسی قسم کا خیال جانِ روح بنا ہوا ہے در حقیقت جنس لطیف کی دنیا میں سب سے زیادہ رنجدہ جو امر ہے۔ وہ ایک مرد کی بیوفائی ہے مرد اپنے زعم باطل میں آزادی پسند ہوتے ہیں۔ وہ عورتوں کے دلکش طبقہ کو نہایت ہی حقارت کی

نظروں سے دیکھتے ہیں۔ گو بغیر عورت کے ان کے تمام سامان عیش کے علاوہ دنیا بھی ان کو روکھی پھیکی نظر آتی ہے۔ لیکن بیجا غرور اور نخوت انکو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کبھی ٹھنڈے دل سے تھوڑی دیر بھی بیٹھ کر یہ سوچ لیں کہ جیسے گاڑی بغیر دو برابر کے پہیوں کے نہیں چل سکتی۔ اسیطرح دنیا کا کارخانہ بھی مرد اور عورت کے یکساں حقوق دیے بغیر نہیں چل سکتا۔

مغربی فلاسفر کہتے ہیں کہ جب عورت پیدا ہوئی۔ اسکی روح سادگی میں ملبوس تھی اور مرد کی رہنمائی اور مدد کی محتاج نہ تھی۔ نازک اندام تھی۔ نہ شوخ تھی نہ شرم میں غرق۔ اسکے رگ و ریشہ میں ملائمت اور راحت بھری تھی۔ تلون مزاجی اُس میں نام تک کو نہ تھی اور لالچ سے بالکل پاک تھی۔ مرد کی عقل کا چراغ تھی۔ اُس کی خواہشات نفسانی کا محض شکار نہ تھی۔ اسی نے مرد کو وحشی سے انسان بنایا اور اُسکی زندگی میں برکت کا بیج ڈالا۔ اسوقت دنیا میں اختلاف کی اتنی کشمکش نہ تھی بلکہ جوانی میں سرور اور بڑھاپے میں راحت تھی۔ جن مصائب کے نیچے دب کر مرد چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ عورتیں نہایت مستقل مزاجی صبر و شکیب سے اُسکو برداشت کرلیتی ہیں۔ بلکہ اُن میں ایک ایسی طاقت جرات اور اولوالعزمی پیدا ہو جاتی ہے کہ تمام مصیبتیں کافور ہو جاتی ہیں۔ جو عورتیں آسودگی کے عالم میں کمزور اور ناتواں خاوندوں کو وبال جاں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ایک عرصہ کے بعد شیر دل اور عالی حوصلہ بن جاتی ہیں اور جب اُن کے خاوند کسی مصیبت اور تکلیف کی وجہ سے شور و بکا کرتے ہیں یہ ان کو تسکین دیتی ہیں۔ اور صبر کی ہدایت کرتی ہیں۔ اپنی محبت اور بہار کی بیلیں ان کے گرد لپیٹ دیتی ہیں مرد کے جھکے ہوے سر کو اُٹھاتی ہیں اور پاش پاش شدہ دل کو ڈھارس بندھاتی ہیں۔

عورت مرد کا اعلے حصہ ہے۔ مرد جبتک شادی نہیں کرتا ادھورا رہتا ہے۔ عورت مجسم پاکیزگی ہے جس کی زیارت کے لیے مرد کو تو بہت بھیجتی ہے نیک مرد کے لیے بہشت ہے اور بد کے واسطے دوزخ۔ جسکے پاس جنس لطیف کا خزانہ نہیں وہ دنیا میں اپنا قرض ادا نہیں کرسکتا۔

عورت ایک سنہری فقرہ ہے جس کو جاسے خالق نے لکھا ہے اور اسکو فرشتے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور بیقدری صرف شیطان اور اُس کے لشکری کرسکتے ہیں فقط میری تحریر ذراسے غور کی محتاج ہے۔ ساری کیفیت عالم لطیف کی منکشف ہو جائے گی۔ ورنہ جیسی آپ کی مرضی۔

اُم یوسف۔ (دہلی)

جدید اکتشافات علمیہ

جو باتیں اب سے صدیوں پہلے ناممکن اور عقلاً محال خیال کی جاتی تھیں آج علوم وفنون کی ترقی کی بدولت اُن کا وجود و امکان عقول کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے"

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ درجہ بدرجہ علوم و فنون کی ترقی ہر عصر میں تحقیقات و اکتشافات کا ایک جداگانہ عالم دکھاتی رہی ہے لیکن موجودہ صدی کے حیرت انگیز اکتشافات و اختراعات نے حکمارِ سابق کی آراء اور علوم قدیمہ کی بنیاد کو اسقدر متزلزل کر دیا ہے کہ اب اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُن سے کسی تحقیقات میں قابلِ اطمینان مدد حاصل کی جا سکتی ہے اور اس بنار پر یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ تحقیقات جدیدہ اور اکتشافات حدیثہ نے علوم قدیمہ اور فلسفہ ماضیہ کو ساقط الاعتبار اور باطل کر دیا ہے"

اگرچہ ہمارے دعوے کا ثبوت موجودات عالم کے اُن آثار و خواص اور کیفیات موثرہ سے بخوبی ملتا ہے جن کی نسبت فلسفۂ قدیم اور حکمارِ سابق صحیح رائے نہ رکھتے تھے یا غلطی سے اُن کی قوتوں کا صحیح اندازہ کرنے سے پہلے وہ ایک غیر صائب رائے قائم کرکے فیصلہ قطعی کر چکے تھے اور آج وہی آثار و خواص اور کیفیات موثرہ کی تحقیقات کے خلاف کچھ کی کچھ ثابت ہو رہی ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں آج ایک ایسا مسئلہ پیش کریں جس کی نسبت موجودہ صدی میں بھی وہی رائے ہے جو اب سے صدیوں پہلے تھی یعنی درازی یا ادامت حیات ذی روح" تاکہ دعوے کا ثبوت معقول ہونے کے ساتھ ہی اکتشافات جدیدہ کے حیرت انگیز حالات کا علم بھی ہو جائے"

موجودہ صدی تک اکثر حکمار اور محققین کی رائے یہ رہی ہے کہ ہر ذی روح شے

ایک طبعی مدت رکھتی ہے کہ اُس کے بعد اُسکا قیام ناممکن ہے یعنی ہر ذی روح کی حیات فانی اور غیر قائم ہے اور عمر طبعی پر پہنچ کر وہ فنا ہو جاتی ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں کہ عمر طبعی پر پہنچنے کے بعد ذی روح کی حیات کو قائم رکھ سکے۔

ممکن ہے کہ اس مسئلہ میں کچھ لوگ اسکے خلاف بھی رائے رکھتے ہوں اور اپنے دعوے کا ثبوت پیش نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنی رائے پر قائم نہ رہے ہوں لیکن حال میں فلسفۂ قدیم کی اس رائے کے خلاف جرمنی کے ڈاکٹر جارج کلبنز نے اپنی برسوں کی تحقیقات کا نتیجہ ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر ذی روح کی حیات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے درازی حیات کے مسئلہ کے امکان پر سب سے پہلے توجہ کی اور اپنا پہلا تجربہ نباتات پر کیا اور ان کی عمر طبعی سے زیادہ نمو قائم رکھ کر تجربہ میں کامیابی حاصل کی۔

ڈاکٹر موصوف کی رائے ہے کہ اگر اس طریقہ سے جو انھوں نے درازی حیات کے لیے نکالا ہے کام لیا گیا اور تحقیقات مزید سے اس میں اضافہ کیا گیا اور درازیِ حیات کے آلات و قوی میں مناسب ترقی کی گئی تو یہ امر بہت آسان ہوگا کہ انسانی زندگی بڑھائی جا سکے۔

عالمِ نباتات

زمانۂ ارسطو سے یہ مسئلہ مسلم چلا آتا ہے کہ ہر اُگنے والی چیز یعنی نباتات ایک مدت طبعی رکھتی ہے جس میں اُسکی زندگی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں پہلے وہ زمین سے اُگتی ہے پھر نشو و نما ہوتا ہے اسکے بعد پھول و پھل آتے ہیں اور پھر موت اُسکا خاتمہ کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر جارج کلبنز نے اس اصول کو غلط ثابت کر کے دکھایا ہے کہ نباتات کا پیدا ہونا نشو و نما پانا پھول و پھل لانا ہر ایک درجہ میں اضافہ کیا جا سکتا اور عرصہ تک اُن کو باقی و قائم رکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے عرصۂ دراز کے تجربات و مشاہدات کے بعد نباتات کی ایک قسم جس کا نام "سایپرولینا مکستا" saprolegnia mixeta تھا اپنے تجربہ کے لیے انتخاب کیا یہ گھاس مردہ مکھیوں کی کھاد میں پیدا ہوتی ہے اور دو ہفتہ سے زیادہ سرسبز نہیں رہتی ڈاکٹر موصوف نے اس گھاس پر اپنا عمل شروع کیا اور اسمیں اسقدر قوت پیدا کی کہ چھ سال تک اسکو سرسبز و شاداب رکھا۔

اسکے علاوہ ڈاکٹر موصوف نے اور چیزوں پر بھی اپنے عمل کا تجربہ کیا اور بعض مرجھائی ہوئی اور خشک شدہ گھاسوں کو قوت عمل سے سرسبز و شاداب کر کے عرصہ تک اُن کو قائم و باقی رکھا۔

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اگر ذی روح کی اغذیہ حرارت رطوبت اور روشنی کی شرائط کو پورے طور پر بجا لایا جائے اور تحقیقات و تجربات کے موافق عمل کو جاری رکھا جائے تو ذی روح مخلوق مدت طبعی کے بعد عرصۂ دراز تک قائم و باقی رہ سکتی ہے لیکن مدت طبعی کے بعد توالد و تناسل کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اور مدت طبعی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

جن شرائط و اعمال اور آلات سے نباتات کی مدت زندگی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اگر اُن میں کسی قسم کا کوئی خلل واقع ہو جائے تو ڈاکٹر موصوف کی راے ہے کہ خلل کے نقصان کو دور کرنے کے لیے اُن وسائل و اسباب کو اختیار کیا جائے جو حفاظت نوع کے لیے طبعی طور پر مقرر ہیں ان اسباب و وسائل سے یہ خلل دور ہو جاتا ہے۔

ایک جاپانی ڈاکٹر نے جس کا نام "شیرتا شیرو" ہے ڈاکٹر جارج کلنبر کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھا کر ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے نباتات کے شعور و ادراک اور زندگی کا حال دریافت ہو جاتا ہے۔"

جاپانی ڈاکٹر اپنے آلہ کی قوت بڑھانے کی کوشش میں ہے اور چاہتا ہے

کہ اس میں اتنی قوت پیدا ہو جائے کہ انسانی زندگی کے اضافہ میں بھی کام آسکے۔

نبات اور حیوان

مذکورہ بالا سطروں سے معلوم ہوا ہوگا کہ ارسطو وغیرہ حکماء سابق اور فلسفۂ قدیم کی رائے موجودہ اکتشافات نے غلط و غیر صحیح ثابت کر دیں اب اسکے متعلق ایک اور مسئلہ یہ باقی رہ جاتا ہے کہ نباتات پر اگر اسکا تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور انکو عمر طبعی سے زیادہ قائم و برقرار رکھا گیا تو اس سے حیوانی زندگی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ اب تک یہ امر مسلّم چلا آتا ہے کہ حیوانات و نباتات کی زندگی اعمال آثار و خواص اور کیفیات میں فرق ہے اور دونوں کے اعمال و کیفیات کا فرق پہچاننا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اور اس صورت میں کہ باہمی تمیز کا کوئی طریقہ معلوم نہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ نباتات پر حیوانات کو قیاس کر لیا جائے اس مسئلہ پر ہندوستان کے مشہور ڈاکٹر بوس پروفیسر میڈیکل کالج کلکتہ نے اپنی عمر کے بہت سے حصہ میں غور و فکر کیا ہے اور آخر تجربات و مشاہدات نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ نباتات کے اعمال بھی مثل حیوانات کے اعمال کے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تحقیقات کو مضبوط و قابل اطمینان دلائل و ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ نباتات میں ایک مقدار کہربا کی پائی جاتی ہے جب کوئی جز کسی نبات کا کسی وجہ سے معطل ہو جائے یعنی اپنے فعل کو چھوڑ دے تو قوت کہربائی اسکو پھر اصلی حالت پر لے آتی ہے۔

ڈاکٹر بوس نے نباتات میں قوت کہربائی کا قیاس بہت سے وجوہ سے کیا ہے جیسے نباتات کا قانون و ضابطہ کے ساتھ سونا اور بعض بے حس کر دینے والی چیزوں سے متاثر ہونا وغیرہ بھی ہے۔

بعض درختوں کو ڈاکٹر بوس نے دیکھا کہ ان کا نشو و نما دیر سے ہوتا ہے اس قسم کے درختوں پر ڈاکٹر موصوف نے قوت کہربائی کے ذریعہ اپنا عمل کیا اور تجربہ سے

معلوم ہوا کہ اُن کے نشو و نما کی رفتار بہت کچھ بڑھ گئی ہے اور اُن میں صلاحیت قبول بھی پیدا ہوگئی ہے۔

غرض ڈاکٹر بوس نے اس مسئلہ کو بھی اپنی تحقیقات سے صاف کر دیا ہے کہ حیوانات اور نباتات اپنے اکثر اعمال و کیفیات کے لحاظ سے یکساں ہیں اور جن اشیاء کا عمل نباتات پر کارگر ہو سکتا ہے حیوانات بھی اُن سے متاثر ہو سکتے ہیں اور اس بنا پر محققین یورپ اس رائے سے متفق ہوتے جاتے ہیں کہ ڈاکٹر جارج کلبنر اور ڈاکٹر شیر و تاشیر کی نباتات پر درازیِ حیات میں کامیابی اس امر کی ضامن ہے کہ ہر ذی روح کی درازی حیات میں کامیابی حاصل کی جائے۔

بعض محققین یورپ کی رائے ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر جارج کلبنر اور ڈاکٹر شیر و تاشیر نے درازی حیات نباتات میں کامیابی حاصل کر کے ہر ذی روح کی حیات کی درازی کو ممکن بنا دیا ہے لیکن نباتات اور حیوانات کے مدارِ حیات میں جسقدر بھی فرق پایا جاتا ہے اُسکو پیش نظر رکھتے ہوئے ابھی اس امکان میں بعض دقتیں ضرور پیش آئیں گی اور ان دقتوں اور مشکلات پر غالب آ جانے کے بعد ہر ذی روح کی درازی حیات کا مسئلہ حل اور صاف ہو جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ ڈاکٹر جارج کلبنر، ڈاکٹر شیر و تاشیر اور ڈاکٹر بوس کی تحقیقات اور تجربات نے درازی حیات کے مسئلہ کو کسی قدر حل ضرور کر دیا ہے اور بعض نباتات کی درازی حیات سے اس اہم مسئلہ کی بنیاد پڑ چکی ہے لیکن ابھی وہ وقت دور معلوم ہوتا ہے جبکہ ہر ذی روح کی حیات کی درازی کے حل کا مسئلہ امکان سے وجود میں آجائے اسلیے امکانی پہلو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ڈاکٹر جارج کلبنر وغیرہ نے اس مسئلہ پر غور و فکر کیا اور جن آلات سے نباتات کی درازیِ حیات کو ممکن بنا دیا ہے اُن میں مناسب ترمیم و اصلاح اور ترقی کی گئی تو ہر پہلو سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اگر اس موقع پر علم تصوف کی اُن قوتوں اور روحانی طاقتوں کا ذکر کیا جائے جن سے یہ مسئلہ اب سے بہت پہلے حل ہو چکا ہے اور جس کے نظائر کی کثرت شائبہ ریب وشک باقی نہیں رکھتی تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ جن آلات اور قوتوں سے آج ڈاکٹر جارج کلبر اور ڈاکٹر شیرو تا شیر خارجی طریقہ پر کام لے رہے ہیں اُن سے زیادہ قوی طاقتوں سے حاملان تصوف روحانی طور پر کام لیتے تھے اور مدتوں اس عمل سے حیات انسانی کو قائم و برقرار رکھتے تھے۔

یہ امر مسلم ہے کہ انسانی اعضاء و جوارح اور اجزار جسم میں ایسے بعض اجزار بھی ہیں جن کا اثر اندرونی یا روحانی طور پر دوسرے جسموں میں بغیر حلول ومس کیے ہوئے پہنچ سکتا ہے۔ یہی وہ اجزار ہیں جو بعض انسانوں میں بعض روحانی ریاضتوں سے زیادہ قوی ہو جاتے ہیں اور ان سے بعض فوق العادت کام لیے جا سکتے ہیں درازیِ حیات میں عموماً اسی قوت سے کام لیا جاتا تھا اور اب بھی لیا جا سکتا ہے لیکن اسکے لیے وہ روحانی ریاضتیں تقریباً ناممکن ہیں جو اب سے پہلے حاملان تصوف کرتے تھے۔

بہرحال جو بات اسلام کے اک گروہ نے اپنی روحانی طاقتوں سے حاصل کی تھی اب وہ عرصۂ دراز کے بعد خارجی آلات و اثرات سے اُنھیں اصول پر ممکن بنائی جا رہی ہے اور یہ خیال ایک حد تک قابل تسلیم ہے کہ یہ امکان ضرور عملی معنے میں وجود پذیر ہوگا

آغا رفیق (بلند شہری)

سروجنی نائڈو

ہندوستان نے گذشتہ زمانہ میں بہت سے کاملین پیدا کیے۔ وہ لوگ شہرت کی دنیا میں چاند وسورج بن کر چمکے۔ مگر جس طرح اصل چاند اور سورج کو قانون قدرت کے مسلمہ قواعد کے مطابق طلوع۔ عروج کے بعد غروب کی منزل طے کرنا لازمی ہے اسی طرح وہ لوگ بھی غروب ہوگئے۔ ہندوستان جس نے ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ کاملین پیدا کیے آج اس گئے گذرے زمانہ میں بھی کچھ لوگوں کو اپنی آغوش میں پالنے کا فخر کرسکتا ہے۔

سروجنی نائڈو بھی ہندوستان کے اُن قابل لوگوں میں سے ہیں جن پر مادرہند کو بجا طور پر ناز ہوسکتا ہے۔ سروجنی نائڈو کی شہرت آج اگر ہندوستان میں واحد قابل فخر انگریزی شاعرہ اور ایک محب وطن مصلح خاتون کی حیثیت سے ہے جس نے اپنی زندگی کا مقصد ہندوستان کے فرزندوں اور دختروں کی بہبودی قرار دیا ہے تو سروجنی نائڈو بیرونی ہندوستان اور خصوصیت کے ساتھ انگلستان اور اُن مقامات میں جہاں انگریزی سمجھی جاتی ہے بلند تخیل رکھنے والی مشرقی جذبات کی انگریزی زبان میں ترجمانی کرنے والی شاعرہ کی حیثیت سے مشہور رہے۔

ہندوستان نے اس وقت تک دو ممتاز انگریزی شاعر پیدا کیے ہیں جو دونوں عورتیں ہیں جن میں سے ایک مس تورودت آنجہانی تھیں اور ایک دوسری خاتون جو اُن سے بھی گوے سبقت لے گئی ہیں مسز نائڈو ہیں۔ آپ ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو بمقام حیدرآباد پیدا ہوئیں آپ کے والد ماجد ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادیائے برہمن گام (مشرقی بنگال) کے چٹرجیوں کے مشہور برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کے آباؤ اجداد علوم سنسکرت اور ویدک کی تعلیم میں خاص طور پر ممتاز سمجھے جاتے تھے

ڈاکٹر چٹوپادیائے نے ایڈنبرا یونیورسٹی سے ۱۸۷۷ء میں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری حاصل کی اور ولایت سے واپس آکر نظام کالج کی بنیاد ڈالی۔ سروجنی چٹوپادیائے ڈاکٹر مذکور کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں۔ آپ بچپنے ہی سے بہت تیز طبیعت ذکی و ذہین واقع ہوئی ہیں اور شاعرانہ جذبہ آپ کو قدرت نے ازل سے ودیعت کر دیا تھا جس کو آپ کے والد بزرگوار بھی باوجود کوشش کے دبا نہ سکے۔ اس واقعہ کے متعلق مسز نائڈو نے خود تحریر فرمایا ہے کہ میرے والد کی یہ خواہش تھی کہ میں علم ریاضی اور سائنس کی ماہر بنوں۔" قابل فخر سروجنی نے جو آج دنیا میں سروجنی نائڈو کے نام سے مشہور ہیں ۱۲ برس کی عمر میں مدراس یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور لوگوں پر اپنی ذکاوت کا سکہ بٹھا دیا۔ بہت سے لوگوں کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ میٹریکولیشن پاس کرنے سے قبل ہی آپ کا شاعرانہ جذبہ نمایاں ہو گیا تھا۔ آپ اپنے ایک خط میں جو آپ کے مجموعۂ نظم "گولڈن تھرشہولڈ" کے دیباچہ میں چھپا ہے جو دیباچہ آرتھر سمنس کے زور قلم کا نتیجہ ہے لکھتی ہیں "ایک روز جب کہ میں ۱۱ برس کی عمر کی تھی جبر و مقابلہ کا ایک سوال حل کر رہی تھی مگر سوال حل ہونا تھا نہ ہوا اور اس کی جگہ ۱۳۰۰ سطروں (مصرعوں) کی ایک نظم عالم وجود میں آگئی" یقیناً سروجنی نائڈو کو اس وقت سوال کے حل نہ ہونے سے افسوس ہوا ہوگا مگر آج شاید وہ بھی اس سوال کے حل نہ ہونے سے بہت خوش ہوں گی کون جانتا تھا کہ ۱۱ برس کی بچی کے شاعرانہ جذبات ایک سوال کے حل نہ ہونے سے بیدار ہو جائیں گے اور پھر وہ اس کی آیندہ زندگی کو شاعرانہ زندگی اور قابل فخر شاعرانہ زندگی بنا دیں گے۔ آپ کی عمر زیادہ برس سے بھی کچھ کم ہی ہوگی جبکہ آپ کی آیندہ زندگی کی ایک اہم منزل نے وقت طلب صورت اختیار کر لی۔ یعنی یہ کہ ڈاکٹر گوندہ راجولا نائڈو جو آگے چل کر آپ کے خاوند ہوئے گو ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر برہمن نہیں ہیں اور اس سبب سے سروجنی چٹوپادیائے کو سروجنی نائڈو بننے کے لیے

کچھ دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مس سروجنی کو ۱۸۹۵ء میں ولایت اُن کی مرضی کے خلاف ریاست حیدر آباد سے وظیفہ حاصل کرکے بھیجدیا گیا۔ ۱۸۹۸ء تک وہ ولایت میں رہیں کنگس کالج لندن اور اُسکے بعد گرٹن میں تعلیم پاتی رہیں ۱۸۹۸ء میں آپ کی صحت خراب ہوئی اور ہندوستان واپس آئیں۔ ہندوستان میں آنے کے بعد آپ نے ڈاکٹر نائڈو سے جو اڈنبرا یونیورسٹی کے ایم۔ بی۔ سی۔ ایم ہیں شادی کرلی۔ اُس وقت یہ ایک بڑی جسارت کا کام تھا کیونکہ اُس زمانہ تک ذات پات کی مشکلات اتنی کم نہیں ہوئیں تھیں جتنی اب کم ہیں۔ جس زمانہ میں آپ ولایت میں تھیں اُس وقت آپ کئی مرتبہ اٹلی بھی گئیں اور اٹلی کا ملک آپ کو بہت پسند آیا۔ اپنے خطوط میں اٹلی کی بہت تعریف کی ہے۔ جس وقت آپ پہلی مرتبہ تعلیم کی غرض سے ولایت گئیں اُس وقت آپ خاصی شہرت حاصل کرچکی تھیں کئی نظموں کے علاوہ ایک ڈراما کی مصنف تھیں آپ کی اُس وقت کی حالت کے متعلق ایڈمنڈ گاس نے جنکو سروجنی نائڈو نے اپنی شاعری کی موجودہ روش پر ڈالنے والا قرار دیا ہے اور جنھوں نے آپ کی نظموں کے دوسرے مجموعہ "برڈ آف ٹائم" (وقت کا پرند) کا دیباچہ لکھا ہے یوں بیان کیا ہے کہ "جسوقت سروجنی چٹوپادھیا ولایت آئیں تو وہ ۱۶ برس کی لڑکی تھیں مگر انگریزی لڑکیوں سے وہ اسیقدر مختلف تھیں جسقدر ایک سوسن کا پھول ناگ پھنی سے۔ اُن کی دماغی پختگی حیرت انگیز تھی مطالعہ غضب کا تھا اور دنیا کی معلومات میں مغربی لڑکیوں سے بدرجہا افضل تھیں" لندن پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ مسٹر ایڈمنڈ گاس کے خاندان میں متعارف ہوئیں اور زیادہ عرصہ تک مسٹر گاس سے اپنی شاعری کو چھپا نہ سکیں۔ سروجنی نائڈو کی شاعری میں تغیر پیدا ہونے کے واقعہ کو خود مسٹر گاس نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مسٹر گاس نے اُن سے کہا "ہم دیکھنا

چاہتا ہوں کہ آپ نے کیا لکھا ہے" اسپر ایک بنڈل اُن کے سپرد کر دیا گیا جس کو دیکھکر اُنھیں مایوسی ہوئی۔ گو وہ کلام شاعرانہ غلطیوں سے پاک تھا مگر اُس کی بنیاد مغربی خیالات اور ٹینیسن اور شیلے کی روش پر تھی اور اُس میں عیسائیت کی جھلک بھی موجود تھی اُسے دیکھکر آپ نے ہدایت کی کہ آپ مشرقی خیالات مشرقی جذبات مشرقی مناظر کو لکھا کریں پھولوں درختوں کو بیان کریں اور انگریزی زبان میں ہندوستان اور اپنے صوبہ کو پیش کریں جس سے لوگ یہاں واقف نہیں ہیں یعنی آپ کو دکن کی ایک حقیقی شاعرہ بننا چاہیئے"۔ مسٹر گاس نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "سروجنی چٹا پادیا نے میری رائے مان لی اور اُسکے بعد غالباً ایک حرف بھی پرانی روش پر نہ لکھا"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سروجنی نائڈو انگلستان میں جس نظر سے دیکھی جاتی ہیں اُس کا حال ذیل کے اُن خیالات سے ظاہر ہوگا جو انگلستان کے اخبارات نے آپ کی نظموں کے پہلے مجموعہ پر ظاہر کیے ہیں۔

"سروجنی نائڈو کے شاعرانہ مشرقی مضامین اور نظموں کو میں سب سے بہتر خیال کرتا ہوں اس چھوٹی سی کتاب سے مجھے امید ہے کہ اُن معترضین کی زبان بند ہو جائے گی جو کہتے ہیں کہ عورت شاعری نہیں کر سکتی" ریویو آف ریویوز

"اُن کے اشعار خود زبان حال سے نغمہ سرائی کرتے ہیں اور ہر شعر میں جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے ہیں اس موقع پر مغربی اور مشرقی تمدن کا اتحاد بُرا نہیں رہا اُس نے شاعرہ کو نئی آنکھیں بخش دیں جنکی بدولت وہ پرانی چیزوں کو ایک نئے عالم میں دیکھ سکی اسکا نتیجہ ایسا عجیب ہے کہ جسے ہم نظم کہنے سے باز نہیں رہ سکتے" ٹائمس

سروجنی نائڈو ایک فصیح و بلیغ مقرر بھی ہیں اور ایک سوشیل ریفارمر بھی۔ آپ اپنی صنف کا درد غایت درجہ اپنے دل میں رکھتی ہیں جن لوگوں نے آپ کو کبھی تقریر کرتے سنا ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس قدر مادر ہند کی محبت رکھتی ہیں اور کن کن طریقوں سے وطن کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کی کوئی تقریر حب وطن۔ خدمت صنف لطیف کے موضوع سے خالی نہیں ہوتی

آپ نے ہندوستان کے سیاسی سوشیل پلیٹ فارموں پر اکثر تقریریں کی ہیں جس وقت آپ تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں اُسوقت آپ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور بلا مبالغہ ہر سُننے والے کو وجد پیدا کرادیتی ہے۔ آپ کا طرزِ تقریر نہایت دل آویز اور شیریں ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خدا اور شاعر نظم کو منضبط کر کے اچھے لوگوں تک پہنچانے کا کام کر رہا ہے۔ درد۔ جوش محبت ہمدردی یہ ایسی باتیں ہیں جو آپ کی تقریر کا نمایاں جزو ہیں۔ بڑے سے بڑا مجمع آپ کی تقریر کے وقت اس حالت میں ہوتا ہے کہ گویا ہر شخص کی روح پر کسی دوسرے کا قبضہ ہے اور تقریر کرنے والے کی روح خود اسکے قبضہ میں نہیں ہے بلکہ کوئی نامعلوم قوت اُس سے تقریر کرا رہی ہے۔ ہندوستان میں اسوقت بہت سے انگریزی زبان کے مقرر ہیں مگر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایک شخص کی تقریر کو قدرت نے وہ دل آویزی نہیں بخشی جو مسز نائڈو کے حصہ میں آئی ہے آپ کی حرکات و سکنات سے شاعری ٹپکتی ہے ہر لفظ شاعرانہ جذبہ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ سروجنی نائڈو کسی دوسرے وقت سے زیادہ تقریر کرتے وقت شاعرہ اور مجسم شاعرہ معلوم ہوتی ہیں شاعری اور حسن سے آپ کی محبت کا صحیح علم اُسوقت ہو سکتا ہے جب کوئی شخص آپ کو تقریر کرتے وقت دیکھے۔ معلومات کا دائرہ نہایت وسیع ہے اُردو فارسی اور اُسکی شاعری کا مذاق سلیم آپ میں پایا جاتا ہے اسکی ایک مثال ہم ایک واقعہ کو پیش کر کے دیتے ہیں۔

ایک نازک شاخ پر گلاب کا ایک دل آویز پھول ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہا ہے۔ اُس پھول میں سے شاعرانہ نغمے پیدا ہو رہے ہیں اور لوگوں کے دلوں کو مسخر کر رہے ہیں۔ نغمے آدھ گھنٹے سے جاری ہیں۔ نغموں کے تسلسل میں کچھ خرابی واقع نہیں ہوئی مگر کچھ طرز بدلا اور لوگوں نے اس شعر کو سنا ؎

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بسے　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس شعر کے بعد پھر نغموں کا سلسلہ شروع ہوگیا لوگ شعر، مقرر اور تقریر کے اثر میں ڈوب گئے تقریر کے اختتام پر اسلام کے بعض احکام کا حوالہ دیا گیا اُسکے بعد مسز نائڈو اپنی کرسی پر متمکن ہوگئیں۔ یہ تقریر آل انڈیا مسلم لیگ کے گذشتہ اجلاس میں کی گئی تھی ہم طوالت کی وجہ سے اس مضمون کو مجبوراً ختم کرتے ہیں اگر ممکن ہوا تو آیندہ مسز نائڈو کی شاعرانہ زندگی پر کچھ لکھیں گے۔

ایک معرف

تلاشِ عیش

(سلسلے کے لیے جون نمبر ملاحظہ ہو)

حسینہ ہفتوں اسی دُھن میں رہی کہ کس طرح تھیٹر جاؤں۔ آخرکار جوئندہ یابندہ ایک موقع اسے مل ہی گیا۔ مولوی صاحب اپنے پیر و مرشد کے پاس ایک روز الہ آباد گئے۔ مولانا صاحب قبلہ کی طبیعت کچھ ناساز ہوگئی تھی جسکی اطلاع بذریعہ تار مولوی فخرالدین صاحب کو بھی کی گئی تھی۔ اسی قسم کی اطلاعیں مولانا کی جانب سے ان کے تمام ذی عزت مریدوں کو کردی جاتی تھیں اگرچہ مولانا صاحب خود اپنے کو اس کا ذمہ دار نہیں قرار دیتے تھے بلکہ جب مرید ایک ایک کرکے پہنچتے تو ان پر مولانا برہم ہوتے کہ تم لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر کیوں آئے اور اطلاع کا الزام میاں انیس احمد کے سر تھپتا کہ فرط محبت اور بیوقوفی کی وجہ سے انھوں نے تار دیے۔ اور بیچارے انیس احمد بھی ایسے اہل جنت کہ یہ سمجھ لیتے کہ مجھ ہی سے بیوقوفی ہوئی دنیا میں ایسے پاک نفوس کثرت سے موجود ہیں جو دوسروں کے اشاروں سے کوئی کام کرتے ہیں اور اس کام پر جب الزام بیوقوفی دہی صاحب لگاتے ہیں جنکے ایما سے وہ کام ہوا تو بغیر چون و چرا کیے اپنی حماقت کے قائل ہوجاتے ہیں۔ یہ ہی برگزیدہ ذاتیں ہیں جو ذہین اور تیز دماغ والوں کو مکار اور فریبی بننے کی ترغیب دیتی ہیں اور بغیر جانے ہوئے انکی معین اور مددگار ہو جاتی ہیں سچ ہے کہ کمزوری اور بے وقوفی دنیا کے لیے اس معنی میں ایک بڑی مصیبت ہے کہ تو ہونکے اصلی اخلاق اس سے مٹ جاتے ہیں۔ دغا فریب ظلم و تعدی اسی طرح کی بداخلاقی ہے جیسے حرام کاری جو بذریعہ بدفعل عورتوں کے عمل میں آتی ہے۔ جس طرح ایک بدفعل عورت کسی مرد کو حرام کار بناتی ہے اسی طرح ایک بے عقل آدمی ایک ذی عقل کو

دغا باز اور ایک کمزور دوسرے طاقتور آدمی کو ظالم بنا دیتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر حکومت اسی وجہ سے کرتی ہے۔ ورنہ اعلےٰ اخلاق کے یہ بالکل منافی ہے۔

بہرحال حسینہ کو موقع ملا اور اس نے پورا فائدہ اس سے اُٹھایا نصیبن کے لڑکے کے ذریعہ سے گاڑی منگائی گئی۔ گاڑی کی چھت پر وہ بیٹھا اور گاڑی کے اندر حسینہ اور نصیبن بیٹھ کے روانہ ہوئیں۔ حسینہ کے خوف کی یہ حالت تھی کہ راستہ میں جو بڈھا آدمی نظر آتا تھا اسکو یکایک یہ ہی خیال ہوتا تھا کہ میرا شوہر ہے۔ لرزتی اور کانپتی ہوئی حسینہ تھیٹر پہنچی۔ نصیبن کے لڑکے نے ٹکٹ لاکے دیے اور زنانہ درجہ کے دروازہ تک دونوں عورتوں کو پہنچا کر واپس آیا اور چار آنہ والے درجہ میں اس طرح جا کے بیٹھا جیسے کوئی اپنے گھر میں آکے بیٹھتا ہے۔

حسینہ جس وقت پہنچی ہے اس وقت تک تماشہ شروع نہیں ہوا تھا پردہ پڑا ہوا تھا۔ روشنی سے پورا تھیٹر جگمگا رہا تھا۔ دبی آوازوں سے لوگ باتیں کر رہے تھے۔ کوئی ہنستا تھا کوئی مسکراتا۔ ہر شخص کے چہرہ پر خوشی اور بشاشتی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ دنیا کا وہ حصہ ہے جہاں غم و فکر کا دخل نہیں ہے۔ حسینہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس منظر کو دیکھنا شروع کیا اور دل میں خیال کرنے لگی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایسی خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنے میں ایک پارسی دو لیڈیوں کو ساتھ لے کے آرکسٹرا میں آیا اور اپنی ریزرو کی ہوئی سوفا پر بیٹھ گیا۔ دونوں جوان عورتیں خوش دلی اور مسرت کی زندہ تصویریں تھیں۔ حسینہ کی نگاہیں انکے چہروں پر گڑ گئیں تھوڑی دیر تک اسی طرح انکی صورت دیکھا کی اس کے بعد ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔ ایک خوش پوشاک اور حسین عورت اسکے پاس بیٹھی تھی حسینہ کی حیرت زدہ صورت دیکھکر اس نے دریافت کیا "کیا آپ پہلی مرتبہ تھیٹر آئی ہیں"

حسینہ - جی ہاں اس سے پہلے میں کبھی نہیں آئی - دیکھیے کیسی چہل پہل اور لطف کی جگہ ہے۔

عورت - لطف کے واسطے تو لوگ یہاں آتے ہی ہیں۔ آج تماشہ بھی بہت اچھا ہے۔ اچھا کیا آپ نے جو آج آئیں۔ آپ کے صاحب بھی آئے ہوں گے۔ میرے صاحب تو (اشارہ کرکے) وہ بیٹھے ہیں۔

حسینہ - تو کیا آپ اپنے میاں کے ساتھ آئیں

عورت - میں سیکڑوں دفعہ آچکی ہوں۔ مگر ان کے ساتھ ہی آتی ہوں مجھے اکیلے آتے اچھا نہیں لگتا، مجھے یہی خیال آتا ہے کہ میں یہاں چلی آؤں گی تو وہ اکیلے گھر میں رہیں گے دل گھبرائے گا۔

اسکے ساتھ ایک دوسری عورت بھی تھی وہ بولی "ڈرتی ہو گی کہ اکیلے گھر میں بیٹھ کے کوئی گل نہ کھلائیں"

عورت - نہیں خدا کی قسم ان کی طرف سے مجھے بالکل اطمینان ہے ان باتوں کا دل میں خیال بھی نہیں۔

حسینہ کا دل اس نسوانی خیال سے بالکل ہی پاک تھا اس لیے اس جملہ پر مسکراہٹ تک نہ آئی۔ پہلی عورت نے اپنے سوال کو پھر دُہرایا۔

"آپ کے میاں کون سے ہیں"

حسینہ :- (کچھ ٹھہر کے) وہ میرے ساتھ نہیں آئے ہیں۔

دوسری عورت :- تو آپ کو بھی اپنے میاں کی طرف سے ہماری بہن کی طرح بالکل اطمینان ہے۔

حسینہ :- اطمینان کس بات کا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھنٹی بجی اور پردہ اُٹھا۔ حسینہ کی نظر کے سامنے

یکایک وہ سماپیش ہوگیا جس کا خیال دماغ میں وہ قائم کرہی نہیں سکتی تھی -
بے اختیار کرسی پرسے بالشت دو بالشت اونچی ہوگئی - اسی بے اختیاری میں
منھ سے نکل گیا " اہاہاہا " اور اتنی زور سے کہ نیچے سے بہت سے مرد اوپر دیکھنے لگے -

پہلی عورت :- اے ہے آپ تو بچوں کی طرح خوش ہورہی ہیں - دیکھیے سب
لوگ آپ کی آواز سے اوپر دیکھنے لگے -

حسینہ شرما کے چپکی بیٹھ گئی -

تھیٹر میں تماشا " حُسن کی دیوی " کا تھا - اس تماشہ کو نیشنل تھیٹریکل کمپنی نہایت
سازو سامان کے ساتھ اسٹیج پر لائی تھی - اسکو کامیاب بنانے میں کمپنی نے کوئی دقیقہ
اُٹھا نہ رکھا تھا - صرف کثیر سے تمام سامان و پوشاک مہیا کی گئی تھی اور ملک کے استاد
ایکٹروں کے سپرد ہر ایک پارٹ کیا گیا تھا - دربار حرام آباد کا سین جسکو دیکھ کے
حسینہ کے مُنھ سے بے اختیار آہاہاہا نکل گئی تھی واقعی ایسا تھا کہ یکایک دیکھنے
سے آنکھوں میں چکا چوند ہو جائے - اسکے ساتھ پھر ایک دلکش نغمہ اور دلفریب رقص
یہ سب چیزیں ایسی تھیں کہ انسان کی طبیعت اپنی اصلی حالت میں قائم نہیں رہ سکتی
اور خاص کر اسکی جس نے پہلے پہل تھیٹر میں قدم رکھا ہو - حسینہ شروع سے آخر تک
محو حیرت رہی اور جو کچھ دیکھتی اور سنتی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ جزو روح ہو رہا ہے - آخری
سین جسمیں " حُسن کی دیوی " نے رقص شروع کیا ہے ایسا تھا کہ پوری تماشا گاہ کو رقص
میں لے آیا - کوئی اپنی حالت میں نہ تھا ہر شخص کے عضو عضو پھڑکنے لگے - حسینہ کی
تو یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا ابھی کود کے اسٹیج پر چلی جائے گی اور ناچ میں شریک
ہو جائے گی - یہ بیتابانہ حالت پیدا کر کے یکایک بھیرویں میں " حُسن کی دیوی " نے
جب یہ چیز شروع کی " بہت سہی تو ری گاری - کنہیا - اب نا سہونگی " تو پورا
مجمع بیچین ہوگیا اور ٹیس پڑ گئی - تماشہ میں یہ رقص و سرود جذبات کا بڑا نا لا تھا

لیکن دکھلایا یہ گیا تھا کہ نواب حرام آباد میں سوائے حس شہوانی پیدا ہونے کے کسی اور قسم کا حس نہ پیدا ہوا۔ کثرت تعیش میں احساسات میں امتیاز باقی نہیں رہتا ہر ایک ایک ہی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ آخر میں جب نواب نے "حسن کی دیوی" کو بلا کے گلے سے لپٹانا چاہا اور اس نے نواب کے پہلو میں خنجر مارا ہے اُسوقت ایک عجیب قسم کا جوش و خروش تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ لوگ زمین کی سطح پر نہیں بلکہ اس سے مرتفع کوئی سطح ہے وہاں کھڑے ہیں اور وہی "حسن کی دیوی" انکو گھسیٹ کے وہاں لے گئی ہے اسی کے بعد ہی یکایک ڈراپ سین گر جانے سے سناٹا اور ہو کا عالم ہو گیا۔

حسینہ جب گھر واپس گئی ہے تو گاڑی میں برابر یہی چیز گن گنا رہی تھی "بہت سہی توری گاری" رات کو خواب میں بھی اُسے یہی تماشا دکھلائی دیا دن کو چلتے اُٹھتے یہی چیز بے اختیار اسکے مُنہ سے نکلتی تھی۔ اصلی دُھن کی نقل تو اس نے مکمل طور پر اُتار لی تھی البتہ تان اور پلٹا گلے سے نہ نکل سکتا تھا۔ تماشہ کے بہت سے جملے بہت سے گیت اُسے از بر ہو گئے تھے اور دن بھر بیٹھی اُنھیں دُہرایا کرتی تھی۔

مولوی صاحب جب آ لیے ہیں تو ایک روز اس نے ایک خط بلقیس کو لکھا جسمیں تفصیل سے اپنے تھیٹر جانے کا واقعہ بیان کیا اور شروع سے آخر تک تماشے کی کیفیت لکھی آخر میں لکھا کہ اگر تم نے اس تماشے کو ابتک نہ دیکھا ہو تو ضرور دیکھو۔ بلقیس کو جس روز یہ خط ملا ہے اسی روز رات کو وہ تماشا دیکھکر آئی تھی اور اسپر اس درجہ اسکا اثر تھا کہ وہ خیال کرتی تھی کہ اسکی زندگی میں اسکی وجہ سے بہت بڑا انقلاب ہو جائے گا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ جس روز یہ تماشا ہوگا میں تھیٹر ضرور جاؤں گی۔ چنانچہ حسینہ کے خط کے جواب میں اس نے اپنے دل کی کیفیت من و عن بیان کی آخر میں یہ لکھا "افسوس ہے کہ مجھے گانا نہیں آتا نہیں تو تمھاری طرح اس تماشے کے بہت سے گیت میں بھی

یاد کر لیتی اور گا کے اپنا دل خوش کرتی۔ تمنے تو نقل اُتاری ہوگی کیا اچھا ہوتا کہ تمہارے گلے سے بھی وہ چیزیں سُنتی۔ میں تو کہتی ہوں کہ تمہاری آواز اس گانیوالی سے بہتر ہے۔ تمہارا نام بھی حسینہ ہے اور حسین ہو بھی تم اگر حُسن کی دیوی بن کر آئیں تو محشر برپا کر دیتیں مگر تم میں لڑکپن اور ہلکاپن بہت ہے حُسن کی دیوی بننے کے واسطے گہرے پن اور بردباری کی بھی ضرورت ہے کیونکہ وہ صرف عمدہ ناچنے گانیوالی نہیں ہے بلکہ اسی ناچنے گانے کو اپنے اعلےٰ مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ بناتی ہے۔ کاش ایسی عورتیں اور بہت سی ہوتیں ۔۔

اس خط کا حسینہ پر یہ اثر ہوا کہ اسکا بے اختیار دل چاہنے لگا کہ میں اسٹیج پر جا کے گاتی اور لوگوں کو بیتاب کرتی جس طرح مس فیروزہ جو حُسن کی دیوی بنی تھی ایک خاص ادا کے ساتھ اسٹیج پر آتی تھی اور اسکے ظاہر ہونے پر ایک شور و غل مچ جاتا تھا اور اسکے ہر گیت اور ہر حرکت پر تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوتے تھے اسیطرح میں بھی جب اسٹیج پر آؤں تو لوگ تڑپ جائیں اور اسٹیج پر ریشمی رومالوں گلدستوں اور پھولوں کا انبار لگ جائے مس فیروزہ تو ایسی خوبصورت بھی نہیں ہے میں اس سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ بلقیس نے سچ کہا میری آواز اس سے بہت اچھی ہے میں تھیٹر کے واسطے بنی تھی اس قفس میں میری مٹی خراب ہوئی۔ بلقیس نے ایک دن خوب بات کہی تھی۔ دنیا میں اصل جو خرابی ہے وہ یہ کہ جو جس چیز کا اہل ہے وہ اسکو نہیں ملتی۔ حسینہ مولوی فخرالدین کی بیوی بنے واہ کیا جوڑ ہے۔ کہاں حسینہ کہاں نگوڑے مولوی دنیا کمبخت اندھی ہے بے جوڑ کپڑا پہن لو تو نکتہ چینی کرتی ہے۔ بے جوڑ رشتہ کو دیکھ کے چُپ ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ زبردستی اس رشتہ کو تُڑوا دے۔ دوڑ کے بڑے آئینہ کے پاس گئی اور سر سے پیر تک اپنے کو غور سے دیکھا سڑی پن جو سوجھا تو آئینہ میں اپنے کو پیار کر لیا۔ وہاں سے گاتی ہوئی واپس آئی وہی دُکندھیا۔ اب

نا سهوں گی"

حسینہ اسوقت ایسی محو اور مست تھی کہ کسی طرف کچھ نہ دیکھا۔ مولوی صاحب اندر آ گئے تھے آئینہ کا پیار کرنا بھی دیکھا اور گاتے ہوئے واپس آنا بھی کوئی دوسرا ہوتا جسکے دل میں ایک قطرہ بھی خون کا ہوتا وہ اس وقت اپنے کو حسینہ کے اوپر سے نثار کر دیتا مگر مولوی صاحب کا دل بالکل سوکھا کھنکڑ اور اتنا سخت تھا کہ تمام اثرات اس سے ٹکرا کے خود شکست ہو جاتے تھے اسکو ذراسی بھی ضرب نہ آتی تھی۔ حسینہ نے مڑ کے جو دیکھا تو ناک بھوں چڑھا چہرہ دکھلائی دیا۔ بے اختیار چیخ کے بولی "اے ہے۔ تم نگوڑے کہاں سے آ گئے"

عبد الوالی

مضامین قاری

یعنی قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان کے اُن معرکۃ الآرا مضامین کا مجموعہ جو ہندوستان کے مشہور اخبارات میں شائع ہو کر ملک و قوم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں ایک کتاب کی صورت میں چھپ کر تیار ہیں۔ ان مضامین کا زیادہ حصہ قومی اور اسلامی معاملات سے متعلق ہے اور یہ غیر ممکن ہے کہ ایکمرتبہ بھی پڑھنے کے بعد دل متاثر نہو۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ خود ہی ملاحظہ کرنے کے بعد یہ طے کرینگے کہ مسلمانوں کے لیے ان مضامین کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ کتاب میں مصنف صاحب موصوف کی تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت علاوہ محصول ڈاک عہ، ایک روپیہ

(درخواست خریداری جلد ارسال کیجیے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا)

منیجر تمدن بک ایجنسی نیا گاؤں لکھنؤ

غزلیات

حضرت محشر لکھنوی

روح کو راضی کیا میں نے تو راضی دل نہ تھا ورنہ اُٹھنا محفلِ ہستی سے کچھ مشکل نہ تھا

چار آنکھیں ہوتے ہی قابو میں گویا دل نہ تھا کہہ گذرنا ورنہ حالِ ہجر کچھ مشکل نہ تھا

سُننے والے میرا قصہ سُنکے یوں دیتے ہیں داد یا تو یہ زندہ نہ تھا یا پاس اسکے دل نہ تھا

ہوگئی ہے عام راہِ عشق بھی اس دور میں مُنھ اُٹھا کر جو چلا نا واقفِ منزل نہ تھا

دیکھنے والے مرے کیوں نقشِ حیرت بنگئے محوِ حسنِ دوست تھا آئینۂ محفل نہ تھا

اُس گھڑی پر لاکھ جانیں صدقے جب تمسے ملے چھٹ گئے جس وقت پھر جینے کا کچھ حاصل نہ تھا

یہ رموزِ جذب ہیں مجنوں سے پوچھا چاہیے باطنِ محمل کا نشانہ پردۂ محمل نہ تھا

قتلگہ کی سیر سے قاتل چلا ہی یوں اُداس جیسے مرضی کے موافق کوئی بھی بسمل نہ تھا

مدتوں میں آزما کر دلکو یہ سمجھا مزاج لائقِ خلوت نہ تھا اور قابلِ محفل نہ تھا

طور پر موسیٰ کو بلوایا پے دیدارِ حُسن کون کہتا ہے کہ انسان جوہرِ قابل نہ تھا

دردِ باطن سے دہانِ زخم جو کچھ کہہ اُٹھے شکوۂ تقدیر تھا وہ شکوۂ قاتل نہ تھا

بیٹھے جتنی دیر بالیں پہ ہنسی آتی رہی دل لگی تھی آپ کے نزدیک دردِ دل نہ تھا

عشق کی دنیا کو نا محدود سُنتے آئے ہیں کون تیرے حُسنِ عالم سوز پر مائل نہ تھا

ایک ہی نالے کی قوت سے خدائی ہل گئی اضطرابِ ہجر میں روحِ افز تھا دل نہ تھا

زندگی بھر کی ریاضت تھا دلِ محشر ضرور
پھر بھی او ظالم نگاہِ ناز کے قابل نہ تھا

ابوالصواب محمد حنیف علیصاحب رحیب قریشی انصاری

وصلِ ابد ہو محو دیں جستجو مجھے کھو دیا دین و جہان سے کہ پا نجائے تو مجھ

اللہ یوں جلائے کوئی شمع رو مجھے　　اپنے سے آئے گرمیِ محفل کی بو مجھے

مقبولِ عشق جز دلِ بے آرزو نہیں　　مایوس کر رہی ہے مری آرزو مجھے

رنگیں کسی کے عالمِ شوخی کو دیکھنا　　آنکھوں سے چاہیے اشک بہانا لہو مجھے

کیوں غمزہ شورِ طرزِ خموشی سے ہو خفا　　وہ چشم سرمہ سا ہے لبِ گفتگو مجھے

آشفتہ حالیوں نے بنایا بگاڑ کر　　افسانہ تیرے گیسوؤں کا مو بمو مجھے

خانہ خرابِ ہستیِ خانہ خراب ہوں　　در در پھرا رہی ہے تری جستجو مجھے

بس آبروئے ضبط سے میں ہاتھ دھو چکا　　اے چشمِ نم پرست ڈبوئے گی تو مجھے

خو کردۂ فراغ ہوں حرماں و یاس کا　　بس چھوڑ میرے حال پہ اے آرزو مجھے

خود بینیوں سے پوچھ کہ حیرت نے کس لیے　　آئینہ کر دیا ہے ترے رو برو مجھے

کعبہ میں قبلہ کیا؟ مگر از روئے مصلحت　　اسکی گلی میں دفن کریں قبلہ رو مجھے

وحشت میں گھونٹنے کو گلا یادگارِ جیب　　کافی ہے ایک تار بھی زیبِ گلو مجھے

کھویا گیا کہ آپ سے باہر نہ جا سکا　　پاتے ہیں وہ بھی منفعل جستجو مجھے

نازک مزاجیاں ہیں مری سازِ اضطراب　　بہتر یہ ہے کہ بزم میں چھیڑے نہ تو مجھے

دل پھٹ گیا ہے بے رخیِ التفات سے　　تارِ نظر ملے کوئی بہرِ رفو مجھے

میرا چمن حریفِ بہار و خزاں نہیں　　کیوں چھیڑتی ہے اے ہوسِ رنگ و بو مجھے

وہ ہے کہ وضعِ ناز کو غارت گری سے کام　　میں ہوں کہ پاسِ کشمکشِ آبرو مجھے

وعدے کی دلکشی ہوئی تمہیدِ بے خودی　　تم سے خجل کر گئی تغافل کی خو مجھے

ضبطِ نگاہِ ناز نہیں اُسکے بس کی بات　　خاموشیوں سے ہے گلۂ گفتگو مجھے

آئینۂ فروغِ تجلی ہے شش جہت　　لو کھو کے خود وہ ڈھونڈتے ہیں چار سو مجھے

زخمِ شگفتہ رنگ سے دل باغ باغ ہے　　اس گل سے کس بہار کی آتی ہے بو مجھے

دیکھا بھی؟ کب سے تاک میں تھا عشوۂ فنا　　ظالم نگاہ پھیر کے دیکھ ادھر تو مجھے

دیر و حرم سے ہے سرِ سودائے کفر و دیں　　شرمندہ کر رہی ہے تری جستجو مجھے

رنگ چمن نے غنچۂ تصویر یہ کر دیا — گویا دہن ہے مہر لبِ گفتگو مجھے
وجد آفریں ہے خلعتِ ہستی برائے جاں — اس پیرہن سے آتی ہے یوسف کی بو مجھے
نیرنگ گریہ دیکھ۔ تمنائے دل نہ پوچھ — ہر قطرہ خوں ہے خونِ ہزار آرزو مجھے

اک بے خبر کی یاد تو کاہش فزا ہے رعب
کیا بھول ہی گئی اجلِ حیلہ جو مجھے

حضرت بیخود موہانی

کسی کے حکم کے یوں منتظر مسافر تھے — کہ ایک موت کی ہچکی کے ساتھ آخر تھے
کبھی تھا دعوئے قدرت کبھی تھا شکوۂ جبر — نظر جو کی تو نہ مجبور تھے نہ قادر تھے
مقام۔ کوچ۔ پلٹنا۔ کچھ اختیار میں تھا؟ — مسافرِ رہِ ہستی عجب مسافر تھے
سپاسِ لذتِ دنیا کروں۔ کہ شکرِ اجل — جو کام جبر سے لیتے حضور قادر تھے
مآلِ فطرتِ بیتاب اور کیا ہوتا — مرے نصیب مری ابتدا سے ظاہر تھے
اٹھے تو رختِ سفر پھر وبالِ دوش ہوا — جو مرگ و قبر کے لوٹے ہوئے مسافر تھے
حیا کی آگ میں جلتے نہ کس طرح کشتی — عمل ہی اہلِ وفا کے مآل کافر تھے
کوئی نہ پوچھ سکا لن ترانیوں کا سبب — ترے جواب سے جو اہلِ دل تھے قاصر تھے
بھنور کے ساتھ ہی دریا کی تہ میں بیٹھ گئے — جو مد و جزرِ محیطِ خرد کے ماہر تھے؟
مری نگاہوں سے چھپ چھپ گیا جہاں اکثر — خرد کے بل پہ وہ زورِ غبارِ خاطر تھے

جہاں سے کھنچ کے مرے دل میں آرہے بیخود
جو اضطراب کے بکھرے ہوئے عناصر تھے

حضرت دل شاہجہاں پوری

ذرہ نواز ان کی طبیعت نہیں رہی — اب خاک میں بھی ملنے کی حسرت نہیں رہی
اس کبر و تمکنت سے وہ برباد کر چلے — گویا زمین پہ مری تربت نہیں رہی

تغیرِ رنگ شرحِ الم سے حضورِ یار — اظہارِ حال کی مجھے حاجت نہیں رہی

ہاں اے نگاہِ یار ترحم کا وقت ہے — شوقِ آفریں کسی کی طبیعت نہیں رہی

کیا با اثر ہیں اشکِ ندامت کو دیکھنا — خاکِ مزار میں بھی کدورت نہیں رہی

او فتنہ گر یہ حشر خرامی کی شان ہے — دل بول اُٹھے کہ اب کوئی حسرت نہیں رہی

تھا ہجرِ یار میں یہ بڑا تیر مارنا — اک اُف کے بعد دل پہ بھی قدرت نہیں رہی

وہ صدمہ ہائے سنگِ حوادث وہ کوہسار — ہٹنے کے بعد پھر کوئی حسرت نہیں رہی

ہر محوِ حُسن صورتِ آئینہ بن گیا — اب آئینہ کی اُن کو ضرورت نہیں رہی

کھینچی دلِ حزیں نے بڑی یاس سے اک آہ — جب عرضِ حال پر مجھے قدرت نہیں رہی

اے شوقِ دید پردہ در کون اب اُٹھائے — اپنی نگاہ میں تو یہ قوت نہیں رہی

ظاہر ہو تیرہ بختیِ عاشق کا کیا اثر — اتنی بھی روشنی سرِ تربت نہیں رہی

وہ محوِ امتحاں ہیں کہیں ہاتھ رک نہ جائے — کیونکر کہوں کہ اب کوئی حسرت نہیں رہی

محشر بپا ہوا ہے بس اتنی سی بات پر — اک نالہ کش کے بس میں طبیعت نہیں رہی

اے دل بہارِ لالہ و گل ختم ہو گئی
اب زخمِ خونچکاں کی وہ صورت نہیں رہی

حضرت شفق امروہوی

عیاں ہے شوقِ جنگ و صلح میرے دیدہ و دل سے — کوئی لڑتا ہے قاتل سے کوئی ملتا ہے قاتل سے

ہمارے قتل میں ایک ایک کی امداد کرتا ہے — قضا ملتی ہے خنجر سے ادا ملتی ہے قاتل سے

تڑپتے رہ گئے ہیں نقشِ پا بھی صورتِ بسمل — وہ تلواریں چلی ہیں شوخیِ رفتارِ قاتل سے

قضا آئینہ خنجر دکھانے کیوں نہیں آتی — کہ میں سکتے میں ہوں نظارۂ رخسارِ قاتل سے

کسی کو وصل کی حسرت کسی کو قتل کی حسرت — کوئی قاتل سے ملتا ہے کوئی شمشیرِ قاتل سے

دلِ مجروح تڑپے خاک و خوں میں اور ہم دیکھیں — مگر کیا کیجیے کچھ بس نہیں چلتا ہے قاتل سے

اب اس سے بڑھ کے تاثیر محبت اور کیا ہوگی
بدن سے روح نکلی تیں تہ نکلا کوئے قاتل سے

کسی پروا کرتا ہے تو پورا وار کرتا ہے
تڑپنا لوٹنا دیکھا نہیں جاتا ہے قاتل سے

شہید ناز ہو کر سختی ایام سے چھوٹے
ہماری عمر کے دن کٹ گئے شمشیر قاتل سے

غلط کہتا ہے جو اس کو نیام سرخ کہتا ہے
شفق کا خون جا لیتا ہے تیغِ قاتل سے

(ابو المظفر حضور نعیمی صاحب مرادآبادی (بھوپال)

جب بات وہ کرتے ہیں سر بزم کسی سے
اُس وقت کی حالت کوئی پوچھے مرے جی سے

جس شوق جس ارماں میں گذرا ہو تیں جی سے
مرتا نہیں اسطرح کوئی اپنی خوشی سے

اک چیز ہے دنیا میں محبت بھی کسی کی
اس درد کی لذت کوئی پوچھے مرے جی سے

اس وقت سے کچھ اور بھی دل بیٹھ گیا ہے
دیکھا جو نکلتے اُسے دشمن کی گلی سے

اب خاک میں مل کر بھی نہ جائے گی یہ حسرت
اسطرح بھی ظالم کوئی ملتا ہے کسی سے

اے دل کہیں کچھ اور نہ شگوفہ نہ کھلا ہو
بو دوست کی کیوں آتی ہے دشمن کی گلی سے

جنت میں بھی جائیں تو کبھی چین نہ آئے
کچھ ایسی محبت ہے ہمیں اُن کی گلی سے

تو فتنۂ محشر سے بھی دب کر نہ چلے گا
کہتے ہیں تری چال کے انداز ابھی سے

اک بات ہے جو باعث بے تابیِ دل ہے
اک راز ہے جو کہہ نہیں سکتا میں کسی سے

پھر بگڑے ہوئے طور نظر آتے ہیں دل کے
پھر سلسلۂ خط و کتابت ہے کسی سے

آ! تجھ سے گلے مل کے میں رو لوں دلِ ناشاد
رویا تھا کبھی تو بھی گلے مل کے کسی سے

بے چین جو ہے کوئی تو یہ اُس کا مقدر
تم چین سے بیٹھو تمھیں کیا کام کسی سے

یاد آتا ہے رہ رہ کے ہمیں اب وہ زمانہ
جب رسم محبت تھی حضور اپنی کسی سے

اک نظر

مطبوعہ مضامین پر اشاعت:۔ افسوس ہے کہ ہمیں اسوقت اپنے بعض کرم فرماؤں کے متعلق ایک غیر خوشگوار فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بعض حضرات مطبوعہ مضامین غیر مطبوعہ بتا کر رسالجات میں بھیجدیتے ہیں چنانچہ اس کا پہلا تجربہ ہمیں جناب ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کے ایک مضمون کے متعلق ہوا تھا اسکے متعلق سختی سے لکھا گیا اسپر آپ نے "تمدن" میں مضمون بھیجنا بند کردیا۔ دوسرا اس قسم کا واقعہ جناب مولوی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی کے چند چھوٹے چھوٹے مضامین کے متعلق ہے۔ جناب محوی صاحب نے ہمیں چند مضامین "تمدن" میں اشاعت کے لیے ارسال کیے تھے اور اُن کا غیر مطبوعہ ہونا تحریر کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان مضامین سے دو ٹکڑے الناظر کے مارچ و اپریل ۱۹۱۷ء کے نمبرون میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہمیں سخت افسوس ہے کہ ہمیں اپنے کرمفرما جناب محوی صاحب کی طرف سے اس قسم کی شکایت پیدا ہوئی۔ گمان غالب ہے کہ جناب محوی صاحب سے یہ غلطی سہواً ہو گئی ہوگی مگر اُمید ہے کہ آیندہ مضمون نگار صاحبان "تمدن" میں اشاعت کے لیے کوئی مضمون ارسال کرنے سے قبل اسکے غیر مطبوعہ ہونے کا اطمینان فرما لیا کریں گے۔

ارض القرآن:۔ اس نام کی ایک کتاب جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اڈیٹر معارف نے شائع کی ہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوہ اور مولانا شبلی نعمانی کے قابلِ قدر شاگرد ہیں۔ نظام کالج میں ایک عرصہ تک پروفیسر رہنے کے بعد آپ نے اس انجمن کی نظامت کا کام اپنے ذمہ لیا ہے جو ان کے استاد مکرم جناب مولانا شبلی نعمانی کی یادگار میں دارالمصنفین کے نام سے اعظم گڈھ میں قائم ہے۔ یہ کتاب عرب کی جغرافیائی تحقیق پر مشتمل ہے۔ اس میں یونانی۔ رومی۔ اسرائیلی مصری۔ عربی روایات کے متعلق ایک محققانہ بحث کی گئی ہے اور عرب کے قبل نزول قرآن اور مابعد نزول قرآن کے صوبوں کا جغرافیہ درج کیا گیا ہے۔ کتاب میں مغربی محققین کی دلائل

معقول تردید کی ہے جنھوں نے واقعات سے غلط اور متعصبانہ نتائج نکالے ہیں۔

مولانا سید سلیمان صاحب ایک قابل شخص ہیں اور ہمیں یہ بات اپنی توقعات کے بالکل موافق محسوس ہوئی کہ آپ نے جس امر کی تحقیق کو لیا ہے اور جس بحث کو چھیڑا ہے اس میں نہایت درجہ کامیابی حاصل کی ہے اس نوعیت کی کوئی کتاب اس وقت تک اُردو زبان میں موجود نہیں ہے اسلیے جناب مولانا صاحب اور بھی زیادہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اُردو زبان میں ایسے لٹریچر کو مہیا کردیا جس کی ضرورت تھی۔ اور جس قسم کی کتابوں کے موجود نہونے پر ہر مسلمان کو ان لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے جو اس قسم کی کتابوں کو طلب کرتے ہیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے البتہ بعض جگہ غلطیوں نے لطف عبارت میں خامی پیدا کردی ہے۔ یہ ۴۲۳ صفحہ کی مجلد کتاب دارالمصنفین اعظم گڑھ سے عہ/ کو مل سکتی ہے۔

تاریخ یہود:۔ ہمارے کرم فرما مولوی محمد صدیق حسین صاحب خلف جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے رسالہ مورخ میں جس کا مقصد تواریخ کی اشاعت ہے تاریخ یہود شائع کی ہے۔ تاریخ یہود کچھ عرصہ ہوا مکمل ہوگئی اور بالاقساط مورخ میں نکلنے کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ تاریخ یہود کے مؤلف ہندوستان کے مشہور اہل قلم جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر ہیں اور کتاب بنی اسرائیل کی مکمل تاریخ ہے اس میں حضرت عیسٰے سے قبل کے کل انبیا کے حالات درج ہیں اور اس سلسلے میں اسیریا، بابل والوں، مصریوں، ایرانیوں، یونانیوں، رومیوں اور بعض دیگر اقوام کے حالات بھی آگئے ہیں۔ تاریخ یہود گو خود ایک مکمل تاریخ ہے مگر اصل میں تاریخ ارض المقدس کا پہلا حصہ ہے کتاب کے آخر میں چند نقشہ درج کیے گئے ہیں جس میں بعض ارض مقدس کے نقشے ہیں اور چند میں بادشاہوں کی حکومت دکھائی گئی ہے اور بعض تاریخی مقامات کے ہیں اور چند تصاویر بھی ہیں جن میں مختلف طبقوں کے لباس کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جناب شرر اُردو زبان کے اہل قلم میں اتنے زیادہ مشہور ہیں کہ انکے طرز تحریر کے لیے

کسی قسم کے تعارف کی ضرورت نہیں آپکا نام کتاب کی شُستہ طرز تحریر کی ضمانت ہے علاوہ نقشوں کے کتاب کی ضخامت ۲۵۶ صفحے ہے لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ قیمت عہ مجلد عما۔

پتہ دفتر المورخ کٹرہ بزن بیگ خاں لکھنؤ و نیز دفتر تمدّن سے مل سکتی ہے۔

سخن سنج:۔ اس نام کا چھوٹی تقطیع پر سہ ماہی رسالہ جناب حکیم سراج الحق صاحب منیجر دلگداز کی ایڈیٹری میں دلگداز پریس سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس رسالہ کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ صوبجات متحدہ میں اسوقت سخن سنج صرف تنہا سہ ماہی رسالہ ہے۔ رسالہ میں مضامین نظم و نثر ہوتے ہیں اور اُن میں سے بعض ممتاز اہل قلم کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سخن سنج کی سالانہ قیمت ۱ر ہے نمونہ ۱ء کا ٹکٹ آنے پر دفتر سخن سنج کٹرہ بزن بیگ خاں لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

یادگار مولانا سید کرامت حسین صاحب مرحوم:۔ جناب چودھری محمد علی صاحب تعلقدار ردولی نے شائع کی ہے اسمیں چودھری صاحب نے مولانا سید کرامت حسین صاحب مرحوم کی پرائیویٹ زندگی کے حالات دلچسپ پیرایہ میں درج کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ مولانا کے دل میں قومی ترقی اور خصوصیت کے ساتھ تعلیم نسواں کا کتنا درد تھا۔ کتاب کے شروع میں مولوی کرامت حسین صاحب کی ایک تصویر بھی ہے اور اسکے بعد آنریبل سر راجہ محمد علی محمد خاں صاحب والی محمود آباد کی ایک تقریظ درج ہے اس کتاب کی اشاعت کا مقصد جسکو جناب چودھری صاحب نے بھی ظاہر فرمایا ہے اور جسکے بیے جناب راجہ صاحب نے بھی اپیل کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا مسلم گرلز اسکول بارآور ہو اس کی طرف قوم کی توجہ مبذول ہو جائے۔ جناب مولانا کرامت حسین صاحب کی موت نے تعلیم نسواں کو جسقدر نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ہونی آسان نہیں ہے۔ مولانا کرامت حسین مرحوم کے دنیا سے اُٹھ جانے سے مسلم گرلز اسکول لکھنؤ کو بھی نقصان پہنچا لیکن اگر قوم کی توجہ اس کی طرف حقیقی طور پر مبذول ہو جائے تو مسلم گرلز اسکول کی حالت نہ صرف ویسی ہی قائم رہ سکتی ہے جیسی کہ مولانا مغفور کے زمانہ میں تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ترقی کی صورتیں نظر آنے لگیں گی۔ ہم مسلم گرلز اسکول کی طرف قوم کی توجہ مبذول کرانے

اپیل میں چودھری محمد علی صاحب اور راجہ صاحب محمود آباد کے ہم آہنگ ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ قوم مسلم گرلز اسکول کی طرف سے اتنی عدم توجہی نہ برتے گی جتنی اس نے اسوقت تک برتی ہے اور جس کی وجہ سے جسٹس کرامت حسین صاحب مرحوم کو زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کتاب چودھری محمد علی صاحب سے رودولی ضلع بارہ بنکی کے پتہ پر درخواست کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اصنام العرب:۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے مؤلف تمدّن کے عنایت فرما جناب مولوی سید ظفر حسن صاحب علوی ناظم دائرۃ الادب دہلی ہیں آپ نے اس مختصر کتاب میں عرب کے علم الاصنام پر تاریخی اور مفصل معلومات جمع کی ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ بت پرستی کا وجود کیونکر ہوا اور کون اس کو عالم وجود میں لایا۔ بت کیونکر خانہ کعبہ میں بار سوخ ہو گئے۔ کون کون سا بت کہاں کہاں بنا اور کس کس جگہ نصب کیا گیا اور پھر وہ کیونکر تباہ ہوئے اور اہل عرب کیوں ان کی پرستش کرتے تھے۔ کتاب دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے اور اس میں اچھی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ۴ر قیمت پر دائرۃ الادب دہلی سے مل سکتی ہے۔

میاں پوت:۔ یہ نام ناظرین تمدّن کو عجیب سا معلوم ہوگا یہ ایک ناول کا نام ہے جو جناب باسط صاحب بسوانی نے تصنیف کیا ہے۔ نام کی طرح ناول میں بھی ناظرین کو جدت محسوس ہوگی۔ یہ ظریفانہ پیرایہ میں ایک اخلاقی ناول ہے۔ قیمت ۸ر پتہ ماسٹر باسط علی صاحب باسط۔ بسواں ضلع سیتاپور۔

جب تم اپنی جوانی کا اپنے ہاتھ سے ستیاناس کر چکے ہو۔ اور اعضائے رئیسہ اپنے کام سے جواب دے رہے ہیں۔ دل بات بات میں دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ تنہائی پسند آتی ہے۔ عورت سے ڈر لگتا ہے۔ حافظہ کمزور۔ دماغ پریشان اور خیالات منتشر رہتے ہیں۔ بصارت گھٹ گئی ہے سر میں چکر آتے ہیں۔ غذا جزوِ بدن نہیں بنتی بدن سوکھتا جاتا ہے سستی چھائی رہتی ہے۔ چہرے کی رونق اُڑ چکی ہے۔ جوہرِ حیات رقیق پڑ گیا ہے۔ اور احتلام و جریان کی شکایات سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ غرض زندگی وبالِ جان ہو رہی ہے۔

تب تم چندر کلا کیوں نہیں کھاتے؟

جواب تک ہزاروں زندگیاں موت کے منہ سے بچا چکی ہے۔ یہ اوپر کی سب شکایات کا بہتر سے بہتر علاج ہے۔ جو اب تک طبی دُنیا کو معلوم ہوا ہے۔ یہ کھوئی ہوئی جوانی کو واپس لاکر دوبارہ جوانی کی بہار دکھانے کے لئے زمانۂ حال کی بہترین طاقت بخش دوا تسلیم کی گئی ہے۔ جو دوام کے لئے ناطاقتی کی بیخکنی کر دیتی ہے۔ اس کے استعمال سے وہ مایوس العلاج بھی از سرِ نو زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔ جو اشتہاری دواؤں پر دولت برباد اور صحت نثار کر کے زندگی کو وبالِ جان سمجھ چکے تھے۔ جب کہ سب طرف سے مایوسی ہو چکی ہو۔ تو ایک مرتبہ **چندر کلا** کا بھی تجربہ کرو مایوسی کی تاریکی میں **چندر کلا** چراغ کا کام دیگی۔ اگرچہ یہ رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھاتی ہے لیکن وہ یقینی طور پر مستقل اور دیرپا ہوتا ہے۔ (۳۲ ٹکیہ کی شیشی کا دام ایک روپیہ (۱؍۱۰) اور خرچ ڈاک ۴؍)

دُنیا کیا کہتی ہے؟

بہت فائدہ ہوا تم سے جو دوائی چندر کلا ہمارے دوست کی خاطر طلب کیا تھا سو اس کے استعمال کرتے ہی بہت فائدہ ہوا۔ مریض آپ کے حق میں دعائے خیر کرتا ہے۔ (محمد بخش رشید انگیت پوری مقیم بمبئی)

اول اپنے ہاں کے مشہور سوداگروں یا دوائی فروشوں سے طلب کرو۔ سب اپنے پاس رکھتے ہیں۔ وہاں مل گئی تو خرچ ڈاک بچ رہے گا۔ ورنہ

کارخانہ آیورویدک فارمیسیوٹیکل کمپنی لمیٹڈ لوہاری بازار لاہور سے منگاؤ

پکے اور ارزاں لوہے سے بیش قیمت فولاد ہزار گونہ زیادہ کار آمد ہے۔

سرکار سے رجسٹری شدہ　　**دورو گج کیسری**　　داد کی بے خطا دوا۔

ہاں جلن اور تکلیف کے داد کو جڑ سے دور کرنے والی اگر کوئی دوا ہے تو یہی ہے۔ **قیمت فی شیشی چار آنہ**

جس شیشی پر سکھ سنچارک کمپنی کا نام نہ لکھا ہو اسے ہرگز نہ خریدیے۔ **سب سے قابل اطمینان خط۔**

مہاشے آپ کی دوا۔ دورو گج کیسری کا استعمال کیا گیا۔ داد اچھے ہو گئے دوا سودمند ہے۔

آپ کا راجہ سر رام پال سنگھ کے سی آئی۔ ای براج کرسی سدولی ضلع رائے بریلی۔

بال صفا - اگر آپ کو اپنے بھدے موٹے تانبے اور تندرست بنانے ہیں اور روز کی بیماریوں سے اپنا پیچھا چھڑانا ہے تو اس تیلی ہوا کو منگا کر دیکھیے۔ ایک شیشی تقریباً ایک ماہ کو کافی ہے۔ قیمت فی شیشی بارہ آنہ۔ ڈاک خرچ چھ آنہ۔

آپ کو اپنی ضرورت کی کوئی بھی چیز درکار ہو تو بیشتر مجھے دریافت کیجیے اور ہماری فہرست طلب فرما کر ملاحظہ فرمایئے۔

ملنے کا پتہ:- سکھ سنچارک کمپنی متھرا۔

لوگوں کی رائے

اس بات کے یہ پختہ ہو گئی ہے کہ سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا تیار کردہ سُدھا سندھو ہی سب سے سچی اور فوراً شفا بخشنے والی بے خطا دوا ہے باقی اسکی سب نقلیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اس نایاب دوا کے فروخت کرنیکو **چوتھائی لاکھ** سے زیادہ ایجنٹ مہیا ہو چکے ہیں ۲۷ سال کی طویل آزمائش کے بعد کامل طور پر یقین ہو چکا ہے کہ اس کمپنی کا سُدھا سندھو بنا کسی چیز کی آمیزش کے کف۔ کھانسی۔ دمہ ہیضہ۔ ہرے پیلے دست خونی دست۔ آنتوں۔ پیچش۔ تخم نخ۔ نزکام۔ سردی۔ نزلہ وغیرہ امراض کو دفع کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے یہ ایک خوش ذائقہ اور خوشبودار دوا ہے۔ **قیمت فی شیشی آٹھ آنہ** ڈاک خرچ ایک سے چار شیشی تک تین آنہ۔ **چند ہزار اسناد میں سے چند یہ ہیں:-**

شری نیکیٹشور اخبار بمبئی ۱۲ فروری ۱۹۰۹ء سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا سدھا سندھو ہیضہ اور اس سے پیدا شدہ ہیضہ وغیرہ امراض کی ایک بے خطا دوا ہے...... اہیودے اخبار الہ آباد مئی ۱۹۰۹ء سدھا سندھو حقیقت میں ان کا ممندر سُدھا سندھو ہی ہے جملہ خانہ داروں کو یہ دوا اپنے پاس رکھنا چاہیے کیونکہ بہت قسم کے امراض میں مفید ہوتی ہے ہم نے آجتک ۱۰۔۱۲ شیشی منگا کر فائدہ دیکھا ہے...... **شری پنڈت مہابیر پرشاد جی دویدی ایڈیٹر سرسوتی الہ آباد۔** ہماری ضعیف والدہ جنکی عمر ۸۰ سال کی تھی کف اور کھانسی سے بیمار تھیں۔ انکو ہم نے سُدھا سندھو کے دو قطرے دیئے۔ دیتے ہی اس نے جادو کا اثر کیا........ **ہمارے دوا** سب بڑے دوا بیچنے والے اور دیگر دوکانداروں کے پاس بھی ملتی ہے مگر دھوکے سے دوسری مصنوعی دوا نہ خریدیے گا چار دہام کی تصویر اور تصویر دار بڑی فہرست سب کو بلا قیمت ملے گی۔ **منگانے کا پتہ:- سکھ سنچارک کمپنی متھرا**

قابل دید کتب

کتب ذیل کی قیمت میں انتہائی تخفیف کردی گئی ہے اور یقین ہے بشتر کسی دوسری جگہ سے اس قیمت پر دستیاب نہیں ہو سکتیں۔

ناولہائے قاری۔ قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) کے اخلاقی ناول سعید۔ سعادت شاہد رعنا۔ جودوبا۔ چھپکر قدر دانوں کے ہاتھ میں پہنچ چکے ہیں۔ اب ایک مجموعہ کی صورت میں چھپوائے گئے ہیں۔ ۳۰۰ صفحہ کی مجلد کتاب جو نہایت عمدہ ولایتی کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور جسمیں مصنف کی ایک تصویر بھی ہے قیمت عہ

زہرا۔ ایک ترکی ناول کا ترجمہ۔ مترجمہ سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے۔ قیمت ۸ر

ثالث بالخیر۔ ایضاً ۴ر

نیرنگی دہر۔ مجیدہ بیگم کے مصائب اور وفاداری کی داستان۔ شریف النسا کی کج ادائیوں کا انجام مصنفہ منشی عبدالغفور صاحب صفحات ۱۳۲۔ قیمت ۴ر

گودڑ کا لال۔ ایک نہایت دلچسپ اخلاقی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا طبع زاد فسانہ کہ جسمیں ایک ہندوستانی خاندان کی حسن معاشرت کو نہایت خوبی سے قلمبند کیا ہے مصنفہ محترمہ والدہ صاحبہ سید محمد افضل صاحب بی۔ اے حصہ اول و دوم صفحات ۹۴ قیمت سے ر

قدیم ہندوستان کی تہذیب۔ مشہور فاضل مسٹر آر سی دت کی بے مثل تاریخ سویلائزیشن آف اینشنٹ انڈیا کا ترجمہ عہ

تاریخ مذہب۔ اسمیں مذہب کی ابتدا اور ترقی کا حال اور نیز بڑے بڑے مذہب مثلاً بابلی اور اسوریہ مصر اور چین اور دیگر ممالک و اقوام کے مذاہب کی مختصر تاریخ درج ہے قیمت ۸ر مجلد ۱۰ر

علوم طبیعہ کی تاریخ۔ علوم طبیعہ کی ان تمام دریافتوں اور ایجادوں کی تشریح جو ساتویں صدی قبل مسیح سے لیکر انیسویں صدی تک وقتاً فوقتاً عمل میں آتی رہی ہیں سائنس کی تحقیقات کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم و جدید حکما نے ان علمی دریافتوں اور ایجادوں میں کیا کیا حصہ لیا نہایت مفید کتاب مضامین کی وضاحت کے لیے صدہا تصویریں دیگئی ہیں قیمت ہر دو حصہ مجلد عہ

رسول عربی۔ پیغمبر اسلام کی سوانح عمری اور سچے حالات حجم ۴۰۰ صفحہ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱ر

رباعیات حالی۔ مولانا حالی کی رباعیات کا یہ جدید ایڈیشن مسدس کی تقطیع پر چھپا ہے ہر صفحہ میں دو دو رباعی درج ہیں قیمت ۳ر

برکات سلطانی۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کی روشن زندگی کے کارنامے اور انکی اسلامی و علمی خدمات کا مرقع باتصویر پڑھنے کے قابل کتاب ہے ۶ر

چمنستان عرب غنچہ حج - اس کتاب میں قرآن شریف، احادیث مبارک، سیر و تواریخ سے حج، مکہ معظمہ، کعبہ مقدسہ، مدینہ منورہ اور عرب کے تاریخی اور جغرافیائی حالات بہت تحقیق و تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ آج تک اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں شائع ہوئی قیمت عمہ

تاریخ مسجد الحرام - ۸ر

الفاروق - خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ فاروق کی سوانح عمری اور ان کا طرز حکومت از مولانا شبلی مرحوم قیمت عہ

الغزالی - مولانا شبلی کی معرکۃ الآرا تصنیف امام غزالی کے حالات زندگی اور علمی معرکہ آرائیوں کا دلچسپ و قابل مطالعہ بیان قیمت ۸ر

قواعد اردو - اردو زبان کی سب سے پہلی جامع مبسوط اور با اصول قواعد از مولوی عبد الحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اردو قیمت عہ

مقالات شبلی - مولانا شبلی مرحوم کے متفرق تاریخی علمی ادبی قابل دید مضامین کا مجموعہ جو رسائل شبلی کے بعد کے مضامین کو جمع کر کے تیار کیا گیا ہے قیمت ۸ر

محاربات صلیبی - صلیبی لڑائیوں کے متعلق اردو میں سب سے بہتر اور مکمل کتاب مجاہدین اسلام کی یادگار کارناموں کا مرقع اصل کتاب انگریزی میں لندن کی ایک علم دوست مجلس نے شائع کی تھی جس کا یہ اردو ترجمہ ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کوئی متعصب بھی مجاہدین اسلام کی اخلاقی و سیاسی فتوحات سے انکار نہیں کر سکتا قابل دید کتاب ہے قیمت عہ

حیات حافظ - جس میں لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور ان کی شاعری پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے - عمہ

گنج شائیگاں - قدیم شاہان ایران سے لیکر اس وقت تک کی دنیا بھر کی سلطنتوں، ریاستوں وغیرہ کے سونے چاندی کے سکوں کے دونوں رخوں کی اصلی تصویریں معہ حالات و وزن وغیرہ - قیمت ۸ر

مکمل محاربات روس و جاپان - حصہ اول و دوم قیمت فی حصہ ۱۲ر

تاریخ یونان - سلطنت یونان کے عروج و زوال کے اسباب۔ نظام سلطنت۔ معرکہ آرائیاں اور فتوحات وغیرہ کے مفصل حالات۔ قیمت ۸ر

تاریخ مصر - جس میں قدیم زمانہ کے مصریوں کی رسم و رواج۔ طرز معاشرت۔ عادات و خصائل و تہوار، معبودوں۔ علم الاصنام۔ نظام سلطنت معرکہ آرائیوں اور فتوحات عروج و زوال کے اسباب۔ علم فنون وغیرہ کے مفصل حالات درج ہیں۔ باتصویر کتاب ہے - ۸ر

تاریخ روم - اس نادر کتاب میں مقتدر مصنف نے سلطنت روما کی ابتدا سے شروع کر کے روم کے پانچ جلیل القدر قیاصرہ کے عہد انتظام بہت العزم کے اختتام تک بڑی دلچسپ صورت میں قلمبند کیا ہے - قیمت ۸ر

تاریخ تمدن - یعنی سر ہنری طامس بکل کی مشہور تصنیف "ہسٹری آف سویلزیشن" کا ترجمہ مترجمہ مرحوم و مغفور منشی محمد احمد علی صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل - قیمت عہ

الہارون - سوانح عمری خلیفہ ہارون الرشید اعظم معہ نقشہ سلطنت عباسیہ و منظر دارالخلافہ بغداد ۱۲ر

سبز مرہم

جو

حکیم محمد رفیق ابراہیم صاحب لکھنوی

برادرزادہ جناب حکیم حافظ محمد عبدالولی صاحب مرحوم مغفور کا ایجاد کردہ ہے تمام جلدی بیماریوں اور زخمہائے خبیثہ یعنی پھوڑا، گلٹی، کھجلی، تر و خشک۔ داد، کنٹھ مالا۔ آتشک کے زخم وغیرہ وغیرہ کیلیے بے مثل دوا ہے۔ جملہ بلغمی و سوداوی دردوں وجع مفاصل، نقرص، عرق النسا، کولہ، کمر اور شانہ کا درد اور ان تمام کو جو سردی وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں بہت جلد رفع کر دیتا ہے۔ انگریزی دوائیں اسکے سامنے ہیچ ہیں۔

"سبز مرہم" ناگہانی واقعات مثلاً چوٹ اور جلنے وغیرہ کی تکالیف کو فوراً دور کر دیتا ہے ہر گھر میں ایک ڈبیہ ضرور رہنا چاہیے۔ قیمت فی ڈبیہ ۸/

سبز مرہم کمپنی

کارکن و منتظم مخزن الادویہ جھنوائی ٹولہ لکھنؤ

...ں کے یک جائی ...لڈاک خرچ میں ...ٹ	پانچ پانچ روپے کے سو خریدار فوراً مطلوب ہیں	یعنی تینوں کتابوں کا وی پی مع جملہ اخراجات صرف ۵/ میں بھیجا جائیگا

(۱) اُردوئے معلیٰ: یعنی مرحوم رسالہ اُردوئے معلیٰ علیگڈھ کی گذشتہ دس جلدوں کے بہترین مضامین نظم و نثر کا قابل دید انتخاب مجلد قیمت ۱۲/

(۲) مکتوبات امیر مینائی: یعنی منشی امیر احمد صاحب مرحوم لکھنوی کے دلچسپ خطوط کا مجموعہ مع تصویر و سوانح عمری امیر و موازنہ داغ و امیر حجم ۳۵۲ صفحے مجلد ۱۲/

(۳) تذکرۃ الشعراء حصہ اول مکمل: حجم تقریباً ۵۰۰ صفحے مرتبہ حسرت موہانی جس میں تذکرۂ شعراء و دیگر مضامین نظم و نثر کے علاوہ دیوان امیر، شہیدی، تنہا، مجبور، آتش، غافل، مائل، مومن، نسیم، تسلیم، رشک، حالی، بے نظیر، مست، مضطر خیرآبادی و حسرت موہانی کے دواوین کا انتخاب بھی بطور ضمیمہ شامل ہے ان میں سے اکثر دیوان ایسے ہیں جو کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہو سکتے۔

نوٹ: طبع ثانی تک حسرت موہانی کا دیوان صرف بطور ضمیمہ تذکرۃ الشعراء مل سکتا ہے علیحدہ نہیں مل سکتا۔

المشتہر

بیگم حسرت موہانی۔ دفتر اُردوئے معلیٰ علیگڈھ سٹی

تمدّن

دلّی کا تمدّن لکھنؤ میں

اہل لکھنؤ کو قدرت نے ہمیشہ یہ موقع دیا ہے کہ کوئی لگا لگایا پودا ان کے ہاتھ آگیا اور انھوں نے جان اور مال سے اسکی آبیاری کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پودے کی تاریخ میں جہاں کہیں اسکے لگانے والوں کا نام آتا ہے وہاں حضرات لکھنؤ کے نام کو بھی بہت ممتاز جگہ ملتی ہے۔ زبان اُردو دلّی میں پیدا ہوئی اور اس وقت جبکہ دلّی اُجڑگئی تھی اُردو کو ترقی کرنے کا جو میدان ملا وہ لکھنؤ تھا۔ اور جن لوگوں کی نظر کیمیا اثر نے اردو کو زندہ رکھا بلکہ معراج کمال پر پہنچایا وہ حضرات لکھنؤ ہی تھے کم و بیش اسی طرح آج اسی زبان کا ایک رسالہ "تمدن" جو عم مکرم جناب مولانا عبدالراشد الخیری صاحب کی ایڈیٹری میں دلّی سے نکلتا تھا بزرگان لکھنؤ کی فراخ حوصلگی اور مہمان نوازی کی توقع پر دلّی سے لکھنؤ آتا ہے۔ یہ یاد دلانا بے سود ہوگا کہ یہ اسی

زبان کا ایک ماہواری رسالہ ہے جس کی پرورش میں انھوں نے اسقدر کوشش کی کہ مثل اہل دہلی کے اہل لکھنؤ بھی بجا طور پر اُردو کے دعویدار قرار دیے جائینگے "تمدن" نے دلی سے چل کر لکھنؤ تک کی منازل اس امید پر طے کی ہے جو دلّی کے مشہور شعرا اور خصوصیت کے ساتھ میر تقی تک کو جو دلّی چھوڑنا بمنزلہ کفر خیال کرتے تھے ان "پورب کے ساکنوں" تک لائی تھی۔ حضرات لکھنؤ سے "تمدن" کے لیے پرورش و اعانت کی توقع کرنا کچھ بہت زیادہ نہیں ہے اسی طرح "تمدن" کا حضرات لکھنؤ کے ساتھ وہی سعادتمندانہ برتاؤ رہے گا جو ایک خورد کا ایک بزرگ اور سرپرست کے ساتھ ہونا چاہیے۔ "تمدن" حضرات لکھنؤ کے مضامین نظم و نثر لکھنؤ کی زبان میں شائع کرے گا۔ اور سعادتمندی سے سرمو تجاوز نہیں کرے گا۔ "تمدن" کے اس نئے دور یا لکھنوی دور کا پہلا پرچہ جناب کی خدمت میں حاضر ہے۔

حضرات لکھنؤ اپنے مضامین بہت جلد بھیجیں نیز وی۔ پی بھیجنے کی اجازت مرحمت فرمائیں اور خریداروں کی فہرست میں توسیع کرنے کی کوشش شروع فرمائیں۔ "تمدن" کا دہلوی دور تو جسطرح بھی ہوا گذر گیا اب امید ہے کہ اسکا لکھنوی دور لکھنوی احباب کی حُسن توجہ سے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گا۔

اس وقت یہ رسالہ لکھنؤ سے سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے (علیگ) و مولانا عبدالراشد الخیری صاحب سابق ایڈیٹر "تمدن" و ایڈیٹر رسالہ "عصمت" اور قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) سیاح انگلستان و جاپان (پرائیویٹ مشنری آف اسلام) کی سرپرستی میں شائع ہوگا اور ان تمام توقعات کو آپ کی ذرا سی نظر عنایت سے پورا کرنے کے

قابل ہو جائے گا جو ایک علمی ادبی رسالہ سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

نیازمند

ایم۔ اے۔ قاری (علیگ)

ایڈیٹر "تمدن"

خلف اکبر قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دھلوی

(علیگ) سیاح جاپان و انگلستان

ریویو

ہندوستان میں اُردو رسالہ جات کی جسقدر ضرورت ہے اس سے ہر اردو داں بخوبی واقف ہے۔ مردوں کے لیے رسالہ جات اتنے کم ہیں کہ اگر اس سے ذگنے چوگنے اُردو رسالہ بھی موجود ہوں تو وہ ملک کی وسعت اور آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہیں اور طبقۂ نسوان کے لیے تو اس میدان میں ابھی بہت زیادہ گنجایش ہے۔ ہمکو یہ دیکھکر خوشی ہوی کہ کرال ضلع مین پوری سے ایک اُردو ماہواری رسالہ "پیام امید" نامی ستمبر سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ "پیام اُمید" آزاد بیگم جیبہ اھلیہ اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) کی ایڈیٹری میں نکلنا شروع ہوا ہے پہلا پرچہ کامل اہتمام سے نہایت شان و شوکت کے ساتھ نکالا گیا۔ اور عمدہ مضمون دیے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی کے اعتبار سے پرچہ بہت عمدہ ہے۔ خدا کرے یہ ملک میں سدا بہار پھول کی طرح پھلے پھولے۔ پرچہ کی سالانہ قیمت (عہ) اور ششماہی قیمت عہ ہے۔

مذہب و قومیت

دنیا کوئی نہیں بتا سکتا کہ کہاں سے شروع ہوی تھی؟ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک پہنچے گی؟

اس کی نسبت بھی یقینی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جب شروع ہوی تھی تو اس کی کیا حالت تھی؟ اور جب ختم ہوگی تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ ہماری نگاہ کے سامنے کوئی ایسی مکمل تاریخ نہیں ہے جو آغاز عالم پر فیصلہ کن رائے قائم کر سکے! اس گتھی کو سلجھانے کے لیے جب دماغ انسانی تخیلات کے سمندر بے پایاں میں شناوری کرتا ہے تو ہمیشہ اپنی ذاتی قائم کردہ رُخ پر تیرتے ہوئے کسی ایک طرف نکل جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اُس نے اس بحر ناپید اکنار کی ابتدا و انتہا معلوم کر لی! مذہب کے جہاز میں سوار ہونیوالا اپنے معتقدات کے راستہ پر" آغاز و انجام اپنے مذہب کے موافق دریافت کر لیتا ہے اور اسی پر مطمئن ہو کر اُسے حقیقت سمجھ لیتا ہے! فلسفہ کے اسٹیمر پر سفر کرنے والا اپنے مفروضات کی راہ پر، ابتدا و انتہا کی نسبت اپنے علم و عقل کے موافق، دماغ فریب استدلال قائم کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اسکی رائے زنی اصلیت کے بالکل قریب ہے! مگر فی الحقیقت حقیقت جس پردۂ گو مگو میں پہلے تھی، اب بھی رہتی ہے! فریقین کے مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ۔ معتقدات ہوں یا مفروضات۔ آغاز و انجام عالم کی نسبت رائے لگانے والے کے یقین و استدلال میں حصۂ غالب ذاتی کیفیت ہے! جس آب و ہوا اور حالتِ گرد و پیش میں جن سے

واقعی انسانی دماغ کی نشو و نما ہوتی ہے۔ انسان نے ہوش سنبھالا اور اپنے خیالات پیدا کیے ہیں؛ اُسی کے موافق وہ اس مسئلہ پر بھی رائے زنی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ بقیہ دنیا بھی ماضیِ غیر محدود اور مستقبل نامعلوم کو اسی عینکِ تخلیات سے دیکھے جس سے وہ دیکھتا ہے! آپ مذہبی عینک سے اگر فلسفہ کے استدلال کو ملاحظہ کریں تو وہ محض لغو نظر آئے گا: اور فلسفہ کے نقطۂ نظر سے اگر مذہب کے معتقدات کا مشاہدہ کریں تو وہ بھی کچھ کم پوچ نہیں معلوم ہونگے!

تہذیب زمانہ کی رفتار کے ساتھ پلٹتی رہی اور پلٹتی رہے گی! نیک و بد کا مسئلہ۔ ضروریات زندگی کے تابع ہو کر۔ دنیا کی رفتار کے ساتھ ساتھ ایک خاص حد تک برابر رنگ بدل رہا ہے! گویا ماضی سے حال تک معاشرت کا تسلسل، ایک ایسی نہ محسوس ہونے والی زنجیر ہے جس کی ہر کڑی اپنے سے ماقبل والی کڑی سے بالکل ملی ہوئی ہے! فرض کیجیے کہ، اس زنجیر کی ہر کڑی اپنے سے پہلے والی کڑی سے، رنگ کے لحاظ سے، نہایت ہی خفیف حد تک ہلکی ہوتی چلی گئی ہے: اب ایسی زنجیر کے مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اگر اُسکی ایک کڑی بالکل سیاہ ہے تو کم و بیش سَو کڑیاں چھوڑ کر آنے والی کڑی، رنگ کے بتدریج ہلکا ہوتے جانے سے، بالکل سفید ہوگی! لیکن اگر آپ اُسی سیاہ کڑی کے ماقبل یا مابعد والی متصل کڑی کو ملاحظہ کریں گے تو ان تینوں کے رنگ میں کوئی ایسا نمایاں فرق نہیں پائیں گے جو بادی النظر میں ایک دوسرے میں رنگ کا امتیاز قائم کر سکیں! وجہ یہ ہے کہ رنگ اسقدر خفیف انقلاب کے ساتھ ہلکا ہوا ہے کہ نظر کسی ایک کڑی کا رنگ اس کے ماقبل والی متصل کڑی سے بالکل ملتا جلتا پاتی ہے، البتہ بتدریج ہلکا ہوتے ہوتے دس بیس کڑیوں کے بعد اسکا پتہ چلتا ہے کہ رنگ ہلکا ہوتا جاتا ہے، یہانتک کہ سَو کڑیوں کے بعد سیاہ رنگ بالکل

سفید بن جاتا ہے! بالکل یہی حالت معاشرتِ عالم کی ہے! موجودہ سال کی معاشرت کو گذشتہ سال یا آئندہ سال سے مقابلہ کیجیے کوئی بیّن فرق نظر نہیں آئے گا: البتہ بیّس سال پیشتر کی معاشرت سے مقابلہ کیجیے، تھوڑا بہت فرق، غور بین نظر ڈالنے پر ضرور معلوم ہوگا: پچاس سال قبل کی معاشرت کو دیکھیے، آپ فوراً مان لیں گے کہ انقلاب ہو رہا ہے یہانتک کہ ایک صدی میں بالکل دنیا کا یا پلٹ ہو جائے گی!

نہیں بتایا جا سکتا کہ معاشرت تہاذیب کی پابند ہے یا۔تہذیب معاشرت کی؟ ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی چیز کی مختلف حالتیں ہوں! اس میں شک نہیں کہ ایک دوسرے میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے! دماغِ انسانی ہر نئی چیز کی تلاش و تحقیق میں ہمیشہ سے مصروف چلا آتا ہے: نئی چیز دریافت ہوکر۔ یا ایجاد ہوکر۔ استعمال میں آتی ہے: نئی چیز کا نیا استعمال گرد و پیش کی تمام چیزوں پر۔ یا ان کے طریقۂ استعمال پر۔ اپنے نیچرل تعلق کے لحاظ سے نیا اثر پیدا کرتا ہے: نیا اثر ضروریات میں نیا تغیر کرتا ہے: اس تغیر سے دائرۂ تہذیب میں اسکے موافق انقلاب واقع ہوتا ہے: اور اس انقلاب سے معاشرت کا رنگ متاثر ہوکر تبدیل ہو جاتا ہے!

دنیا آگے بڑھ رہی ہے یا پیچھے ہٹ رہی ہے؟ اس کا جواب بھی دیکھنے والے کے نقطۂ خیال پر منحصر ہے! جو اسکے ساتھ ساتھ متحرک ہے اُسکو بڑھتی ہوی نظر آئے گی: اور جو کسی نقطہ کو ناقابل تغیر سمجھ چکا ہے اُسے ہٹتی ہوی معلوم ہوگی! واقعہ یہ ہے کہ آگے اور پیچھے محض ایسی دو سمتیں ہیں جو انسان کا رخ پلٹ جانے کے ساتھ ساتھ پلٹ جاتی ہیں! مشرق کی طرف مُنھ کرکے کھڑے ہو جیے مغرب آپ کے پس پشت ہو جائے گا! اور مغرب کی طرف روگردانی

کر دیجیے مشرق پیچھے ہو جائے گا؛ کعبۂ مذہب کی طرف مُنھ کرنے والے کو فلسفہ پس پشت نظر آتا ہے اور فلسفہ کی طرف رخ کرنے والے کو مذہب! اسقدر شاید دونوں فریق مان لیں کہ دنیا۔ آگے بڑھ رہی ہو یا پیچھے ہٹ رہی ہو۔ متحرک اور منقلب ہے!

جس رخ اور جس سمت میں دنیا چلی جا رہی ہے۔ اُسی رخ اور اسی سمت کی طرف اُسکی معاشرت بھی برابر چلی جا رہی ہے! رجحان طبع بھی تغیر معاشرت کے ساتھ پلٹتا جا رہا ہے؛ دماغی پسندیدگی و نفرت بھی اسی کے زیر اثر منقلب ہے؛ گویا تمام عالم جسمانی اور عالم دماغی ایک نا معلوم سمت کی طرف مجنونانہ یا نیچر کے قوانین کے زیر فرمان۔ گام زن ہے!

انسان کی تمام ترقی یا انقلاب اُسکے علم پر منحصر ہے: اور اُسکا علم اُسکی واقفیت اور تجربہ پر مبنی ہے: واقفیت میں اضافہ اسی طرح ممکن تھا کہ حاصل کردہ واقفیت کو۔ جو عرصۂ دراز کی تحقیقات و تجسس کا نتیجہ ہے روزمرہ کی زندگی میں بلا دوبارہ تحقیقات کرنے میں تضیع اوقات کے، آسانی کے ساتھ سمجھ لیا جائے اور باقی زندگی میں اُس میں اضافہ کی کوشش کی جائے! ایک دور لوہے کو کار آمد چیز ہونا معلوم کر لیتا ہے اور یہ علم آنے والے دور کو ورثہ کے طور پر اور چیزوں کے ساتھ ساتھ عطا کر جاتا ہے! دوسرا دور لوہے کے کار آمد ہونے کی تحقیقات کے لیے پھر دوبارہ وقت ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اس علم کو روزمرہ کی زندگی میں حاصل کرتے ہی اُسکے استعمال میں کوشاں ہو جاتا ہے اور اس سے کار آمد چیزیں بنا ڈالتا ہے؛ اب تیسرا دور اُس علم اوّلیں اور ان اشیاے ثانیہ، سب کو، ورثہ میں پاتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھکر اور چیزیں وجود میں لاتا ہے اسیطرح ماضی کی تحقیقات و ایجادات حال کو ورثہ میں پہنچتی رہتی ہیں اور حال اس علم و

واقفیت میں اضافہ کرکے مستقبل کے حوالہ کرتا رہتا ہے!! نہ صرف ایجادات و اشیا تک ہی یہ علم واقفیت محدود ہے بلکہ ہر ہر واقعہ میں یہ ہی کیفیت ہے!

حاصل کردہ علم و واقفیت کو آنے والی نسل کے لیے چھوڑ جانے کا نام فن تاریخ ہے! ہم معلوم کرتے ہیں کہ بارش جب کبھی ہوی ہے بغیر ابر کے نہیں ہوی ہے، اور آیندہ کے لیے ہمارا دماغ مان لیتا ہے۔ یقین کرلیتا ہے۔ کہ بغیر ابر کے بارش ناممکن ہے! ماضی کی تحقیقات عرصۂ دراز تک تجربہ کی کسوٹی پر صحیح اُترنے کے بعد حال کی نسلوں کے لیے بدیہیات کے مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے، اور اُس سے انکار کرنا بدیہیات سے انکار کرنے کے برابر سمجھا جاتا ہے!

تاریخ ماضی، رفتار زمانہ کا رنگ بتاتی ہے، حال میں اسکے موافق عمل کرکے مستقبل میں خوشگوار یا مفید مطلب نتیجہ کی امید کی جاتی ہے! گویا تاریخ انسانی تہذیب و معاشرت کے انقلاب کا جزد اعظم قرار پائی ہے! تہذیب امروزہ، تہذیب دیروزہ کی پابند ہے اور تہذیب فردا تہذیبِ امروزہ کی! دنیاے دیروز اگر اپنے تجربات وعلم کو نہ چھوڑ جاتی تو دنیائے امروز کو ورثہ میں کچھ نہ ملتا، اور اسی طرح وہ دنیاے فردا کو کچھ نہ دسکتی! نتیجہ یہ ہوتا کہ دنیاے دیروز جن باتوں کو سمجھ چکی تھی، ان ہی کے سمجھنے میں دنیاے امروز پھر از سرنو کوشاں ہوتی، اور دنیائے فردا بھی اسی گردش میں سرگرداں رہتی! گویا جانور اور انسان کا فرق زائل ہوجاتا!! جانور اپنے تمام عمر کے تجربات کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے لہذا اسکی نسل جس جگہ تھی وہیں کی وہیں رہتی ہے: اور انسان اپنے علم کو ورثہ میں دے جاتا ہے اس لیے اس کی نسل مفید مطلب اضافہ کرتی جاتی ہے!

ہر مسئلہ و ہر شعبۂ زندگی کی تاریخ۔ جس وقت سے انسان نے اسکو درج کرنا شروع کیا ہو۔ حاصل کی جاسکتی ہے: اور اسپر جزرس نظر ڈالنے سے پتہ چل سکتا ہے کہ

وہ خاص چیز اپنے بکار آمد ثابت ہونے کے زمانہ سے اسوقت تک، کسقدر تغیر اور انقلاب کے ساتھ بتدریج پلٹتی ہوئی موجودہ صورت تک پہنچی ہے! اسی کو زیر غور رکھ کر لیل و نہار کے رُخ کا لحاظ رکھتے ہوئے، آیندہ کے لیے بھی قریب قریب صحیح رائے زنی کی جاسکتی ہے!

دنیا۔ غالباً اپنے آغازِ انسانیت سے۔ مختلف حصوں اور فرقوں پر تقسیم چلی آتی ہے! انسان نے اسکو کسی مصنوعی کوشش کے ساتھ تقسیم نہیں کیا، بلکہ فطرت نے ہی مختلف آب و ہوا کے وجود سے اس تفریق کی بنا ڈالی، انسان نے صرف اُس قدرتی تفریق کے حدود معلوم کرنے اور اسکو بنی نوع انسان کے لیے کارآمد بنانے کی کوشش کی! اختلاف آب و ہوا، اختلاف خصوصیات مقامی۔ جنکا اثر جسم انسانی اور دماغ انسانی، دونوں پر مرتب ہوتا ہے، اختلافِ رجحان طبع، اختلافِ زبان، اختلافِ معتقدات اور اختلاف طرز معاشرت، یہ سب اختلافات انسانی آبادی کی تقسیم و تفریق کا باعث ہیں! ان اختلافات کو یکجا کر کے، اگر جزرس نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہو جائے گا کہ تمام اختلافات دو قسم کے ہیں۔ صرف دو قسم کے؛ یعنی :- (۱) مادّی (۲) طبعی یا دماغی! مثلاً "اختلافِ آب و ہوا" مادّی اختلاف ہے اور اسکا وجود خارج میں ہے؛ اختلافِ رجحانِ طبع دماغی چیز ہے اور خارج میں اسکا کوئی وجود نہیں!

تاریخ عالم میں انسان کے معتقدات کی تدریج صورت گیری کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان زمانہ جاہلیت میں ہر اپنے سے طاقتور جسم کو قابل پرستش سمجھ لیتا تھا۔ گویا بہ الفاظ دیگر۔ مادہ پرست تھا! مذہبی پیشوا یا پیغمبران مرسل اپنے اپنے حسب مراتب فلسفۂ مذہب کی تکمیل کے باعث ہوئے اور انسان مادہ سے ہٹ کر روح کی طرف چلا! مختلف خداؤں کو پوجتے پوجتے وہ وحدانیت کی لاثانی

حد تک جا پہنچا! یہ گویا روحانیت کی تکمیل تھی! اب مادہ پرستی نے روحانیت کے آگے سر جھکا دیا اور معتقدات و معاشرت۔ تمام تر۔ روحانیت کے سانچہ میں ڈھل گئیں! اس دور کے بعد فلسفۂ جدید نے مادہ کی تحقیقات و تجسس میں سرگرم رہ کر، پرانے خیالات کو ایسا خوبصورت جامہ پہنا دیا کہ عملی زندگی کا مشاہدہ اس ترقیِ مادہ سے روحانیت آمیز معاشرت کو متاثر پانے لگا! اب پھر معاشرت روحانیت کے بجاے مادّیت کی طرف منتقل ہوی! گویا موجودہ زمانہ۔ مذہب کی صورت میں نہیں بلکہ فلسفہ اور سائنس کی صورت میں۔ مادّیت کا زمانہ قرار پایا!

بتایا جا چکا ہے کہ دنیا مادّی اور دماغی اختلافات کی بنا پر ہمیشہ سے منقسم چلی آتی ہے! اس تقسیم پر انسانی معاشرت کا رنگ برابر چڑھتا رہا ہے۔ اور غالب رہا ہے! روحانیت کے زمانے میں جبکہ تمامتر معاشرت میں روحانی عنصر غالب تھا، تقسیم نوع انسان بھی اُسی عنصر کے لحاظ سے کی گئی تھی! روحانیت ایک دماغی کیفیت ہے، خارج اسکے وجود سے مبرّا ہے! تقسیم آبادی بھی جس بنا پر کی گئی، روحانی۔ یا دماغی۔ تھی اور خارج اسکے وجود سے بھی مبرّا تھا! یہ بنا جس پر دنیاے قدیم نے تقسیم نوع انسان کی عمارت چُنی، مذہب تھا: ساری دنیا مختلف معتقداتِ انسانی کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئی: ہمدردی، اتفاق، اخوت وغیرہ وغیرہ۔ معاشرت و تقسیم کے زیر اثر۔ یکسانیت معتقدات پر منحصر ہوگئیں! نتیجہ۔ یہ الفاظِ مختصر یہ تھا کہ۔ نوع انسان اپنے تمام نیچرل جذبات کو معتقدات کا تابع فرمان بنا کر مذہب کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی! اختلافِ مذہب نفرتِ باہمی کا باعث قرار پایا اور اتفاقِ مذہب اتفاقِ معاشرت و تمدن کا مرکز ٹھہرا! دنیا میں مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو وغیرہ وغیرہ مختلف دائرے قائم ہوگئے!

فلسفہ و سائنس کی ترقی نے بعد میں مادیت کو پھر زندہ کر دیا! نئے نئے اختراعات
روزانہ مشاہدہ میں رہکر، اور بکار آمد ثابت ہو کر، معاشرت کو اپنے رنگ میں رنگنے لگے:
تہذیب و تمدن پر۔ عملی زندگی میں۔ مادیت غالب ہو چلی اور اسی وجہ سے تقسیم
بنی نوع انسان پر بھی اسکا اثر مرتب ہوا! معاشرت کا مرکز روحانی۔ مادی قالب
اختیار کرنے لگا اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے والی دنیاے مغرب نے، بجاے مذہب
کے قومیت کو تقسیم نوع انسان کی بنیاد قرار دیا! اختلافِ معتقدات کے بجاے
اختلاف آب و ہوا یا اختلافِ خصوصیاتِ مقامی، اختلاف باہمی کا مرکز قرار پایا!
"خاص آب و ہوا اور خاص حدودِ ملک میں پیدا ہونا اور نشو نما پانا" بنیاد اخوت
و ہمدردی یا مرکز اتفاق و یکجہتی، ٹھہرا! تمام جذبات، قومیت۔ یا بالفاظِ دیگر، مادیت
کے رنگ میں رنگ گئے اور دنیاے جدید قومیت اور ملکیت میں تقسیم ہو گئی! قومیت
کے مختلف دائروں کے نام تاریخ قدیم میں بھی موجود تھے مگر اُس زمانے میں وہ
محض ملکی اعتبار سے استعمال کیے جاتے تھے اور انکو کوئی خاص اہمیت نہیں دیجاتی
تھی! فرانسیسی ہونے پر۔ یا امریکن ہونے پر اتفاق کا دارومدار نہیں تھا، بلکہ جذبات
و یکرنگی کا تعلق مذہب سے تھا! فرانسیسی و امریکن وغیرہ محض ملک ظاہر کرتے تھے
اُن سے کوئی خاص حُبِّ قومیت متعلق نہیں تھا! مگر اب تمامتر اتفاق و اخوت
فرانسیسی یا امریکن وغیرہ ہونے پر مبنی ہو گیا اور تمام جذبات اس احساس قومی
کے تابع فرمان بن گئے! گویا قدیم اعزاز مذہبی نے معمولی مذہبی حیثیت اختیار کر لی
اور قدیم معمولی لقب ملکی نے معزز ترین احساسِ قومی کی جگہ لے لی!

اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بنا معتقدات دماغی پر ہے، جنکا کوئی ذاتی
وجود خارج میں نہیں: اور قومیت کا دارومدار خاص حدود جغرافیائی اور خصوصیتِ
آب و ہوا پر ہے، جنکا وجود سرتاپا خارج میں ہے! تقسیم قدیم۔ اسی لحاظ سے۔

ایک ایسی تقسیم کہی جاتی ہے جسکا دار و مدار محض معتقداتِ دماغی پر ہے اور جس کا مادّی وجود خارج میں قطعی نہیں، علےٰ ہذا۔ تقسیم جدید ایک ایسی تقسیم سمجھی جاتی ہے جو مادی اصول پر مبنی ہے اور جس کا تعلق نیچرل اختلافات کے قواعد پر ایسی چیزوں سے ہے جو مادّی ہیں اور خارج میں ہر وقت موجود ہیں! استدلال جدید کہتا ہے کہ قدیم طریقۂ تقسیم نہایت ناقابلِ اعتبار و غیر مستقل ہے اور جدید طرزِ تقسیم ناقابلِ تغیر و مستحکم ہے! وجہ۔ نہایت مختصر الفاظ میں۔ یہ بیان کی جاتی ہے کہ معتقدات دماغی نیچر کے پیدا کردہ قوانین کے ہمرنگ نہیں ہیں۔ اور جو چیز قوانینِ قدرت کے ہمرنگ نہ ہو اس مادی عالم میں قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے غیر مستقل ہیں: ایک عیسائی ایک منٹ میں مسلمان ہو سکتا ہے اور ایک مسلمان ایک لمحہ میں عیسائی گویا منقسمہ دنیا کے ایک دائرہ سے فوراً دوسرے دائرہ پہنچ سکتا ہے، اس لیے یہ تقسیم نہایت ناقابلِ اعتبار ہے: ساتھ ہی معتقدات کا کوئی وجود خارج میں نہیں چل سکتا کہ کسی خاص شخص کے معتقدات میں کوئی تغیر اندر ہی اندر تو واقع نہیں ہو گیا؟ برخلاف اسکے، جدید طرزِ تقسیم قوانینِ قدرت کے پیدا کردہ اختلافات پر مبنی ہے اور جبتک وہ قوانین ہی تبدیل نہ ہو جائیں یہ تقسیم بھی نہیں تبدیل ہو سکتی۔ ایک شخص فرانس میں۔ محض قدرت و اتفاق کے حکم غیر مرئی کے بدولت، بلا کسی اپنی ذاتی رائے کے۔ پیدا ہوتا ہے اور نشوونما پاتا ہے، اب وہ کہیں جائے، کہیں رہے، کوئی مذہب اختیار کرے، لیکن تا دمِ آخر فرانسیسی ہی رہے گا اور فرانسیسی ہونے کو، فی الواقعی، وہ کسی طرح اور کسی حالت میں اپنے ذات سے الگ نہیں کر سکتا! گویا قومیت ایک ناقابل انفصال اتفاق ہے! اور قومیت پر مبنی ہونے والی تقسیم۔ اسی وجہ سے۔ نہایت مستحکم اور مادّی چیز ہے! مجھے اس جگہ اس بحث سے مقصود نہیں کہ دنیا کی آبادی کو پرانے رنگ میں تقسیم کیا جانا زیادہ

موزوں ہے یا نئے رنگ میں؟ واقعات کا من وعن بیان کردینا اور رائے زنی کو ہر شخص کے نقطۂ نظر کے موافق، اسی کے دماغ پر چھوڑ دینا۔ میری رائے میں بہترین طریقہ ہے!

دنیائے مغرب زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہی، مادیت کے سانچے میں ڈھلتی رہی، اور مذہب کو صرف روحانی جگہ دے کر، معاشرت اور عملی زندگی کو مادیت کے رنگ میں رنگتی رہی! معاشرت کے ساتھ ہی ساتھ تقسیم دنیائے مغرب بھی جدید اصول قومیت کے لحاظ پر مبنی ہوگئی اور مذہب کے بجائے قومیت نے مغرب کی آبادی کو مختلف حصوں میں تقسیم کردیا اس تقسیم کا عنصر تمام جذباتِ انسانی پر اسقدر غالب آیا کہ آج قومیت پر لاکھوں جانیں فخر کے ساتھ نثار کی جارہی ہیں! گویا مغرب نے عملی زندگی میں زمانے کا ساتھ دیا۔ اور مذہب کو روحانیت کے دائرۂ دماغی تک محدود کرکے معاشرت کو اس کے حلقۂ اثر سے نکال لیا!

سلطان حیدر جوش (علیگ)

"بغیر خلوص کے کوئی انسان کبھی بڑا آدمی، قابل وقعت نہیں ہوسکتا اور نہ وہ عظیم الشام کام کرسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بہت ہوشیار آدمی ہو۔ لوگوں کو بہت محظوظ کرسکتا ہو اور بہت مشہور ہو مگر اسس کو سنجیدگی کی ضرورت ہوگی۔ اور جب وہ بڑا آدمی ہوسکے گا۔

"ڈیمن"

حضرتِ انسان

حضرت انسان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے دنیا پر بھی نظر ڈالنی ہے۔ دنیا کب قائم ہوئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسکا تشفی بخش جواب ملنا ناممکنات سے ہے۔ اگر انسان کے اُس قلیل التعداد طبقے کو چھوڑ دیا جائے جو اپنی قوت متخیلہ کے بل پر بہت کچھ اُچھلتا کودتا ہے اور اُسکے زعم میں اپنے آپ کو کسی عقیدہ کا پابند نہیں مانتا اور جس وقت جو کچھ اسکے خیال میں آجاتا ہے اسکو خود ماننا تو ایک طرف دوسروں سے بھی متوقع ہوتا ہے کہ اسکا تتبع کریں مگر دنیا کی وہ آبادی جو اپنی قوت فہم کو اسقدر صحیح نہیں سمجھتی کہ اپنی ہادی خود ہو سکے اور جس نے کسی نہ کسی مذہب کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا ہے دنیا کی اس دہریہ پنے کی بحث سے کہ دنیا کیونکر بنی؟ آیا اسکو اس صورت سے جس میں کہ یہ آج ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے آسمان پر سے حضرت آدم کی طرح کسی جرم کی پاداش میں "دنیا" بنا کر پھینک دیا گیا؟ یا اس ضرورت سے پیدا کیا گیا کہ حضرت آدم کو یہاں بھیجنا مقصود تھا؟ یا خدا کو نہ ماننے والے ہم ہی جیسے انسانوں کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ شکل (میں موجودہ شکل کہنے میں غالباً غلطی کرتا ہوں کہ ہر زمانے میں اسکی موجودہ شکل کچھ اور ہی خیال کی گئی اور آج کون اس امر کا مدعی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے گول ہونے کا آج کا دعویٰ کل دنیا کو مثلث نہ ثابت کر دے گا۔) آپ سے آپ پیدا ہو گئی۔ کیونکہ عناصر تو موجود تھے ہی ان کی مختلف حرکتوں سے مختلف صورتیں پیدا ہوتی گئیں اور انکے عقیدہ کے مطابق بھی یہ بہت کچھ ممکن ہے ان ہی ابتدائی یا بنیادی عناصر کی مزید حرکت سے

آج جو شکل بیان کی جاتی ہے کل وہ نہ بیان کی جائے) اپنے آپکو بالکل علیحدہ رکھتی ہے
اور اس قسم کے خیالات کو مہمل جانتی ہے مذاہب کے پابند لوگوں نے تو اس فضول
بحث کو بہت کچھ چھوڑ کر دنیا کی ابتدا اُسی وقت سے مانی ہے کہ حضرت آدم آسمان
پر سے ایک مقام پر وارد ہوے جو زمین اور اسکے بعد اور ابتک دنیا کے نام سے
موسوم ہوی۔ ڈارون اور ان کے طبقہ کے دوسرے لوگوں کو تو قدرتاً اس سے
بھی اختلاف ہونا چاہیے کیونکہ دنیا کے اکثر مذاہب تو اشرف المخلوقات انسان کا
وجود حضرت آدم سے ہی مانتے ہیں مگر ڈارون صاحب جو ترقی کے اصولوں سے
ہماری نسبت زیادہ واقف معلوم ہوتے ہیں انسان سکے وجود کی بنیاد تو خبر نہیں
کہاں سے مقرر کریں گے مگر وہ شکل انسانی کی انسان ہونے سے پہلی منزل کا پتہ
تو بندر سے دیتے ہیں۔ اگر ڈارون صاحب کے قول کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو
کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بندر کا وجود بندر کی ہی ذات سے ہو اگر اسی طرح
بندر کا وجود کسی اور چیز یا جانور سے قرار دیا جاے اور اس طرح ایک دوسرے کے
وجود کے متعلق ڈارون کے خیالِ دوربین کو کام میں لاکر تحقیق کی جائے تو انسان
کا وجود خدا جانے کہاں سے نکلے گا اور خدا جانے کچھ وجود کی بنیاد نکلے گی بھی یا
نہیں آگے چل کر اسکے متعلق بھی یہ ہی کہا جاے گا کہ بعض عناصر نے مل کر یہ شکل
اختیار کی خیر کچھ بھی ہو ہم تو انسان اور دنیا کی ابتدا اُسی وقت سے کرتے ہیں
جب سے حضرت آدم دنیا میں تشریف لائے۔ حضرت آدم کے ساتھ ہی حضرت
حوا کو بھی مسلمانوں اور بعض سماوی مذاہب کے اعتقاد کے مطابق جنت سے نکالا گیا
تھا چنانچہ اس مقام پر دونوں کو گرایا گیا جسکو آج ہم دنیا کہتے ہیں گو اس وقت
دنیا کی حد بہت تھوڑی ہوگی اور خبر نہیں اس وقت اس خطۂ زمین پر کس لفظ کا
اطلاق ہوتا ہوگا۔ غرضکہ جب خلد سے نکلنے کے بعد دوسرے خطہ میں حضرت

آدم اور حوا کی ملاقات ہوی اور اس وقت سے دنیا نے اپنا وہ دور شروع کیا جس پر ہمیں نظر ڈالنی ہے۔

چونکہ دنیا صرف آدمی اور زمین پر مشتمل نہیں ہے اسلیے بظاہر ہم نے جو لفظ دنیا استعمال کیا ہے اسکے لیے ہم کو دنیا کی کل موجودات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے مگر ہم اپنے اس مضمون میں چونکہ انسان اور اسکی مختلف ترقیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اس لیے صرف انسان یا آدمی کا زمین پر آنا اور پھر مختلف حالتوں کا پیدا ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو اس وقت پیش نظر ہیں۔ باقی دنیا کی موجودات سے گو ہم اسوقت بحث نہ کریں مگر ہم انکے وجود کو نظر انداز کر کے پورے طور پر اپنا کام نہیں نکال سکتے۔ دوسرے یوں بھی دوسری موجودات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ انھوں نے کوئی ترقی فی نفسہی نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ خدا نے اشرف المخلوقات قرار دینے میں یہ ہی رمز رکھی تھی کہ انسان کو کامل جانور ہونے کی تمام بلکہ ضرورت سے زیادہ قوتیں دیدی جائیں مگر کمال پر پہنچنے یا کامل جانور بن کر پھر انسان کہلانے کے لیے اسکو خود اُن قوتوں کو استعمال کرنا پڑے۔ اگر خدا نے ایک طرف دوسرے حیوانات کی طرح انسان کے لیے زندگی کے تمام کلیے قائم کر کے اسکو دوسرے حیوانوں کے برابر نہیں کیا تو دوسری طرف اُسکو وہ فہم و ادراک مرحمت کیا جو انسان کو کامل بنائے اور اسکو دنیا کی موجودات میں سب سے افضل رکھے انسان کو خود انسان بننے کی جو قوت دی گئی ہے (عقل۔ضمیر وغیرہ) وہی وہ چیز ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کہلوایا۔ اگر انسان اپنے تمام کاموں اور انتظاموں کو جانوروں کے انتظامات کے برابر بھی مکمل نہ کر سکے تو وہ دراصل اس لقب سے ملقب نہیں کیا جا سکتا جو اسکے لیے تجویز ہوا ہے۔

ظاہرا طور پر نظام قدرت یا عالم موجودات میں جانوروں کا انتظام مکمل ہوتا ہے

اگر آپ صرف چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں ہی کے انتظام پر غور کریں تو معلوم ہوگا
کہ ان کا انتظام ہم انسانوں کے انتظام سے زیادہ مکمل ہے اسکے علاوہ ایک جانور
ہرگز اُس چیز پر مُنھ نہ ڈالے گا جو اُسکے لیے قدرت نے وضع نہیں کی مثلاً اگر آپ
ایک گدھے سے اس امر کے متمنی ہوں کہ وہ کتے کی طرح گوشت کھانے لگے تو یہ
گدھے کے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنی اس عالم موجودات کی سب چیزیں انسان کے لیے
ممکن ہیں پیر اس سبب یہ مقصد تھا کہ خدا کا انسان کو بنا کر اسکو اشرف المخلوقات
قرار دینے سے یہ مطلب تھا کہ وہ خود اپنے فہم اور ادراک سے جو اسکے شرف کی جڑ
ہیں "کچھ نہیں" سے "سب کچھ" بلکہ "سب کچھ" سے بھی "افضل" بن کر اپنے تئیں سب
موجودات میں ممتاز بنائے۔ سب پر حکومت کرے۔ دنیا اور اسکی کُل کائنات کو
اپنے تابع رکھے اور آپ پہلے کامل حیوان بنے یعنی اپنے میں ان تمام انتظامات کو
مکمل کرے جو خدا نے دوسرے جانوروں کے لیے بدرجۂ احسن کیے ہیں اور اسطرح
ان جانوروں سے ممتاز ہو کر دنیا کی تمام چیزوں پر قبضہ جمائے۔

کوئی چیز دنیا میں کسی دوسری چیز سے افضل اُسی وقت کہلائی جا سکتی ہے
جس وقت وہ اپنے میں تمام وہ خوبیاں بھی رکھتی ہو جو اس چیز میں موجود ہیں
جس سے برتر اسکو بننا ہے اور اسکے علاوہ اسمیں کچھ اور زیادہ خوبیاں ہوں
اب انسان کے وجود سے اس کی ترقیوں کی طرف رجوع کیجیے۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے اور اسکے علاوہ بعض حالات سے بھی معلوم ہوتا ہے
کہ انسان پہلے ننگا رہتا تھا جو ملتا تھا اسے کھا لیتا تھا۔ جانور کیا جانور سے بھی
بدتر تھا۔ اس وقت تک دنیا میں بعض مقامات پر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں
جو ترقی کے اُسی درجے پر ہیں جو قدرت نے ان کو عطا کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد کے
حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ترقی کی اسکے ایجاد کرنے والے دماغ نے

بار بار ٹھوکا دے کر اسکو بتایا کہ تو اس لیے نہیں پیدا ہوا کہ یہاں کا یہیں رہ جائے
بلکہ تو ترقی کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد جو انسان کی شکل
نظر آئی تو اسکے ستر کی جگہ پتے بندھے ہوے ہیں اسکے ہاتھوں میں نوکدار
پتھر ہیں اب وہ انسان کو نہیں کھاتا بلکہ موجودات میں سے دوسری اقوام کے
جانداروں کو مثلاً چرندوں پرندوں کو ان پتھروں کی نوکوں سے کاٹ کر کھاتا ہے
پھر تاریخ کے کچھ اوراق اُلٹے اور دو تین کیا بلکہ کچھ زیادہ صدیوں کا غوطہ دے کر
جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت انسان ہیں تو ویسے ہی مگر اب ان کو یہ خیال
پیدا ہو چلا کہ کچا گوشت کھانا ٹھیک نہیں اسکو دھوپ میں سُکھایا مگر اس سے کچھ
اسکا مقصد پورا نہیں ہوا اور اس وقت قدرت نے قاصر بندے کی مدد کی اور
ایک دن حضرت انسان نے ایک جانور کو مارنے کے لیے زور سے پتھر جو پھینکا تو
وہ اُس جانور کے لگنے کے بجاے دوسرے پتھر سے ٹکرا گیا اور اس سے ایک روشنی
پیدا ہو گئی روشنی نے پیدا ہوتے ہی ترقی کی اور اُس گھاس کو جو اس پتھر کے
قریب تھی اپنے زیر اثر کرلیا انسان یہ ماجرا دیکھکر بہت تعجب میں ہوا پہلے تو
دور سے تماشا دیکھا پھر وہاں سے بھاگ کر اس روشنی کے اکھاڑے میں کود ہی
پڑا پہنچتے تو پہنچ گیا مگر جاتے ہی جو گرمی لگی تو پریشان ہوا اور واپس بھاگنے لگا
واپس پہنچتے پہنچتے آپ کے سب بال وغیرہ جل گئے اور تمام بدن میں بیحد
سوزش پیدا ہو گئی ۔ مگر آپ کو اس سے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ اس سے
گوشت ضرور پک جائے گا۔

کئی صدی بعد جو دیکھتے ہیں تو وہ ہی انسان صاحب کھال منڈھے ہوے
تشریف فرما ہیں پتھروں کا چولہا بنائے ہوے، مٹی کی ہنڈیا میں کچھ پکا رہے
ہیں اور اب آپ اکیلے نہیں ہیں آپکے طبقے کے کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ غرض اسطرح

ترقی کرتے کرتے حضرت انسان آدمیوں میں داخل ہو گئے جب کھانے پینے ساتھ رہنے سہنے کا مزا پڑ گیا جانوروں کے مارنے کے لیے تیر کمان بنا چکے تو آپ کی بلند پروازی نے اور رنگ دکھایا اور کچھ دنوں بعد آپ شہر میں رہتے ہوئے عمدہ عمدہ پوشاکیں زیب تن کیے ہوئے بندوقیں ہاتھوں میں لیے ہوئے نظر آئے اور ایک اور صلاحیت بھی آپ میں دکھائی دی کہ آپ اپنے ہم جنسوں میں سے ایک کو اپنے اوپر حکومت کر لینے دیتے ہیں۔ گھوڑے ہاتھی آپ کے تابع ہیں تمام جانوروں پر آپ کو قدرت ہے کڑوے تیل کے چراغ گھروں میں روشن ہیں اب حضرت انسان جھونپڑوں اور درختوں کے نیچے جانوروں کی طرح بسیرا لینے کی جگہ مٹی اینٹ کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ قوموں سے لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں ایک دوسرے کو مار بھی ڈالتے ہیں مگر ان سے اگر یہ کہو کہ فلاں پرستان میں ایک پری ایک گاڑی میں بیٹھ کر تمام دنیا کی سیر کر آتی ہے مگر اس گاڑی میں نہ گھوڑا ہے نہ ہاتھی نہ کوئی اور جانور اور اس کے محل میں تمام چراغ آپ ہی آپ روشن ہو جاتے ہیں اور ان چراغوں میں نہ تیل جلتا ہے نہ وہ چراغ موم بتی کی شکل کے ہیں تو حضرت انسان کہنے والے کے لتے لے ڈالتے ہیں اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہوائی تخت کا ذکر کرو تو آپ چونکہ کچھ صدیوں کے بعد مذہب کے پابند ہو گئے ہیں اعتقاد کے خیال سے ہاں تو کہہ دیتے ہیں مگر یقین نہیں آتا۔

ان ہی انسان کو ایک صدی بعد دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ریل میں سوار موٹر میں سوار اور سب سے زیادہ ہوائی جہاز پر سوار نظر آتے ہیں اور بعض تو یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں بھی لوگوں کو اتنی زیادہ انجنیری آتی ہو کہ انھوں نے ہوائی جہاز کے نمونہ کا تخت

بنا لیا ہو۔ بعض بچارے اب بھی اعتقادات کی بندش میں جکڑے ہوئے ہیں اور چپ ہیں۔ دیکھتے سب کچھ ہیں مگر بولتے نہیں۔ اس وقت بھی اگر آپ سے کوئی یہ کہنے لگے کہ میاں توپ بندوق کو چھوڑو ہم تم کو ہوا کا ایک میگزین دیتے ہیں جس سے سب مرجائیں گے تو یقین نہیں آتا مگر ایک دس برس کے بعد یہ ہی حضرت انسان خود لوگوں کے مارنے میں ہوا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک مقام سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر گولہ پھینکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب یہ لوگ اسقدر بد اعتقاد یا بھولے نہیں رہے اب تو ان کو امریکہ کے مشہور سائنس داں کے یہ کہنے کا یقین آجاتا ہے کہ سائنس اور انسان دونوں موجود ہیں اور ان دونوں کے موجود ہونے کی حالت میں معلوم ہوگا کہ دنیا میں کیا کیا ایجادیں ہوتی ہیں اور آج کی چیزیں تم کو کل کی چیزوں کے آگے اتنی ہی ہیچ معلوم ہوں گی جیسے موٹر کے آگے پرانے زمانے کی شکرم۔ اب اُن کو یہ کہنے کا بھی یقین آجاتا ہے کہ اس نظام عالم میں ایک نہیں بہتیری دنیائیں ہیں چنانچہ مریخ سائنس میں ہماری دنیا سے اسقدر آگے ہے کہ وہ ہم سے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری کرنا چاہتا ہے مگر ہم اسکے پیغامات سمجھنے اور حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ (باقی آئندہ)

(ایڈیٹر)

خط وکتابت

جو صاحب اب "تمدن" کے متعلق کسی قسم کی خط وکتابت کریں۔ پرچہ بھیجنے یا نمونہ بھیجنے کی ہدایت کریں یا مضامین بھیجیں وہ خاص طور پر اس امر کا خیال رکھیں کہ اب رسالہ "تمدن" کا دفتر کل جھاؤ لال لکھنؤ میں ہے۔ جو صاحب "تمدن" کے سابقہ پتہ پر خط وکتابت کرینگے اُنکی تعمیل نہونے کی شکایت کی تلافی ہمارے امکان سے باہر ہے۔ ایڈیٹر

فلسفہ راز و نیاز

(۱)



نظام عالم میں سب سے زیادہ قابل قدر انسان کا وجود ہے جسمیں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ حیات انسانی کے کسی ایسے پہلو کو مکمل نہیں کہہ سکتے جس میں اولاً فرداً فرداً مرد اور عورت سے اور ثانیاً مجموعی طور پر مرد عورت یا عورت۔ مرد کے مسئلہ پر غور نہ کی جائے۔

مرد اور عورت پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے میں یہ لازم آئے گا کہ مرد کی صفات اور خصوصیتیں علیحدہ بیان کی جائیں اور عورت کی صفات اور خصوصیتیں علیحدہ۔ دونوں کے مخلوط مسئلہ کے یکجا مطالعہ میں واضح طور پر بیان کرنا ہوگا کہ کون کون سی صفات اور خصوصیات دونوں میں مشترک ہیں اور یہ کہ

(۱) جانبین کی مشترک صفات اور خصوصیات کے ایک جگہ جمع ہونے سے ان میں کیا جلا ہوتی ہے

اور (۲) غیر مشترک صفات اور خصوصیات کے ایک جگہ جمع ہونے سے علیحدہ علیحدہ مرد اور عورت پر کیا اثر ہوتا ہے۔ انجام کار یہ دیکھنا ہوگا کہ اس اختلاط اور معجون مرکب سے مجموعۂ حیات انسانی کس کس طرح اور کس درجے تک ترقی یاب ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ مرد اور عورت کے فطری تعلق اور اتحاد سے جسمانیات دماغیات قلبیات اور روحانیات کے عالموں میں کیا کیا تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان تحریکوں کے نتائج ترقی عالم کے

اہم مسئلہ میں کہانتک حصّہ لیتے ہیں۔

(۱) نفس مضمون پر بحث کرنے سے پہلے جسمیں زیادہ ترکیبات انسانی سے بحث کرنی ہوگی اور جن کو ہم آیندہ باطنیات سے تعبیر کریں گے ہم کو بیرونیات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

تمام بیرونیات ایک پہلو سے مجموعہ محاسن ہے ہر طرف حُسن ہی حُسن ہے زمین پر شجر حجر پھول پتے۔ دریا۔ پہاڑ اور بے شمار رنگین اور پُر بہار اشیاء جنمیں معدنیات بھی شامل ہیں ایک لاانتہا حُسن کے سلسلہ کو قائم کرتی ہوی نظر آتی ہیں۔ چرند۔ پرند۔ دریائی جانور درندہ۔ سانپ بچھو۔ حیات عظیم کی بے مثل کڑیاں ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اوپر نظر کرو تو آسمان اپنے چاند سورج ستاروں اور مختلف شواہد قدرت کے ساتھ کوس لمن الملک بجا رہا ہے اسکی دنیا کیا بیشمار دنیائیں بالکل علیحدہ ہیں اور حیات عظیم میں تکمیلی ضرب دینے کی مدعی معلوم ہوتی ہیں۔ موسموں کا تغیر تبدل بذات خود ایک دلچسپ سماں ہے مگر جب اسکے جلو میں مختص الموسم نباتات میوے ترکاریاں وغیرہ حساب میں لگائی جائیں تو ایک علیحدہ علم ہو جاتا ہے۔ ان سب شواہد قدرت کی جان شکل وصورت رنگ روپ چھٹائی بڑائی۔ موٹاپن دُبلاپن اور ان سب کی اصل گولائی حُسن کی الف۔ب۔ت ہے۔

اس وسیع دائرہ حُسن میں انسان جو خود بھی بدرجۂ غایت حسین ہے قرار گزین ہے۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب اسکے بیرونیات اسقدر حسین ہیں تو اس کے باطنیات اس سے کم حسین ہوں گے۔

(۲) حسن وجمال کے متعلق عقلا نے مختلف کلیئے قائم کیے ہیں۔ غالب راے یہ ہے کہ خلاق عالم جمال مطلق ہے اور اسی کا ایک ادنی جلوہ کائنات میں

ظہور پذیر ہے۔ اس لیے شواہد قدرت کے جمال کو انتہائے جمال سمجھنا غلطی ہے۔ بلکہ ادراک جمال قلب انسانی کو اس حالت میں حاصل ہوتا ہے جب وہ محسوسات سے گذر کر روحانی سکون حاصل کرتا ہے۔ مگر بغیر شکل وصورت رنگ وروپ کے جمال کا مفہوم مرتب نہیں ہو سکتا۔ اسمیں بھی صرف یہ دقت ہے کہ شکل وصورت رنگ وروپ کے ساتھ خواہش اکثر وابستہ ہو جاتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہش قوائے مدرکہ کو اپنی خدمت میں مصروف کر لیتی ہے۔ اور اسی شکل و صورت اور رنگ وروپ میں جو جمال مطلق جلوہ گر ہوتا ہے اسوقت تک قوائے مدرکہ کو نہیں پہنچنے دیتا اور چونکہ نیکی۔ علم اور جمال (یا بعضوں کے نزدیک صدق جمال اور نیکی) آپس میں نہایت رابطہ اور اتحاد رکھتے ہیں۔ اس لیے جمال کے صحیح ادراک میں جسقدر نقص رہ جاے گا اسقدر نیکی اور علم یا صدق اور نیکی میں بھی کمی رہ جاے گی۔ لہذا جمال حقیقی کی تلاش انسان کو مجموعۂ محاسن بناتی ہے۔

ان سب باتوں کو مان لینے کے بعد صرف ایک ایسے فلسفہ کی ضرورت باقی رہتی ہے جو حسن ظاہری سے خواہشات نفس کو دائمی طور پر وابستہ نہ رہنے دے بلکہ جس کے ذریعہ سے قلب انسانی جمال حقیقی کی طرف ہدایت پائے یا یوں کہیے

حسن سے مرد اور عورت جو حسن ظاہری کے بہترین نمونہ ہیں ایک دوسرے کے حسن سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کی کیفیات قلب کو سمجھکر جمال حقیقی اور زندگی کے اعلےٰ مدارج کی طرف ترقی کریں اس فلسفہ کا نام ہم نے فلسفۂ راز و نیاز رکھا ہے جو ہمارے اس مضمون کا عنوان ہے۔

(۴) اب ہم (جیسا اس مضمون کے شروع میں ظاہر کیا گیا ہے) مرد اور

عورت کی صفات اور خصوصیات سے بحث کرتے ہیں۔ اس بیان میں فلسفیانہ پیچیدگیوں میں جانا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جہانتک ممکن ہوگا اسکو سہل کیا جائیگا

(۱)۔ جیسا کہ اسکی ساخت سے ظاہر ہے۔ مرد زیادہ محنت کرنے زیادہ تکلیف برداشت کرنے۔ معاش اور ترقی کی تدابیر عمل میں لانے۔ جلب منفعت اور دفع مضرت کے سامان فراہم کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

(ب) عورت محنت اور تکلیف کو سمونے اور خوشگوار بنانے۔ سامان ترقی کو سلیقہ سے برتنے اور جلب منفعت اور دفع مضرت کی تدابیر میں اعتدال اور میانہ روی پیدا کرنے کے لیے ہے۔

اس اعتبار سے مرد کو زندگی کی نثر اور عورت کو زندگی کی نظم کہنا بیجا نہ ہوگا۔

آگے چلیے تو مرد اپنی شجاعت لیاقت دولت وغیرہ کی داد طلب کرنے کا قدرتاً مریض معلوم ہوتا ہے۔ یا بتبدیل الفاظ عزت اور فضیلت طلب واقع ہوا ہے۔ یہ عزت اور فضیلت طلبی غرور کے درجے پر پہنچ کر مرد کو جانور سے بدتر کردیتی۔ مگر قدرت نے اس کا علاج عورت کی فطرت سے کیا ہے۔ اور جہاں قدرت نے عورت کو نرمی۔ حلم۔ صبر اور محبت کے صحیح مفہوم سے جو عین داد ہے مزین کیا ہے۔ وہاں اسکی صورت شکل۔ نقل و حرکت۔ مزاج اور برتاؤ میں ایک ایسی پاکیزہ لچک رکھدی ہے جس سے مغرور سا مغرور آدمی بھی متاثر ہوجاتا ہے۔ مرد اور عورت میں مشترکہ جفت بقاء حیات انسانی کی خواہش اور آرام اور سکون حاصل کرنا ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ یہ بقا اور سکون شجاعت لیاقت دولت وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے مگر عورت سمجھتی ہے کہ یہ اہم کام زندگی کی کرخت باتوں میں نرمی پیدا کرنے

اور زینت کا طمع دینے سے پورا ہوتا ہے۔

غیر مشترک صفات مرد اور عورت کے یہ ہیں مرد اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بہت جلد جبر اور بے اعتدالی کو کام میں لانے لگتا ہے جسکا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے قربان کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ اسکے برعکس عورت ہر وقت قربان ہونے کے لیے تیار رہتی ہے

اب مرد اور عورت کو جمع کرنے سے منشاء قدرت یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک کی عزت طلبی دوسرے کی محبت رسی ایک کی سرفرازی دوسرے کی شاعرانہ رنگینی۔ ایک کی دنیا بھر کو اپنے لیے قربان کرنے کی خواہش دوسرے کی ہر یگانہ اور بیگانہ کے لیے قربان ہو جانے کی نیت۔ غرض یہ سب چیزیں مل کر زندگی کے غبارہ کو اعتدال اور لطافت کے ساتھ پرواز میں لائیں اور خواہشات جسمانی اور نفسانی کی زنجیروں کو محبت کے غیر محسوس مگر پر اثر ضرب سے توڑ کر حیات حقیقی اور کیف روحانی سے مشرف ہوں۔ سبحان اللہ

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا ہے

(۲)

یہ دریافت کرنے کے بعد مرد اور عورت کا یکجا ہونا بہترین منشاء قدرت ہے مذہب اور رواج نے ابتداء سے سینکڑوں پلٹے کھائے مگر آخر یہ لڑھکتی ہوئی گیند یہیں آکر ٹھہری کہ شادی بیاہ اور محبت کے بیش قیمت تخت پر ان کو جلوہ افروز کرنا چاہیے۔ بعض ملکوں میں شادی سے پہلے محبت کا ہو جانا لازمی قرار دیا گیا۔ بعض ملکوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم اسطور کی دی گئی کہ بعد شادی کے محبت کا نہ ہونا شاذ و نادر ٹھہرا۔ بہر حال محبت دونوں اسکیموں میں جزء مشترک رہی محبت بعض حالتوں میں اتفاقی اور پہلی مرتبہ دوچار ہونے کا نتیجہ بھی سہی مگر بھر بھی

مزاج شناسی اور عام رواداری کے بہت سے مدارج ایسے ہیں جنکو نیک نیتی اور احتیاط کے ساتھ طے کرنے سے مرد اور عورت دونوں کا بام محبت پہ پہنچنا ناممکن نہیں۔ اسوقت ہم صرف اسی شق پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ مرد ہوں یا عورتیں بعضے بالطبع خاموش۔ سنجیدہ اور جذبات کو پوشیدہ رکھنے والے ہیں۔ برعکس اُنکے بعض زیادہ بولنا چالنا۔ جنسی مذاق اور جذبات کا اظہار کچھ بُرا نہیں سمجھتے۔ جہانتک صداقت اور راستبازی شامل ہو وہاں تک ان دونوں باتوں میں کوئی عیب نہیں مگر ان ہی متضاد صفات میں سے اگر خاوند ایک صفت کا ہو اور بیوی دوسری صفت کی تو باوجود حقیقی محبت کی پوشیدہ چنگاری کے دونوں میں دن رات کے برتاؤ میں بہت کچھ اختلاف بلکہ بعض اوقات مخالفت پائی جائے گی اور کوئی بھی اُنکو سچی محبت اور رواداری کے بہترین نمونے نہ تسلیم کرے گا۔ مگر یہی دونوں اگر ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیں اور دن رات کے برتاؤ میں میانہ روی اختیار کر لیں تو گو شروع شروع میں جوشیلی طبیعت والوں کے لیے گونہ باعث افسردگی اور پژمردہ دلی ہوگا مگر آگے چل کر ان ہی دونوں میں ایسا سمویا ہوا زریں رشتہ سچی محبت کا قائم ہو جائے گا جو نہ صرف اُن کی متحد زندگی کو کامیاب اور شاداب کرے گا بلکہ جو اوروں کے لیے بھی قابل تقلید ثابت ہوگا۔

جن نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے اُنکو اس معاملہ میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مغرب میں مرد اور عورت دونوں دل کی حقیقی رہنمائی سے یکساں طور پر محبت کا اظہار کمال صداقت و شرافت سمجھتے ہیں ایشیائی عورتیں مرد کی طرف سے سچی محبت کا اظہار ہونے پر اُسی رفتار بلکہ اُس سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ استقبال محبت کے لیے تیار ہوتی ہیں اور جان

قربان کر دیتی ہیں مگر یکساں الفاظ یا یکساں حرکات و سکنات سے یکساں طور پر اظہار محبت سے قاصر رہتی ہیں۔ اُسے کسی حال میں فقدان محبت پر محمول نہ کرنا چاہیے۔ اولاد ہونے کے بعد عورت کا دل فطرتاً بچوں میں زیادہ لگ جاتا ہے اور خاوند کے ساتھ ہر وقت اُٹھنے بیٹھنے میں کمی ہونے لگتی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُسے خاوند سے محبت کم ہو گئی ہے۔ مرد کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اولاد ہونے کے بعد عورت دنیا کے مقدس ترین کام میں مصروف ہے اور لازم تو یہ ہے کہ مرد اُس کا پورا ہاتھ بٹائے مگر یہ نہ ہو سکے تو اُس سے محبت میں کمی کرنے کی شکایت تو نہ کرے۔

جس طرح زن و شو کی محبت فطری اور مقدس ہے اُسی طرح اولاد کی محبت بھی قدرتی اور پاک ہے۔ دونوں محبتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں دونوں ایک ساتھ چلنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ محبت خواہ کتنی ہی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو ہر جزوی حالت اور عادت کا تفحص یا اظہار اور ہر بات میں انتہا درجہ کی بے تکلفی کچھ بہت مفید ثابت نہیں ہوتی۔ خصوصاً عورت کے لیے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ عورت اپنا دل الگ رکھے یا خواہ مخواہ کھنچی رہے مگر اُسے چاہیے کہ وہ کسی حال میں اپنے آپ کو نہ بھولے اور نفاست اور خوش دلی کے ساتھ خوشگوار رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھے۔ جس سے اُسکی قدر و منزلت میں فرق نہ آئے۔ کیونکہ اسی قدر و منزلت پر گھر کے قیام اور بچوں کی تربیت کا انحصار ہے۔ سچی محبت میں پوری قدر و منزلت خود مضمر ہوتی ہے مگر بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں میں یہ قدر و منزلت مجروح ہوتے ہوتے محبت کے مستحکم اور مضبوط قلعہ کو بھی بوسیدہ کر دیتی ہے۔ اور زندہ درگور ہیں وہ خاوند اور بیوی جنہیں باہمی محبت اور قدر و منزلت نہ رہے۔

(باقی آئندہ)

سرفراز حسین

اُردو شاعری

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

استاد الشعراء میرؔ مرحوم نے شعر بالا بظاہر اپنی حالت پر لکھا ہے یا اسمیں عموماً عاشقوں کی رسوائی و بے توقیری کا نقشہ کھینچ کر دکھلایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عاشقی کبھی اسقدر عزت سادات یا مشائخ کو خاک میں ملانے والی نہیں ثابت ہوئی جسقدر شاعری قولاً و فعلاً شیخ، سید، مغل، پٹھان، چھتری راجپوت کو فرداً فرداً نہیں بلکہ من حیث القوم بھی بدنام و رسوا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور اُردو شاعری کے تمام زمانے پر نظر کرنے کے بعد اس تمام لٹریچر کا اکثر حصہ ایسا نکلے گا جس کو پڑھکر ہمیں بے اختیار یہ کہنا پڑے گا

اس شاعری میں عزت اقوام بھی گئی۔

جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ شاعر سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ، ملک و قوم کے جذبات و محسوسات کو ظاہر کرتا ہے اور جب ہم ہر شاعر کے سوانح پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کرتے ہیں کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی مصیبتوں کا مرثیہ یا کامرانیوں کا زمزمہ نہیں گایا ہے تو ہم اس کلیہ کو جو تحریک شعر گوئی کی بنا ہے، شعر ذیل میں تسلیم کرتے ہیں ؎

طبع شاعر کو بنا دیتا ہے گھر دل ذکر درد
داغ کھا کر ہر کسی کے رازداں ہم ہوگئے

اور یہ سوچنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ اُردو شاعری کی کیا کیا خصوصیتیں ہیں

اور ان خصوصیتوں کے محرک و مؤید کون کون اسباب ہیں۔
عموماً تسلیم کیا گیا ہے کہ شمس اللہ ولی اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالنے والے ہیں اور ان ہی کی باغبانی کا نتیجہ ہماری شاعری کے پھول پھل ہیں۔ گویا اُردو شاعری نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جنم لیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مغلئی خصوصیات مٹ چکی تھیں یا مٹنے ہی کو تھیں۔ ایرانی تمدن اور ہندی معاشرت جو اصل آریہ معاشرت نہ تھی بلکہ ایک مفتوح قوم کی مخلوط اور انحطاط پذیر معاشرت رہ گئی تھی، شاہی مزاج کا خمیر بن چکی تھی۔ اور یہ اثر فرق حکومت سے اعضاے رئیسہ، قوی، رگ و ریشہ میں سے سرایت کرتا ہوا ملک کے طبقے تک پہنچ گیا تھا۔ پس اُردو شاعری اس زبان کی شاعری بنی جو بھاشا کے الفاظ، فارسی کی صرف و نحو اور ترکی، عربی، ہندی، فارسی محاوروں، اصطلاحوں اور طرز ادا سے مرکب تھی۔ اُردو زبان کو شاہی سکہ تو بہادر شاہ ظفر کے بیس تیس سال قبل ہی ملا، جبکہ اُردو محاوروں، استعاروں اور مثالوں کی سند بیگمات سے لی جانے لگی۔ اور علمی درجہ اسکو شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی کے طفیل حاصل ہوا، جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ ورنہ اس سے پہلے علماء اُردو میں کسی قسم کی تحریر کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ولی دکن سے دہلی میں اپنا دیوان لے کر آئے ہیں تو ان کے کلام کو تحسین و استعجاب سے سُنا اور پسند کیا گیا۔ ولی کے کلام سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ فارسی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسکے معنے یہ نہیں کہ ان کے طرز بیان میں فارسیت یا غالبیت تھی بلکہ یہ کہ اُنکے کلام میں جذبات کا اظہار فارسی شعراء کے اسلوب پر کیا گیا تھا۔ اس بارے میں ہم اُن کو الزام نہیں دے سکتے

کہ انھوں نے غیر ملک کی زبان میں حسن و عشق کا چرچا کیا۔ وہ مجبور تھے ؎

نالہ پابند نَے نہیں ہے

فریاد کی کوئی نَے نہیں ہے

آریہ ورت کی اصلی شان و شوکت کا نظارہ ان کی آنکھوں نے دیکھا نہ تھا بھاؤ بھوتی، ویاسی، والمیک اور کالیداس کا معجز نما اور رنگا رنگ کلام انکے کانوں نے سُنا نہ تھا۔ خود وہ شیریں اور ام الالسنہ زبان جس کے بولنے والوں کی نسلیں آج دنیا کے مختلف اقطاع میں پھیلی ہوی ہیں، زبان کی حیثیت سے ناپید ہو چکی تھی۔ پس سنسکرت کی شاعری سے کسی مقبول و معقول درجہ تک استفادہ کرنا دائرہ امکان سے بعید تھا۔ شاعری کے میدان میں جو تخیلات ملک کے ہر طبقے پر حاوی تھے وہ خاقانی، فردوسی، انوری، سعدی، حافظ، جامی، قاآنی، عرفی، فیضی، حزیں وغیرہم شعرا اساتذہ کے تخیلات و تصرفات تھے۔ ان زبردست و قادر الکلام شعرا کے ساتھ سمرقند، ترکستان، ایران کے مناظر چمن، کہسار، ندی نالے بھی اہل ہندوستان کے جذبات کے دردمند و غمگسار ہو گئے۔ بعینہ جیسا کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ یورپین طرز معاشرت، طریق بود و ماند اکل و شرب، لباس و وضع، گفتگو و طرز خیال ہماری زندگیوں کا لازمہ بن گئی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کوہِ ہمالہ دنیا کا عظیم ترین پہاڑ ہے، مگر ہم تعریف کوہ الپاین کی ہی کریں گے کیونکہ ایسا کرنا اگر اس تاریخی پہاڑ کو دیکھ لینے کی دلیل نہیں ہے تو کم از کم اس سوسائٹی میں ملنے جلنے اور اس لٹریچر سے آشنا ہونے کی دلیل ضرور ہے جس میں اسکی مدح سرائی کی گئی ہے۔ اگر چشم حقیقت سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے اصلی باشندوں کو یا ان باشندوں کو جو اسکے متوطن ہوتے رہے، کبھی یہ دیکھ بھال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ گھر میں کیا کچھ موجود ہے !

بھیل گونڈ ابھی اس درجۂ ارتقا میں نہ پہنچے تھے کہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں، اسکی مختلف شاداب وگلستان خیز گھاٹیاں اور پہاڑیاں، گنگا جمنا اور نربدا کے تموج در وانیساں اور اودھ، گجرات اور پنجاب کی سرسبز و زرخیز زمینیں ان میں نظم کے ولولے پیدا کرتیں اور کالیداس و والمیک کے قابل تقلید ہمشیر وان میں جنم لیتے۔ سنسکرت اور اسکی نظم ابھی زبان زد عام نہ ہوی تھی۔ اس میں زیادہ تر قصور اس گروہ کا ہے جو ودیا کو مذہباً محدود کر چکے تھے) کہ مسلمانوں کے ہیرے پھیرے ہونے لگے اور آہستہ آہستہ وہ یورشوں سے فتوحات کی شکل میں آنے لگے۔ بارھویں صدی کے آخر میں ان کے ڈیرے بھی یہیں نصب ہوگئے۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا محتاج بیان نہیں ہے۔ اکبر نے ہندو و مسلم کو ایک قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی، اسیوقت یوروپین اقوام کی تاجرانہ سیاحت اس مخلوط تہذیب میں تیسرا جزو بن کر شامل ہونے لگی۔ اور اس جزو کو جو تاثیر آج حاصل ہے، وہ سب کو معلوم ہے

بیان بالا سے جو شاید کسی قدر طول پکڑ گیا ہے، یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کسی مربوط، مستقل، مسلسل اور خانہ ساز تمدن میں نشوو نما نہیں ہوی۔ بلکہ ہمیشہ غیر ملکی آب و ہوا میں پیدا ہوی، پلی اور بڑھی یہی وجہ ہے کہ مالاتی اور مادھو اور پریا درسکا کے حسن و عشق کے چرچے لیلیٰ و مجنوں شیریں و فرہاد اور مانی و بہزاد کے آگے ماند ہوگئے۔ یہی سبب ہے کہ رستم و سہراب و افراسیاب جو محض نامور جنرل تھے، راجگان مہابھارت اور رامائن کے اوتاروں سے زیادہ اُردو لٹریچر کا جزو بن گئے۔ فیضی نے نل دمن کو فارسی میں لکھا اور زندۂ جاوید کرنے کی کوشش کی، مگر جس اسلوب پر اُردو شعرا نے قلم اُٹھائے تھے وہ ان طالب و مطلوب کو شاعر علی کے سوز و ساز

میں ٹھلا نہ سکا۔ اگر سنسکرت شاعری یا بھاشا کی نظم اسی تخیل، بلند پروازی اور شیرینی کے ساتھ قائم رہتی جو سولھویں اور سترھویں صدی تک جے دیو اور مادھو کے دم سے پرانی جھلک دکھلا رہی تھی اور اگر سنسکرت اپنی بیٹیوں بنگالی دیوناگری اور خود اُردو کے ساتھ عصا ٹیکے ہوئے بھی زندہ رہتی تو بھی ناممکن تھا کہ سیتا، دروپدی، شکنتلا اور کنتلا کے کارنامے اور مہابھارت، رامائن، گھدوتا اور گیتا گووندا کے نازک و فلک سیر خیالات اُردو صنف نظم کو مالامال نہ کرتے۔ اس خیال کی تائید میں ہم امیر خسرو کی پہیلیاں اور دوہرے وغیرہ پیش کر سکتے ہیں فیضی کے تراجم کی مثال دے سکتے ہیں یعنی جب تک خود زبان کے انشا پردازوں میں جان رہی، ان کا اثر دیگر زبانوں کے ناظموں پر ہوتا رہا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی شاعری جو درد و سوز میں ڈوبی ہوئی ہے، اب بھی زندہ ہے۔ لیکن اسکی زندگی ایسی ہی ہے جیسا کہ اٹلی میں قدیم محو شدہ لاطینی زبان۔ علاوہ ازیں جسوقت اُردو علمی زبان کی شکل میں آئی ہے، اس وقت باقی سب زبانوں مثل بنگلہ، ناگری، تامل، پنجابی وغیرہ سب زبانوں کو دربار شاہی میں دخل پانے کا برابر موقع تھا بلکہ فی الحقیقت ایک وقت ایسا گذرا ہے کہ اُردو زبان کا ہیولہ بھی موجود نہ تھا اور حکمرانوں کو بھاشا اور دیگر ہم مخرج زبانوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے میں کوئی تعصب یا سیاسی مصلحت در پیش نہ تھی۔ لیکن دہلی و آگرہ کے اثر نے غلبہ کیا اور جوں جوں فاتح قوم کے افراد اپنے جدید ہم وطنوں کے ساتھ شیر و شکر ہوتے گئے، فارسی اور بھاشا سہیلیاں بنتی گئیں۔ زمانے کے لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ کتابت فارسی نستعلیق کی شکل پر مجبور ہوتی۔ اب خیالات کا

مقابلہ تھا۔ اسوقت عوام کی زبان بھاشا نے جس کا کچھ نمونہ ابتک کاشی جی، ہردوار اور بانگر کے علاقوں میں مل سکتا ہے، جو کچھ پیش کیا وہ ذہنی قوت کے لحاظ سے فارسی کے ہزار ہا سال کے سنجھے ہوئے شگفتہ تخیل سے لگّا نہ کھا سکتا تھا۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شعرا بھونرے کو چھوڑ کر بلبلیں پکڑنے لگے اور سورج مکھی کی جگہ گُل شبو سونگھنے لگے۔ یہ کہنے سے میرا منشا ہرگز یہ نہیں کہ بلبل و گُل میں شعریت نہیں ہے اور علےٰ وجہ کمال، میں صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے غیروں کے حُسن و عشق کو اپنے دل کے حُسن و عشق پر کیوں اور کس طرح ترجیح دی۔

اب تک میں نے وہ اسباب بیان کیے ہیں جو اُردو زبان کو وجود میں لائے اور جن کی وجہ سے اُردو شاعری منفعل اور اثر پذیر ہوئی۔ اب میں اُن اسباب پر بحث کروں گا جو ہماری شاعری کی موجودہ شکل و وضع کرنے میں کارگر ہوئے ہیں۔

اُردو شاعری میں سب سے زیادہ قابل اعتراض شئے وہ "معشوق" ہے جس کا سراپا انسانی ہیولیٰ میں تو نظر نہیں آسکتا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ کسی اہل دل مصنف نے مخزن میں قلمی خاکہ اس معشوق کا کھینچ کر دکھلایا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر کسی شاعر نے اس خاکہ کو دیکھ لیا ہوگا تو پھر اپنے واقعی "معشوق" کی توصیف و تعریف میں بھی کبھی کوئی شعر نہ کہا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں انسان کو جانوروں، پودوں، اور پتھروں کا مثل یا مشبہ بہ بنایا جائے۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہرن کی آنکھیں دیکھکر معشوق کی آنکھ کا یاد آنا بروے منطق جائز اور قدرتی ہے مگر اس وقت یہ خیال بھی تو آنا چاہیے کہ یہ آنکھ سخن ساز نہیں، رم آہو دیکھکر محبوب کی گریز یاد آنے بجا۔ مگر رم آہو خوف و دہشت سے ہے اور گریز معشوق

بے اعتنائی و ناز آفرینی سے ہے۔ ہم اپنے دلربا کو سرو قد کہتے ہیں، کیوں؟ کیا بزدبان کے استعمال کے لیے قد محبوب ہی مناسب ہے! اور جب اسکے ساتھ یہ خیال بھی ملایا جائے کہ آپ سیڑھی لگا کر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور آپ کے رقیبوں کا گروہ مور و ملخ کی مانند چوٹی تک کی خبر لاتا ہے، تو آپ کی بد مذاقی و بے غیرتی کا اس سے بدتر ثبوت نہیں مل سکتا۔ اسکے معنی یا تو یہ ہیں کہ آپ کی عاشقی محض شعر گوئی تک محدود ہے، آپ شعروں میں اپنا مرثیہ کہتے ہیں اور آپ کے رقیب آپ کا عملی مذاق اُڑاتے ہیں یا اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا "معشوق" واقعی کوئی سرو ہے، جسکے سر پر انسان کی کھوپری لگائی ہوی ہے، اسپر بال کچھ تو انسان کے ہیں اور جہاں سے زلفیں اور کاکل شروع ہوتے ہیں وہاں سنبل اور سانپ لٹکا دیے گئے ہیں۔ گردن کی جگہ کسی صراحی کا گلا توڑ کر چپکا دیا گیا ہے۔ آنکھیں ہرن کی نکال کر بٹھا دی گئی ہیں، دل کی جگہ ایک پتھر باندھ دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ الغرض یہ ایسا بے حس دباحس چھلاوا ہے جس کی نظیر انسان، جن، حیوان، نباتات، موجودات میں باتمامہ مل نہیں سکتی۔ ہر بات فرضی و ذہنی ہے۔ مگر اسکے نتائج کیا ہوے۔ شاعری بجائے سچے جذباتِ محبت پیدا کرنے کے تخریب اخلاق کا پیش خیمہ ہو گئی۔ اچھے اچھے نیک کردار شاعروں کو بھی زورِ طبیعت اور قادر الکلامی دکھانے کے لیے واسوخت جیسی نظمیں تصنیف کرنی پڑیں۔ کیا کوئی صاحب غیرت شخص ایسے بازاری خیالات کو نثر میں آپ بیتی کے طور پر بیان کرنا بھی پسند کرے گا! لیکن تخیل کی رو میں آکر ہم اپنے چال چلن کے ساتھ ایسی ایسی رکیک باتوں کو منسوب کر لیتے ہیں جو کوئی شریف آدمی اپنی اولاد اور بہو بیٹیوں کے لیے کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن اسیر بھی واہ وا ہوتی ہے اور بھولا شاعر بقول اسیر

ع سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

ترنگ لے لے کر اور فرضی باتیں منظوم کرتا ہے۔ اسی ملکی حالت پر جل کر غالب مرحوم کی پاکیزہ طبیعت نے شعر ذیل کہا ہوگا:-

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ہمارے معشوق پر ایک اور اعتراض ہے اور وہ بہت ہی شرمناک اعتراض ہے یعنی وہ صیغۂ تذکیر سے تعلق رکھتا ہے اسکی اصلی وجہ تو فارسی تتبع ہے۔ متقدمین فارسی نے عملاً یا ذہناً جس طرح بھی اس معشوق کو اپنا ہم جنس بنایا، اس کی وجہ ان کی تصوف مزاجی تھی۔ صنف لطیف کا خیال (شوق شاعرانہ شوق کو درجۂ استغراق حاصل ہوتا ہے) میں نفسانیت کا حملہ آور ہوجانا قرین قیاس و باعث رسوائی بھی تھا۔ اسلیے انھوں نے ناکردہ گناہ ماخوذ ہونے اور تشنیع افعاحشہ کے الزام سے بچنے کی خاطر اس اسلوب کو اختیار کیا، وہ اپنی پاکیزہ طبائع کے اقتضا سے ابنائے جنس کو صحیح الفطرت سمجھتے تھے، مگر انہیں قوم لوطؑ کا بھی خیال آنا چاہیے تھا۔ وہ جیسا کہ شیخ عراقیؒ کے مشہور مطلع سے

صنما رہ قلندر سزد ار بہ من نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس مجاز کو حقیقت کی نردباں بناتے تھے مگر تہمت ان لگانے والی گندی طبیعتوں نے ان پر بھی بہتان لگایا۔ بہر نوع اس کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دنیا میں سوائے فارسی و اردو شاعری کے کہیں معشوق کو مذکر نہیں باندھا گیا۔ لیکن اب اسقدر افراط ہو گئی ہے کہ

خوشتر آن باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

کی حقیقت بھی مشتبہ ہوگئی۔ میری رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس صنف کو کھلم کھلا درجۂ محبوبیت عطا کردیں جسے قدرت نے اس کا اہل و مستحق بنایا ہے۔ ہندی شاعری میں عورت عاشقی کا درجہ لیے ہوئے ہے، اس میں درد ہونے کی یہی وجہ ہے۔

ہمارے ہاں بھی ریختی ایجاد ہوئی مگر وہ رکیک ہوگئی۔ ہندی میں زیادہ تر گھریلو زندگی کو عشق و محبت کا رنگ دیا جاتا ہے، اسلیے اس میں حیوانیت پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو شاعری میں اسقدر تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ ہمیں حسن و عشق کو قدرتی رنگ میں دیکھنا چاہیے۔ اپنی اپنی جگہ ذکور و اناث دونوں میں حسن صورت موجود ہے، دونوں کے دلوں میں درد ہے احساس ہے، پس دونوں کا عاشق ہونا یا معشوق بننا عین اقتضائے فطرت ہے۔

اسی ذیل میں ایک اور اعتراض ہے، جو بالکل طبیعت انسانی کے منافی و متضاد ہے۔ وہ معشوق کی کور باطنی، سنگدلی، بے رحمی، بے رخی، آشنا بیگانگی بیگانہ دوستی حیائے بے معنی، شوخیٔ لایعنی کا ذکر ہے کہ وہ زندہ عاشق کو اپنے ہاتھوں سے تڑپا تڑپا کر قتل و بے جان کرنے میں مزے لیتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو کوئی معشوق روتا اور افسوس کرتا ہے اور جو معشوق کامل ہے یعنی درجۂ انسانیت سے بالکل گرا ہوا ہوتا ہے، وہ رقیبوں کے ساتھ جشن کرتا اور ہوئے سود مژدے، اس کی قبر تک کو ہموار کر دیتا ہے۔ حالانکہ صحیح جذبہ جو انشا پردازی کے اعلے ترین و شیریں ترین صنف کو پیدا کرنا چاہیے نہادہ یہ تھا کہ اگر عشق

صادق اور محبت پاک تھی تو معشوق پر اثر ہوا اور وہ خود سوزِ عشق میں مبتلا ہو گیا
اور اگر عشق فاسد تھا تو معشوق کی پاکیزہ طبیعت کو روز بروز نفرت بڑھتی گئی۔
اور اس نے اس بوالہوسی پر مطلق التفات نہ کیا۔ اگر جذبات کا اظہار اسطرح کیا جائے
تو ہمارے شعر نیچرل ہوں گے اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے، اس کا سچا نقشہ
ہوں گے اور ملک کے مذاق کو صحیح راستہ پر لے جائیں گے۔ ایسے کلام سے
مجاز و حقیقت میں بھی قرب ہو جائے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے تمام
شعرا کا تمام کلام مبتذل ہے، نہیں اساتذہ کے کلام حقیقت، معنی آفرینی تنوع
اور اظہار فطرت سے خالی نہیں۔ مگر غالب حصہ جسے دیکھ دیکھکر ہر خواندہ شخص
شاعر بننے کی جرات کر بیٹھتا ہے، وہ قطعی بزمِ رقص و سرود کے مطلب کا
ہوتا ہے۔ اور اس سے اگر کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں تو غارتگرانِ دنیا و
آخرت ہی سیکھ سکتے ہیں۔

ایک اور عام و فاش غلطی جو شعرائے اُردو کرتے ہیں وہ مذہب سے بے اعتنائی
میں فخر کرنا ہے۔ وہ لامذہبی کا دعوی بھی نہیں کرتے لیکن مذہب یا
پابندئی مذہب کی تحقیر کو اپنا شرف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو رمز اس خیال میں
پوشیدہ رکھی گئی تھی اور ہے، وہ غرض منا رخدا پرستی کا ابطلان تھا۔
یعنے خدا کی عبادت کی جائے تو نہ خوف جہنم سے اور نہ شوق حور و طہور سے فارسی
شعرا خصوصاً متصوفین نے "مذہب اور محبت" کو ایک کرنا چاہا تھا اور جس
زہد خشک و ریاکاری کی مذمت توریت مقدس میں نام لے لیکر کی گئی ہے
اس سے قوم کو بچانا منظور تھا، یہ اصول تمام ادیان پر صادق آتا ہے اور
اخلاص ہر مذہب کی بنا قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہم نے اس میں اسقدر مبالغہ اور
اور مشیخت سے کام لیا کہ ذاتی تحقیر و مذہبی تذلیل تک اُتر آئے۔ اس ذیل میں

ہم نے اپنے فرضی مرتبۂ عرفان میں اسقدر ددن کی لی کہ انبیا علیہم السلام تک کی منزلت کو بھلا دیا حضرت موسیٰ حضرت یوسف، حضرت عیسےٰ ہماری بیہودہ بلند پروازیوں کے بہت شکار ہوتے ہیں۔ نعت گویوں نے (ان اساتذہ کو چھوڑکر جن کے کلام ایسے فواحش سے مبرّا ہوتے ہیں) محمد رسول اللہ کی رفعت دکھانے کی کوشش میں دیگر انبیا سے ان کا ایسا مقابلہ شروع کر دیا جو مذہباً گناہ کبیرہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس بارے میں جہاں تک مجھے اس وقت یاد ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے نسبتہً ادب سے کام لیا ہے۔ حضرت زلیخا کو شعرا نے غالباً کبھی ایک نبیِ جلیل القدر کی زوجہ سمجھا ہی نہیں۔ یہ سب فرو گذاشتیں شاعرانہ تصرف کے بےجا اور نافہم استعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہمارے فاضل شعرا اس امر سے آگاہ نہ تھے۔

اس جملہ بیان سے میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ اُردو شاعری میں اصلاح کا مادہ ہی نہیں ہے یا وہ اسقدر پائے سے گر چکی ہے کہ اس کا ترک کر دینا لازم آتا ہے۔ برخلاف ان اصحاب کے جو ہر وقت غیر زبانوں کی نظمیں اور گیت یاد کرتے اور گنگناتے رہتے ہیں اور اُردو ادبیات کو سراسر ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے میں تیار ہوں، کہ ہمارے اساتذہ میں قریباً ہر اُستاد کے کلام میں ایسا نمونہ موجود ہے جو انکی طبیعت کے فطرتی رنگ کی جھلک دکھلا جاتا ہے اور جو صاف عیاں کرتا ہے کہ اگر ان سے اس رنگ کو اختیار کرنے کی توقع کی جاتی، تو ان کا تمام کلام قابلِ ناز سرمایۂ ادب ہوتا۔ اب میرے خیال میں اُردو شاعری کو پاکیزہ روش پر لانے کی ترکیب اول تو خود شعرا کی توجہ سے وابستہ ہے۔ دوسرے فنِ تنقید کا

جاری کر دینا اس کا صحیح علاج ہے۔ آج تک (بجز ان جستہ جستہ کوششوں کے جو بعض اہل قلم نے رسالوں میں کی ہیں) ہمارے شعرا کے کلام پر تنقید نہیں لکھی گئی۔ مولانا نظم طباطبائی لکھنوی (حیدرآبادی) نے شرح غالب لکھ کر داغ بیل ڈالدی ہے۔ جو اصحاب مغربی فن تنقید سے براہ راست واقف ہیں وہ اسکو اور جلا دے سکتے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ذوق سلیم رکھنے والے سخن فہم اصحاب اُردو شاعری کی اس خدمت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور انجمن ترقی اُردو اس ضمن میں اپنے وجود کے مفید ہونے کا عملی ثبوت دے گی۔ "بہر نوع" ؎

سخت کافر تھا جنے پہلے تیر
مذہب عشق اختیار کیا

عزیز منصور پوری

تبادلہ

چونکہ "تمدّن" اب لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے اور اس کا موجودہ دفتر پُل جھاؤلال لکھنؤ ہے اس لیے تمام ایڈیٹران اخبار و رسالہ جات کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ تبادلہ میں اپنے پرچے ایڈیٹر "تمدّن" پُل جھاؤلال کے پتہ پر روانہ کریں۔ یہ پرچہ تو تمام اُن پرچوں کے دفتروں میں بھیجا گیا ہے جن کا نام ہمارے تبادلہ کی فہرست میں درج ہے اگلا پرچہ صرف ان پرچوں کے تبادلہ میں بھیجا جائیگا جو دفتر "تمدّن" میں وصول ہونگے امید ہے کہ ایڈیٹران اسپر توجہ فرماکر تبادلے کے رجسٹروں میں پتہ تبدیل فرماکر مشکور فرمائیں۔ ایڈیٹر

عالمِ خیال

آپ آ گئے تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے
ہوش آ گیا تو آپ سرہانے نہیں رہے

ناظرین - خیالی عالم کی نیرنگیاں بھی اپنے دیکھنے والے کے سامنے نت نئے جلوے ہردم پیش نظر کرتی رہتی ہیں - دل کی خواہشوں کے مطابق - خیالی تماشہ گاہ کی اسٹیج پر ہر وقت نئی نئی سینریاں (منظر) موجود ہیں اور چشم زدن میں ادھر پلک جھپکی اُدھر غائب - غرض یہ تماشے اپنی دلفریبیوں میں ہر وقت دیکھنے والوں کو محور رکھتے ہیں -

میرا جہاں تک خیال ہے - مجھے یقین ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں ایک بھی ایسا آدمی نہ ہوگا جو عالم خیال کی دلچسپیوں میں دن رات اُلجھا نہ رہتا ہوگا -

ہر شخص کئی دلفریب خیالات اپنے دل میں محفوظ رکھتا ہے اور جب اپنے کاروبار سے اسکو فرصت ملتی ہے ان میں محو ہو کر اُس کے مزے دل ہی دل میں لیا کرتا ہے -

معلوم ہوتا ہے دل کی قدرتی خاصیت شاید یہی ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی خیال میں محو رہے - شاید کوئی وقت بھی ایسا نہ ہوتا ہوگا جو حضرت دل کسی سوچ بچار میں نہ رہتے ہوں - بعض دلخوش کرنے والے خیالات کا اثر دیر تک معلوم ہوتا ہے - جس سے فلسفے والے کہتے ہیں کہ جسم کی نشوونما بہت اچھی ہوتی ہے اور یہ صحت و تندرستی کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں اور اسی طرح بعض مایوس کن خیالات بےحد نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہتے - اسی لیے لوگوں کا

یہ کہنا سچ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا اثر جسم انسانی پر بہت زبردست پڑتا ہے خیالی دنیا کے رہنے والے قریب قریب ساری دنیا کے باشندے کہے جا سکتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اُن میں شاید ایک بھی ایسا نہو کہ جو دعوے کے ساتھ کہہ سکے کہ میرا دل پانچ منٹ کے لیے بھی خیالات سے بالکل خالی رہا ہو شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ خلا محال ہے۔

بعض دل تو واقعی خیالات کے پُتلے بنے ہوئے ہوتے ہوں گے کیونکہ منٹ بھر کے اندر حضرت دل کی شاہراہ پر سیکڑوں خیالات کی سواریاں بڑی بڑی شان وشوکت کے ساتھ گذر جاتی ہیں۔ ادھر ایک خیال ختم ہونے نہ پایا تھا کہ دوسرا موجود تیسرا حاضر چوتھا پیش نظر اور اسی طرح یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہانتک کہ عالم خواب میں بھی یہ خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر متفرق طور پر سامنے آتے رہتے ہیں۔

خیالات کو ایک مرکز پر قائم کرنے والے ہی اُس تنہائی کے مزے اچھی طرح جانتے ہیں جو گوشۂ عافیت میں دین ودنیا سے بے خبر ہو کر کسی کے تصور میں محو رہتے ہیں۔ ایک مشتاق دیدار آدھی رات کے وقت جبکہ ہر طرف سناٹے کا عالم ہے دنیا کے نظارے پر ڈراپ سین پڑا ہوا ہے عالم تصور میں کسی کی صورت کا نقشہ پیش نظر کیے ہوئے اس لطف کے مزے لے رہا ہے جو اُس کے خیال میں اتنا بے بہا ہے کہ جس میں از حد محو ہو کر اپنی ہستی تک کو بھول گیا۔ اور ایک بیخودی کے عالم میں کہہ رہا ہے

آپ آگئے تو ہوش ٹھکانے نہیں رہے

اور جس وقت یکایک کسی دبہ سے چونک پڑا تو وہ بیش قیمت نظارہ آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ اب پچھتا پچھتا کر کہہ رہا ہے۔

ہوش آگیا تو آپ سرہانے نہیں رہے۔ ایسی ہوشیاری سے بیہوشی اچھی
نیرنگ خیال کا سماں دنیوی رنگینیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ صرف اتنا
فرق ضرور ہے کہ عالم خیال میں ناکامی کا نحس وجود مفقود ہے۔

تصور میں مزے لیتا ہوں وصل یار کے ہر دم
مجھے ملتا ہے وہ لکھا نہیں جو میری قسمت میں

اے شکستہ دلوں کی مومیائی۔ اے زخمی تنوں کے لیے مرہم زنگار تصور اگر
دنیا میں لطف کا کچھ نشان پایا جاتا ہے تو وہ تجھ ہی میں ہے خیالی دنیا کے رہنے والوں
سے یقیناً اس کے مزے پوشیدہ ہوں گے۔

ہمارے وصل سے نفرت سہی ارماں تو رہنے دو + مٹا دو گے اسے بھی کیا جو لکھا ہے مقدر میں

ارمانوں کے مزے۔ حسرتوں کے لطف۔ آرزوؤں کا ہجوم۔ تمناؤں کی دھوم اگر
کسی کو دیکھنی ہو تو عالم تصور میں دیکھے۔ کیسے کیسے لطیف نظارے پیش نظر ہوتے
ہیں۔ کہ ہنسے جدا ہونے کو اگر قابو چلے تو حشر تک جی نہ چاہے ایک مشتاق
جمال فرماتے ہیں کہ اگر وصل سے نفرت ہے تو ارمان ہی رہنے دو یعنی ہم ارمانوں
کی سیری بذریعہ تصور ہی کر لیا کریں گے۔

تصور ایک نہایت تیز دست مصور ہے جو حسب منشا ہر شے کا ہو بہو نقشہ
چشم زدن میں تیار کر کے نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے جسمیں کہیں
اعتراض کرنے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اور پھر بے دغدغہ جب تک جی چاہا
اُس نظارے کو دیکھے جائے جس سے دلچسپی ہے۔ اور جس وقت طبیعت سیر
ہو گئی ایک سکنڈ میں سارا کارخانہ درہم و برہم کر دیا۔ گویا کچھ تھا ہی نہیں
یہ ایک ایسی دُنیا ہے جو منٹ منٹ بھر میں بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ حضرت دل
اسکے بنانے کی مشین ہیں جب چاہتے ہیں بے مصالحہ کے بنا لیتے ہیں جیسے

مکڑی جالا تن لیتی ہے اور خود ہی اُسمیں پھنس جاتی ہے اسی طرح تمام آدمی اپنے اپنے خیالات کے سلسلے میں محو ہیں۔ اور اسی میں قید نظر آتے ہیں۔ او جو غلطی ہوتی ہے۔ قید نہیں۔ اپنی ہستی کو قائم رکھتے ہیں۔ اگر خیالات کا وجود نہ رہے تو میرے خیال سے زندگی ناممکن نہیں تو محال ضرور ہو جائے۔ اس لیے خیالات کا سلسلہ انسانی زندگی کا ایک لازمی اور ضروری حصہ اگر مان لیا جائے تو میری رائے میں شاید کچھ بیجا نہ ہوگا۔

م-ج-ا- دہلوی

سفرنامۂ قاری

والد ماجد قاری سرفراز حسین صاحب نے ہندوستان سے باہر ابتک دو سفر کیے ہیں۔ ایک دس برس ہوئے جاپان میں اور دوسرا پچھلے سال انگلستان میں۔ انکا ارادہ کوئی مستقل سفرنامہ لکھنے کا نہ تھا مگر انھوں نے کچھ نوٹ اپنے سفروں کے قلم بند کر لیے تھے ان نوٹوں میں اُن باتوں سے بہت کچھ گریز کیا گیا ہے جو عام طور پر سفرناموں میں درج ہوتی ہیں۔ مثلاً تاریخی اور جغرافیہ کی باتیں مگر وہ باتیں خاص طور پر قلمبند کی گئی ہیں جن سے نوجوانوں کو عمدہ اخلاقی سبق حاصل ہوں۔ اب اپنے متعدد احباب کے اصرار سے انھوں نے اپنا سفرنامہ ناظرین "تحسان" کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مرتب کرنا شروع کیا ہے۔ پہلی قسط جو بقول جناب والد ماجد کے بالکل خشک ہے اس پرچہ میں درج ہے۔ انشاءاللہ آیندہ اس سفرنامہ میں بہت دلچسپ اور مفید باتیں درج ہوں گی۔

ایڈیٹر

غروب آفتاب

آیندہ کے لیے تو ہم کو حضرات لکھنؤ سے بہت کچھ توقعات ہیں مگر اس دفعہ نثر میں اہل لکھنؤ کا بہت کم حصّہ ہے مگر نظم کے حصّہ میں حضرات لکھنؤ کا کلام قابل شکریہ ہے اور یہ ہمارے دیرینہ کرم فرما مرزا ثاقب صاحب قزلباس لکھنوی کی عنایت کا نتیجہ ہے جنھوں نے نہ صرف خود ایک غزل اور ایک نظم مرحمت فرمائی بلکہ اپنے شہر کے دیگر مشہور شعرا سے غزلیں دلانے میں کوشش فرمائی اور لکھنؤ کے مشہور شعرا سے ہمارا تعارف کرایا۔ جناب ثاقب صاحب نے مستقل طور پر ہمکو اپنا کلام مرحمت فرمانے اور اپنے احباب سے ان کا کلام دلانے کا وعدہ فرمایا ہے جس کے ہم تہِ دل سے ممنوں ہیں بلکہ حضرت ثاقب نے اس قدر عنایت اور فراخ حوصلگی سے کام فرمایا ہے کہ دوسرے پرچہ کے لیے بھی غزل عنایت فرمادی ہے۔ امید ہے کہ جناب ثاقب صاحب کی طرح ہندوستان کے دیگر مشہور شعرا اور نثار صاحبان اپنا کلام ہم کو عنایت فرما کر شکریے کا موقع دیں گے اور یہ یقیناً ہمارے گلدستہ کے لیے موجب فخر و ناز ہوگا۔ حضرت ثاقب کی نظم حسب ذیل ہے:۔ (ایڈیٹر)

نتائجِ فکر میرزا غالب حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

خدا کا نام لے اے طالبِ نور	کہ دن کی روشنی ہوتی ہے کافور
سرِ مشرق یہ آپہنچا اندھیرا	عنانِ مہر کو گردوں نے پھیرا
غضب ڈھایا شبِ نومیہاں نے	اُفق کو آگ دیدی آسماں نے
رخِ مشرق پہ رنگ سوسنی ہے	درِ مغرب پہ کچھ کچھ روشنی ہے
شفق میں ہے یہ سورج کا قرینہ	کہ جیسے آگ میں نانِ شبینہ

کہاں تک دھوپ کی رنگت نہ ہو زرد
ہوا جاتا ہے برج آتشیں سرد

تڑپ مدہم ہے روئے شعلہ زا کی
جلا جاتی رہی طشتِ طلا کی

شعاعوں نے جو آنکھیں پھیر لی ہیں
اندھیرے نے بھی راہیں گھیر لی ہیں

فروغِ مہر تھا جن کے سہارے
وہ تارا اب ہو گئے معدوم سارے

جو دیکھا یہ چراغِ زیرِ دامن
پرندوں کو ملی راہِ نشیمن

چلا ہے کوئی سوئے آشیانہ
بٹھائے ہے کسی کو حرصِ دانا

اڑے جاتے ہیں سارے جانے والے
ارادے میں ہیں جلدی کھانے والے

اندھیرے کا جو بیچاروں کو ڈر ہے
کبھی دہنے کبھی بائیں نظر ہے

شمالی سمت کو جاتا ہے اک غول
کہ جس کی سبز پوشاکیں ہیں انمول

صدا پرواز کی آتی ہے ہر گام
بیاباں میں ہے سناٹا سرِ شام

دھندلکا ہو چلا ہے اب زمیں پر
کہیں ظلمت سوا ہے کم کہیں پر

توقف کا زمانہ ہے بہت کم
گلے ملتے ہیں دونوں وقت باہم

ہٹا کر طائروں کو زیرِ اشجار
سیہ بستر لگاتی ہے شبِ تار

سفر بھی ساتھ ہی دن کے ہے آخر
قریب آئے ہیں منزل کے مسافر

ہے دل کو رہروؤں کے ذکرِ آرام
کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں سرمۂ شام

کثافت سے طبیعت کو ہے الجھن
جھٹکتے ہیں غبار آلودہ دامن

کہیں مارے ہوئے منزل کے بیٹھے
وہ کیا بیٹھے سفینے دل کے بیٹھے

رگیں لیتی نہیں آرام اب تک
وہاں آئی نہیں ہے شام اب تک

وہ جنبش کر رہی ہیں اس طرح سے
کوئی دم توڑتا ہو جس طرح سے

بہم پہنچے نہیں راحت کے ساماں
تھکے ماندے مسافر ہیں پریشاں

کوئی تو آگ روشن کر رہا ہے
کوئی تدبیرِ مسکن کر رہا ہے

گئی ٹھہر اہ مہر اس کی روانی — تھا بہتے ہوئے دریا کا پانی
کیا لہروں نے پیدا رنگ گیسو — سیہ ہونے لگا آئینہ جو
نظر آئی جو پانی میں سیاہی — تو جل اُٹھے چراغ فلس ماہی

نوید رحلت پروانہ لائیں
گھروں میں سولیاں شمعوں کی آئیں

غزل ظرافت

حضرت ظریف لکھنوی کا کلام اپنی خاص نوعیت میں بہت ممتاز درجہ رکھتا ہے جو ناظرین کو غزلیات پڑھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا انھوں نے دو غزلیں عنایت فرمائی ہیں جنمیں سے ایک غزلیات کی ذیل میں درج ہے اور ایک یہاں درج کی جاتی ہے **ایڈیٹر**

جناب منشی سید مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی
حسب فرمائش جناب ثاقب قزلباش

ترے کپڑوں کی لادی لادنا جب یاد کرتے ہیں — تو اکثر شب کو دھوبی کے گدھے فریاد کرتے ہیں
کہو اُنسے جو اکثر شکوۂ بیداد کرتے ہیں — جب اُنکے داد ہوتا ہے تو کیوں فریاد کرتے ہیں
بتوں کو بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں — برہمن جب سفر سوئے الہ آباد کرتے ہیں
نہ گردن مارتے ہیں یہ نہ دیتے ہیں کبھی پھانسی — حسینوں کو یہ سب مشہور کیوں جلاد کرتے ہیں
یہ مجنوں کو کہو تو جس زمین شعر کو دیکھو — وہاں گھس پل سے اک عاشق نیا آباد کرتے ہیں
ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر — ستم کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں
ہمیں بتلا نہ دیں عاشق ہیں جو دورے کتابی کے — سبق ہے کیا کوئی معشوق جسکو یاد کرتے ہیں
سیہ مستوں کی شادی دخت رز کے ساتھ ٹھہری ہے — مبارک حضرت پیر مغاں داماد کرتے ہیں
چڑیمار اُنکو کہیے شوق سے کیا ہرج ہے آہیں — شکار طائر دل بیٹھے جو صیاد کرتے ہیں
یہ واٹرلس کوئی ٹیلی گرام اہیں لگا ہے — کہ ہمکو ہچکیاں آتی ہیں صاحب یاد کرتے ہیں
حسینو کیا تمھارے باپ کے ہیں ہم غلام آخر — جو کہتے ہو ظریف اب ہم تمھیں آزاد کرتے ہیں

خدائی فوجدار

موجودات عالم میں یا یوں کہیے کہ اس ظاہری دنیا میں قدرت کے تمام کاموں کا ایک دلچسپ نقشہ انسانوں کی آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے کہیں ایک شخص عدالت کی کرسی پر رونق افروز ہے اور میزان عدل کے پلڑوں کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور انصاف کے لیے رتی سے رائی کا فرق نکال کر قدرت کے اس ضروری کام کو انجام دے رہا ہے جس کے بغیر کم از کم اس ظاہری دنیا میں ایک منٹ کو بھی کام نہیں چل سکتا۔ آگے چل کر دیکھیے تو ایک دوسرا شخص اپنے اوپر زیادتی کرنے والے کو محض اسلیے چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اسپر رحم کرنا چاہتا ہے۔ ایک تیسرا شخص جو ان دونوں کے معاملہ کو دیکھ رہا ہو وہ ایک طرف تو رحم کرنے والے صاحب کی نیکی کی تعریف کرے گا مگر جب اُسکو خدائی فوجداری کا خیال آئے گا تو اس کو محسوس ہوگا کہ اگر اس شخص کو بغیر سزا دیے چھوڑ دیا گیا تو یہ شخص آگے چل کر دوسرے شخص پر محض اس امید پر زیادتی کر سکتا ہے کہ وہ بھی مجھپر رحم کردے گا۔ یہ خیال آتے ہی ہمارے خدائی فوجدار صاحب آگ ببولا ہوجاتے ہیں اور انصاف کے طالب ہو کر رحم کرنے والے سے لڑنے لگتے ہیں "نیکی برباد گناہ لازم کی مثل صادق آتی ہے ہم یہاں سے اپنے خدائی فوجدار کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شکرہ ایک درخت پر بیٹھا ہوا ایک چڑیا کو کھا رہا ہے۔ ہمارے خدائی فوجدار اس حرکت پر بہت طیش میں آئے اور اس شکرہ پر بندوق چلائی۔ تقدیر کا اچھا تھا

اتفاق سے شکرہ اُڑ گیا اور ہمارے خدائی فوجدار غصّہ میں بڑبڑاتے ہوئے رہ گئے۔ ہمارے خدائی فوجدار دنیا کے اُن مشہور اور ہمدرد لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں دنیا میں ظلم اور زیادتی کے انسداد کے لیے وقف کردی ہیں اور اخیر میں یہ معلوم ہوا ہے کہ اسکا علاج کچھ نہیں۔

گوتم بُدھ نے اس ایک نکتہ پر قادر ہونے کے لیے جو کچھ ریاضتیں کیں وہ آج کسی سے چھپی نہیں اور اصل تو یوں ہے کہ اسکی دنیا سے ظلم اور زیادتی کو مٹانے کی ہی کوشش نے اسکے اتنے پیرو کردیے اور اس کو بہت کچھ منوا دیا۔ ہمارے خدائی فوجدار صاحب تو ان لوگوں میں سے ہیں جنکو دنیا اور دنیا والوں میں بیسیوں عیب معلوم ہوتے ہیں مگر اپنے میں عیب نظر نہیں آتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا شہتیر دکھائی دیتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر تنکا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ خدائی فوجدار سیر و شکار کے شوقین اور گوشت کھانے کے دلدادہ ہیں اگر آپ سے کوئی یہ پوچھے کہ جناب جب مرغیاں آپ کے لیے حلال ہیں تو آخر کیوں شکرے کے لیے چڑیا حرام ہونے کا فتویٰ آپ دیتے ہیں شکار میں جاکر آپ بیسیوں پرند اور چرند مار کر لاتے ہیں اور وہ آپ کے لیے کیونکر روا ہیں اور انکا گوشت آپ پر کیونکر حلال ہے۔ خدائی فوجدار صاحب یہی جواب دیں گے کہ قدرت نے یہ چیزیں ہمارے لیے وضع کی ہیں۔ خوب۔ اس اللہ کے بندے سے کوئی یہ تو پوچھے کہ۔ آپ نے قدرت پر کون سا احسان کیا ہے کہ جو قدرت نے آپ کو دنیا کی چیزوں کے جان و مال کے حقوق بخش دیے اور شکرے پر قدرت کا آپ نے کیونکر عتاب مان لیا کہ اس بچارے کو موجودات کا ایک چھوٹا سا پرند جانور کھانے کی اجازت نہیں۔ اس سے آگے چلیے تو اس

چڑیا نے قدرت کا کون جرم کیا ہے جو وہ شکرے کا شکار ہوئی اور وہ جانور جو آپ کی زبان کے ذائقہ کے لیے ذبح کیے۔تڑپائے۔بھونے بھلسے جاتے ہیں وہ کس جرم کی پاداش میں گردن زدنی کے قابل ہیں۔خدائی فوجدار صاحب اگر اس سین کو دیکھ لیں جو ایک بلی چوہا پکڑ لینے کے بعد پیش کرتی ہے تو خدا جانے یہ آپے میں بھی رہیں یا نہیں۔کہ بلی ایک جان کو سسکا سسکا کر لیا اپنے لیے باعث تفریح قرار دیتی ہے۔مگر حضرت اگر بلی ظالم ہے تو آپ کون سے رحم دل ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ آپ کسی جانور کو اپنی تفریح طبع کے لیے مار کر زہر مار کرنے کا اپنے تئیں حق دار سمجھتے ہیں اور اگر کوئی پوچھے تو بتا دیتے ہیں۔مگر شکرے اور بلی کے زبان نہیں ہے وہ بھی چڑیا اور چوہے کو کھانے کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتے ہیں مگر آپ کی طرح کج بحثی نہیں کر سکتے

جہاں دیکھو حضرت انسان درندوں کا ذکر "موذی" جانور کہہ کر کرتے ہیں کوئی پوچھے کہ وہ موذی کیوں ہوے؟ کیونکہ وہ انسان کو کھا جاتے ہیں کیا خوب۔کیا نرالی منطق ہے۔آپ کو جو کھائے وہ موذی اور آپ اگر کسی کو کھائیں تو آپ کو کوئی خطاب بھی نہیں دیا جائے بلکہ آپ نہایت سادہ لوحی سے کہہ دیں کہ یہ چیزیں ہمارے لیے بنائی گئی ہیں۔اگر آپ کو انسان اسی لیے بنایا گیا تھا کہ آپ اپنے لیے ہر چیز کو جائز قرار دے لیں اور دوسرے کے لیے ناجائز تو سلام ہے آپ کی اس انسانیت کو۔

دنیا کی اس اسٹیج پر ہر ایکٹر کے پارٹ پر کوئی نہ کوئی نکتہ چینی ہو سکتی۔کیونکہ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی کام جو ایک کی منفعت کے لیے کیا جا رہا ہے دوسرے کا اسمیں نقصان ہوتا ہے۔اور اس لیے دنیا کے اس کاروبار میں نکتہ چینی کرنے کے بعد آدمی کو یہی معلوم ہوتا ہے۔

کہ میری نکتہ چینی فضول ہے اور دنیا میں ہر شخص اپنا پارٹ اتنی خوش اسلوبی سے کر رہا ہے اور اسکا وہ پارٹ اتنا ضروری ہے کہ بغیر اسکے اس نیرنگ دنیا کی اسٹیج پر ایک ایسا ایکٹر کم ہو جاتا ہے جس سے بہتر اس خاص نوعیت میں کوئی دوسرا ایکٹر وہ پارٹ نہیں کر سکتا جو قدرت نے اس خاص شخص کے لیے وضع کیا ہے جسکے پارٹ پر جناب معترض ہیں۔

اخلاق حسین

ضروری اعلان

اس رسالہ کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ انشاءاللہ اسے مستقل محنت اور کوشش کے ساتھ تدریج ترقی دیجائے۔ شروع کے پرچوں میں آب و تاب اور غیر معمولی دلکشی کے سامانوں سے ارادتاً پرہیز کیا گیا ہے۔ ورنہ بہت کچھ ممکن تھا۔ تدریج انشاءاللہ تعالیٰ اسے نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کا علمی اور ادبی رسالہ بنانا مقصود ہے بلکہ اس سے چند اور ضروری علمی کام لینے ہیں مثلاً (۱) اُن حضرات کی قابل قدر تصنیف و تالیف کو اپنے خرچ سے چھپوانا اور شائع کرنا جو بعض مجبوریوں سے خود ایسا نہیں کر سکتے۔ جن صاحبوں کو ہمت یہ خدمت لینی منظور ہو وہ براہ نوازش ہم سے خط و کتابت کریں جو بصیغۂ راز رکھی جائے گی۔ (۲) وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوانا اور ہونہار طالب علموں کو خاص طور پر اس علمی خدمت کیطرف متوجہ کرنا اور اُن سے مضمون لکھوا کر اُنکی مالی خدمت کرنا۔ بعض اوقات انعامی مضامین ہم خود تجویز کریں گے مگر جو صاحب کسی خاص مفید مضمون پر قلم اُٹھانا چاہیں اور ہم سے حق الخدمت کے متوقع ہوں وہ براہِ نوازش ہم سے خط کتابت کریں جو بصیغۂ راز رکھی جائے گی۔ (۳) خریداران "تمدن" کے لیے ایک سرکیولیٹنگ لائبریری قائم کرنا۔ جس سے بہت کم خرچ میں عمدہ عمدہ کتابیں اُن کی نظر سے گذر سکیں۔

السعی منی والاتمام من اللہ

ایڈیٹر

امیر غریب

سوال۔ اے دل بے مدعا۔ یہ جہاں مستی کا تماشا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔
بیگم صاحبہ کی سواری دور سے جاتی ہو۔ تو جہاں ہو ادب سے کھڑا ہو جاتا ہے۔
اپنے دکھ درد کچھ کم ہیں جو نواب صاحب کی تندرستی کی دعائیں مانگتا ہے۔
اپنے بال بچوں سے دور پڑا ہے مگر صاحبزادے صاحب کو دیکھکر باغ باغ
ہو جاتا ہے میری جان تجھ میں کیا کمی ہے جو ناظم صاحب نائب صاحب
اور ڈاکٹر صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے سچ بتا کوئی غرض تو ہمیں
پوشیدہ نہیں ہے؟ یہ نہیں تو صرف امارت کا رعب ہے؟ یہ جو "آئیے
حضرت" کہکر مزاج پوچھتے ہیں اس سے دل بڑھ جاتا ہے؟
دیکھ سلامت روی کے مرکز سے مت ہٹ۔ خوشی جسکا تو بفضلہ تعالیٰ
مالک ہے ریاست۔ وزارت۔ نیابت سب سے بڑھکر ہے۔ فارغ البالی جو
تجھے نصیب ہے خلش والی بے انتہا دولت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ چل۔
اس وجاہت پرستی سے منھ موڑ۔ گوشہ نشینی اختیار کر اللہ کا نام لے اور
قناعت اور سرور دائمی کی موت مرنے کے لیے مردانہ وار تیار رہ۔

جواب۔ اے پیاری روح۔ اے صدائے ربانی۔ تیری تنبیہ تیری
جھڑکیوں اور لعن طعن پر ظاہر بینوں کی ہزار ہا تحسین و آفرین قربان۔
خدا تجھے قائم رکھے۔ تو نے اچھے وقت میں خبر لی۔ دل میں جو کچھ چور ہیں اُس
سے تو بھی واقف ہے۔ خدا شاہد ہے بیگم صاحبہ سے بہت زیادہ عظمت
دل میں اُس دکھیاری بیوہ عورت کی ہے جو چکی پیس کر اپنا بھی پیٹ بھرتی ہے

اور اپنے یتیم بچوں کا جسے تن کو کپڑا نہ پیٹ کو روٹی۔ عزت نہ آبرو۔ مگر جو۔ محنت۔ صبر اور نیکی کے ساتھ زندگی بسر کرکے حیات عظیم کے لاانتہا زنجیر میں ایک گمنام مگر بے حد ضروری کڑی ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔

نواب صاحب کو خدا صحت اور عمر عطا کرے مگر سچ کہتا ہوں کہ اُن کی جان سے ہزار درجہ زیادہ اُس شخص کی جان عزیز ہے جو غریب کنبہ۔ غریب بچوں۔ غریب عورتوں کا وارث ہے جس کو نہ کوئی تفریح درکار ہے نہ سامان عیش۔ فرض اور ادائے فرض جسکی جان عزیز کی صدائے پُردرد ہے۔ جسپر ہر امیر جس وقت چاہے ظلم کرسکتا ہے اور کرلیتا ہے۔ جس پر ہر آفت جس وقت چاہے آجاتی ہے۔ مگر جس کے دل سے گھربار کی فکر۔ محنت اور استقلال کا خیال ایک لمحہ بھر کے واسطے بھی جدا نہیں ہوتا۔

صاحبزادے صاحب سے کہیں زیادہ وہ معصوم بچے دل میں بسے ہوئے ہیں جن کو آنکھ کھول کر نہ باپ کا سایہ نصیب ہوا نہ ماں کا بچھونا۔ جو کسی کے سامنے مُنہ سے بھی نہیں نکال سکتے کہ ہمارا جی کیا کھانے کو چاہتا ہے اور کیا پہننے کو۔ عرش کے کنگورے اُن کے درد پر ہل جائیں تو ہل جائیں مگر بے درد دنیا ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ وزیر امرا بہت دیکھے ہیں مگر ہم تو ان سادہ مزاج سادہ حال غریبوں کے دیوانے ہیں جن کے دل خوف خدا سے لرزتے ہیں اور جنکو تصنع اور تکلف کی ایک بات بھی نہیں آتی۔

با اینہمہ۔ میری جان۔ میں تجھے بتاؤں کہ پھر کیوں بیگم صاحبہ کی سواری کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ کیوں نواب صاحب کے لیے دعا مانگتا ہوں۔ کیوں صاحبزادے صاحب کو دیکھکر خوش ہو جاتا ہوں۔ اور کیوں ناظم صاحب نائب صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پیچھے پھرتا ہوں۔

میری جاں۔ دیکھ۔ ان سے غریبوں کی عزت ہے۔ یہ بیکسوں کا سہارا ہیں اول تو یہ اچھے ہیں ہی۔ اور اگر اور زیادہ اچھے ہوجائیں تو غریب تر جائیں بیوائیں۔ یتیم۔ بیمار۔ محتاج۔ بے علم۔ سب ان کے ایک آنکھ کے اشارے میں ادھر سے اُدھر ہوجائیں۔ مدرسے۔ حرفت و صنعت کے اسکول۔ یتیم خانے۔ محتاج خانے۔ یہ۔ وہ۔ اور جو کچھ ہو وہ سب امرا کر سکتے ہیں۔ جن جن ملکوں میں اور جن جن وقتوں میں غریب ترے ہیں امراہی کی بدولت ترے ہیں۔ توفیق الٰہی شامل حال ہو اور غریبوں کا دکھ درد کوئی ان کو بتاتا رہے تو پھر دیکھو یہی امیر ظلّ سبحانی ہیں۔ یہی امیر ابر رحمت ہیں یہی بیکسوں کا سہارا اور رانڈ بیوہ اور یتیموں اور مظلوموں کی پشت و پناہ ہیں۔ خدا انھیں قائم رکھے اور نیک توفیق دے۔ آمین ثم آمین!

خوش نصیب ستارے کے تحت میں نقرئی چمچہ منھ میں لے کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان سے یہ توقع کرنی قانون فطرت کے خلاف ہے کہ یہ لوگ روکھی سوکھی کھائیں گے موٹا جھوٹا پہنیں گے۔ ریاضات شاقّہ کریں گے۔ نفس کو ماریں گے اور ہر طرح غریبی سے زندگی بسر کریں گے۔ ان کا مشن پورا اور ان کی نجات محفوظ ہے اگر انکو غریبوں کے حال پر نظر ترحم رہے۔ یہی دعا ہے اور اسی لیے ان کو سلام کرتا ہوں۔

سرفراز حسین قاری



ایران کا ایک حسرتناک منظر

یہ سنہ ۱۹۱۰ء میں براہ کوئٹہ و بلوچستان و افغانستان سرحد ایران میں داخل ہوا اور سیستان سے ہوتا ہوا چار ماہ پندرہ روز بعد شہر مشہد مقدس میں پہنچا۔ ایک روز ایک راستہ سے میں گذر رہا تھا کہ ایک دریچۂ کلاں نظر پڑا اسکے قریب ایک چارپائی پر لاش پڑی دیکھی اور اس کے سرہانے ایک کاسہ رکھا تھا جسمیں کچھ پیسے پڑے ہوے تھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ رسم ہے کہ جب کوئی غریب و نادار مرجاتا ہے تو اسکی نعش کو کسی گذرگاہوں میں ڈالدیتے ہیں تاکہ راہرو حسب مقدور کاسے میں کچھ تجہیز و تکفین کے لیے ڈالدیں۔ مقام خاص پر یہ منظر کچھ ایسا عبرتناک تھا جسکا اثر قابل بیان نہیں نہ تحریر میں آسکتا ہے۔ اسی حالت کو مختصر طور سے ان چند اشعار میں لکھا گیا ہے

نثر رتم منہ اُٹھاے جاتے ہو کسطرف ٹھہرو
پڑا ہے راستہ میں کس کا لاشا دیکھتے جاؤ

مسافر ہے کوئی عاشق ہے کوئی یا کوئی مفلس
کوئی زخمی ہے یہ یا کوئی پیاسا دیکھتے جاؤ

تمھاری قوم کا ہے یا کوئی اقوام دیگر سے
یہ بیدردی نہیں اچھی خدارا دیکھتے جاؤ

مجھے امید ہے ہوگا تمھاری قوم کا کوئی
یقین بھی تمکو ہوجائیگا اچھا دیکھتے جاؤ

تمھاری قوم کا گر ہے تو بس گویا تمھیں تم ہو
اسے دیکھو نہ دیکھو حال اپنا دیکھتے جاؤ

پڑا ہے راستہ میں پوچھنے والا نہیں کوئی
تم اپنی قوم کی غفلت کا نقشا دیکھتے جاؤ

پڑا ہے کب سے کیونکر مرگیا کیا حادثہ گذرا
ذرا پوچھو کسی سے حال اسکا دیکھتے جاؤ

یہ کیسی رسم جاری ہے تعجب دل کو ہوتا ہے
ہوی ہے قوم اسی صورت سے رسوا دیکھتے جاؤ

بہت آواز دی عبرت نے حسرت لاکھ چلائی
مگر تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا دیکھتے جاؤ

احسن مرزا نثر مشہدی لکھنوی

پرستان کا جلوہ

اس سچے چشم دید قصے کا ایک حصہ اختصار کے ساتھ اودھ اخبار
میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ قصہ بہت عجیب اور دلچسپ ہے اسلیے
ناظرین "تمدن" کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ قصے کے سچے ہونے میں
بالکل کلام نہیں"! **ایڈیٹر**

دنیا ترقی کے موٹر کار پر سوار ہے اور زمانہ بہت سرعت کے ساتھ ترقی سے
منازل طے کر رہا ہے ہر طرف ہر علم و فن میں ترقی ہو رہی ہے اور سائنس اور علوم
کی ترقی سے وہ چیزیں ممکن معلوم ہونے لگیں جو امکان سے بعید نظر آتی تھیں۔ ایک
صدی قبل بجلی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کسی شہر کے تمام لیمپ خود بخود
ایک ساتھ روشن ہو جائیں۔ اس زمانے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی
ایجاد ہونے کا امکان ثابت کرنا چاہتا تو لوگ اسکو قیس عامری نہیں تو جارج
اسٹیوں سن (جس نے چلتا ہوا انجن ایجاد کیا تھا) کا سا مجنوں ضرور بنا لیتے۔
ایک صدی کا ذکر تو جانے دیجیے ایک دس برس پیچھے ہٹ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا
کہ یہ آلہائے پرواز جو آج آپ کو آسمان پر اُڑتے ہوے نظر آتے ہیں اُنکا
وجود کچھ بھی نہ تھا۔ پُرانے زمانے کے قصے کہانیوں میں بعض ایسی باتیں بیان
کی جاتی ہیں کہ جو اس وقت گویا ناممکن تھیں۔ وہ لوگ جو تعلیم کی روشنی سے
معمور ہو گئے ہیں بہت سے قصہ جات کو بالکل مہمل خیال کرتے ہیں۔ میں خود
ان لوگوں میں سے ایک ہوں کہ جو فسانہ عجائب اور مثنوی بدر منیر اور اسی قسم کے
دوسرے قصوں کو سچ خیال کرنا انتہائی حماقت خیال کیا کرتے ہیں اور باوجود کہ یہ

میری آنکھوں کے سامنے ایک اس قسم کا واقعہ گذر گیا مگر اب گو ان قصوں کو
صریح جھوٹ سمجھنے کا اعتقاد کچھ پژمردہ سا ہو گیا مگر باوجود اس مشاہدہ کے
میرے اعتقاد نے ابھی اتنا پلٹا نہیں کھایا کہ میں ان کو سچ سمجھنے لگوں۔

میں اس چشم دید قصے کی ابتدا یہاں سے کرتا ہوں کہ میرے متعلقین دہلی سے
لکھنؤ آنے والے ہیں آنے سے پہلے وہ مع چند اور بچوں کے شیخ ہرے بھرے
صاحب کی زیارت کو تشریف لیے جاتے ہیں جسوقت وہ زیارت کے لیے گئے
رات کے کوئی دس بجے تھے گرمی کے دن اندھیری رات اسپر کچھ ابر غرض رات
بہت بھیانک سی تھی وہاں جاتے وقت ان لوگوں کو کچھ خوف سا محسوس ہوا
مگر اسکی طرف توجہ نہ کرکے یہ لوگ وہاں مزارات پر فاتحہ پڑھ کے واپس آ گئے
اس رات کو دہلی میں رہ کر دوسری رات کو لکھنؤ روانہ ہو گئے لکھنؤ پہنچکر
ایک رات گذر گئی دوسری رات کو یہ ساری پارٹی کوٹھے پر سوئی اور ان میں
سے ایک صاحب جو اس افسانہ کے ہیرو ہیں کوٹھے ہی پر دوسری چھت پر
سوئے (صاحب افسانہ جن کا اصلی نام درج کرنے کے بجائے ہم وہ نام درج
کرتے ہیں جو انھوں نے اس واقعہ میں اپنے لیے پسند کیا اور وہ بادشاہ
بے وزیر ہے) رات کے کوئی ایک بجے کے قریب شدید آندھی آئی اور ابھی
یہ آندھی فرو نہیں ہونے پائی تھی کہ ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب کی
زبان سے سوتے میں بہت زور سے آواز نکلی کہ "میں نہیں جا سکتا" اس آواز کو
سنتے ہی سب لوگ چونک پڑے اور ابھی انکی طرف متوجہ بھی نہ ہونے پائے تھے
کہ یہ چارپائی سے زمین پر آ رہے اور فوراً ہی نہایت تیزی کے ساتھ اندھیرے
میں دو کمروں کو اور ایک زینے کو طے کرتے ہوئے مکان کے دروازے سے
جا ٹکرائے اور وہاں سے واپس آ کے وسط صحن میں گر کر بیہوش ہو گئے۔

اتنے میں کوٹھے پر سے سب لوگ نیچے پہنچ گئے اور اُن کو سنبھالا وہ بیہوش تھے
سانس نہایت تیزی سے چل رہا تھا ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور آنکھیں چڑھی ہوئی
تھیں۔ اسی حالت میں وہ کبھی ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے پکڑو وہ مجھے
مارنے آتی ہے اور کبھی غصہ ہوتے تھے اور بُرا بھلا کہہ کر زور سے چلّانے
لگتے کہ میں اس کو مار ڈالوں گا اور ضرور بدلا لوں گا اور جھپٹ کر بھاگنے کی
کوشش کرتے تھے ایک بجے سے کوئی چار بجے تک یہ حالت رہی اسکے
بعد صبح اُٹھے تو اچھے تھے ان سے دریافت کرنے پر اُنھوں نے جواب دیا کہ
مجھے یہ دکھائی دیا کہ دو عورتیں جنمیں سے ایک جوان گلابی ساری باندھے
ہوئے تھی نہایت انداز سے آئی یہ عورت اپنے عالم شباب میں تھی اور مجھے
اسقدر حسین معلوم ہوی کہ میں نے عمر بھر میں کوئی عورت ایسی حسین نہیں دیکھی
دوسری بوڑھی عورت معمولی لباس میں تھی اور اس کی شکل نہایت خوفناک تھی۔
ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب کو جو کوئی اُنیس برس کی عمر کے اور اوسط درجہ
کی شکل وصورت کے آدمی ہیں اس حسین نوجوان نے آکر جگایا اور اُس نے
خواہش کی کہ وہ اُسکے ساتھ چلیں جسکے جواب میں انھوں نے وہ فقرہ کہا کہ
جو ہم سب نے سُنا اس جواب پر بڑھیا نے ان کو ٹہوکا دیا اب صاحبزادے
صاحب کے لیے ڈاکٹری علاج کا انتظام کیا گیا اور جھاڑ پھونک تعویذ گنڈا
سب کچھ کیا ادوسری رات کو کوئی بات قابل ذکر نہیں ہوی مگر تیسری رات کو
پھر ایک بجے صاحبزادے صاحب چونکے (اُس رات کو سب لوگ نیچے صحن میں
سوے تھے) اور غصہ کی حالت میں اسی طرح کہا کہ میں نہیں جاؤں گا تم یہاں
کیوں آئیں۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ چونک کر پھر دروازے کی طرف چلے مگر
سب لوگوں نے ان کو پکڑ لیا۔ جب بادشاہ بے وزیر صاحب اسطرح اپنے

ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے تو انھوں نے پھر پہلے روز کی طرح گھبرانا کبھی غصّہ کا اظہار کرنا کبھی آنے والیوں کو ڈانٹنا اور کبھی کچھ خفیف سا مسکرانا شروع کیا مگر حالت میں کچھ فرق نہیں پیدا ہوا۔ کوئی دو گھنٹے تک وہی حالت رہی مگر صبح کو اُٹھے تو بالکل اچھے دریافت سے معلوم ہوا کہ آج وہی گل اندام ناز و انداز سے تشریف لائیں اور پھر وہی درخواست کی۔ اگر کوئی عاشق مزاج ہوتا تو ان درخواست کرنے والی بی صاحبہ کے قدموں پر سر رکھکر اور پائوں چوم کر ان کا غلام ہوجاتا اور ان کی درخواست تو ایک طرف خود ان سے درخواست کرتا۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ مگر صاحبزادے صاحب نے اس مجسم حُسن کو وہی جواب دیا جو اُنھوں نے پہلے دن دینا تجویز کیا تھا گو اس دن نوجوان حسینہ کچھ زیادہ خوشامدانہ گفتگو کر رہی تھی اور بچھی جاتی تھی مگر واہ رے بادشاہ بے وزیر کہ ان کے دل پر اُس کی خوشامد اُسکے حُسن غرض اُس چیز کا کچھ اثر نہیں ہوا جو دنیا کو زیر و زبر کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو حُسن کی ایسی تحقیر کریں۔ نپولین کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی نگاہ میں حُسن کی کوئی قدر نہیں تھی مگر کسی عاشق مزاج سے اگر یہ کہو تو وہ تو اسکی ناکامیابی کا راز اسی حُسن کی بے قدری کو بتائے گا۔

دوسرا دن بخیریت گذرا یا یوں کہیئے کہ ان بی صاحبہ کے الطاف سے محروم گذرا تیسرے دن وہی ایک بجے پھر صاحبزادے صاحب کو دورہ ہوا اور جناب چارپائی کی ادوان پر کھڑے ہو کر جست کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ ان کو پکڑ لیا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بی صاحبہ کا بھوت انپر سوار رہا

صبح کو اُٹھے تو بدستور اچھے تھے۔ انھوں نے بیان کیا کہ وہ رات کو اسی طرح دوسرے رنگ کی ساری باندھ کر آئی تھی اسکے ایک ہاتھ میں ریشمی رومال تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک دونہ جسمیں بہت خوشبودار پھول تھے اور اُسکے اندر ایک عطر کی شیشی بھی تھی۔ جب انھوں نے حسب دستور اصرار اور میں نے انکار کیا تو ان کو غصہ آگیا اور انھوں نے مجھے جھنجوڑا۔ جسپر مجھے بھی غصّہ آگیا اور میں نے اُن کے پیچھے بھاگنا چاہا۔ اس زمانے میں برخوردار مذکور کا ڈاکٹری علاج ہوتا رہا اور اسکے ساتھ تمام وہ علاج بھی ہوتے رہے جو عورتوں کے اعتقادات کے مطابق ایسے امراض میں ہوا کرتے ہیں۔

اس روز سے یہ تجویز ہوی کہ اُس وقت سب لوگ جاگ جایا کریں اور اس طرح دیکھیں کہ جاگتے میں بھی بی صاحبہ کی عشوہ گری اپنے فتنہ انگیز کرشمہ دکھاکر بادشاہ بے وزیر صاحب کو بیہوش کرکے خیالی عالم کی سیر کراتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ دو روز اسی علاج پر عمل کیا گیا اور یہ علاج کارگر ہوا اور معلوم ہوا کہ ان گل اندام حسن افروز کا حُسن فسوں ساز عالم خواب ہی میں بیچارے نوجوان کو بیتاب کرکے بیہوش کردیتا ہے اور ان کی توجہ اتنی قوت دار نہیں ہے جو عالم بیداری میں کسی کے دل ودماغ پر قبضہ کرنے پر قادر ہو۔ تیسرے روز یہ تجویز ہوی کہ برخوردار کو سُلا دیا جائے اور گھر بھر جاگتا رہے اور دیکھے کہ کیا گذرتی ہے۔ چنانچہ دو ہی ایک بجے صاحبزادے صاحب اس نعرے کے ساتھ "نام نام نام" نیند سے چونکے اور ان کا سانس چلنے لگا آنکھوں کی وہ ہی حالت ہوگئی اور اس روز ایک طویل مکالمہ ہوا جس کو اس افسانہ کا کل کہنا زیادہ موزوں ہے۔

اس مکالمہ پر توجہ کرنے کی ضرورت یوں ہے کہ بعض وہ سوالات یا جوابات جو بی صاحبہ کی طرف سے کیے گئے اور برخوردار نے دُہرائے وہ تو معلوم ہی ہوگئے باقی سوالوں اور جوابوں کے لیے سُننے والے کو اپنے دماغ پر زور دے کر برخوردار کی گفتگو سے سوالات یا جوابات کا اندازہ لگانا پڑتا ہے جو الفاظ ہمارے بادشاہ بے وزیر کی زبان سے نکلے وہ یوں ہیں کہ اُنھوں نے کہا کہ (۱) اچھا تو تمھارا نام شہزادی وانداز عرف بے نظیر ہے۔ تمھاری شادی ہوگئی؟ اسکے جواب میں خبر نہیں بی صاحبہ نے کیا کہا کیونکہ اس کو برخوردار نے دُہرایا نہیں مگر تھوڑے سے توقف کے بعد انھوں نے کہا (۲) اچھا گلفام زماں ہے؟ (۳) اگر تم گلفام زماں سے خوش نہیں تو میں کیا کروں؟ (۴) اچھا تمھاری اماں مجھے حیران کیوں کرتی ہیں؟ (۵) اچھا وہ مرگئیں تو اُنکا سرلاکر دکھاؤ؟ (۶) وہ کمبخت کیا اگر تم بھی مرجاؤ تو مجھے افسوس نہو (۷) اچھا ہم تم سے باتیں کریں گے (۸) اچھا تمھارے باپ مرجائیں گے (۹) تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ تمھارا باپ مرجاے گا۔ (۱۰) گلفام زماں کو سلطنت ملیگی۔ (۱۱) اجی مجھے تمھاری خدمت وغیرہ نہیں چاہیے (۱۲) میں غریب آدمی ہوں مجھے آپ کے مالامال کرنے کی حاجت نہیں (۱۳) مجھے سلطنت ولطنت کی خواہش نہیں (۱۴) گلفام زماں کو سلطنت ملے گی تو میں کیا کروں (۱۵) یہ وہ ہی سلطنت ہے جو میرے والد نے بخشی ہے (۱۶) اس دوران میں متعدد بار یہ کہتے جاتے تھے کہ تم تو تکلف کرتی ہو اور مسکراتے بھی جاتے تھے (۱۷) میں ہرگز نہیں جا سکتا (۱۸) تم نے مجھے آوارہ سمجھا ہے (۱۹) میں تمھارے لالچ میں نہیں آسکتا (۲۰) اچھا تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا (۲۱) ہرے بھرے صاحب کے مزار پر (۲۲) میرے ساتھ عورت کون تھی۔ میری آپا اور اُنکا لڑکا

یہ فقرہ اس واقعہ سے متعلق ہے جس سے کہ اس قصے کو شروع کیا گیا ہو (۲۳) اچھا تو تمکو مجھ سے محبت ہے (۲۴) تم کو میری کیا چیز پسند ہے (۲۵) اجی میری آنکھیں دانکھیں رہنے دیجیے (۲۶) ہاں ہم مکاں تو بدلنے والے ہیں (اس فقرہ کا اس واقعہ سے تعلق ہے کہ ہم لوگوں نے انداز بے نظیر اور ان کی والدہ کی عنایات سے متأثر ہو کے مکاں بدلنے کا انتظام کر لیا تھا) (۲۷) اچھا تو تم ہمارے دم کے ساتھ ہو۔ مگر خیر بہن ذرا تمیزداری سے آنا ہو گا (۲۸) میں ہرگز نہیں جا سکتا۔ تم آیا جایا کرو (۲۹) میں تمھارا نام کیا رکھوں تمھارا نام تمھارے اماں باوا نے رکھا ہے۔ اگر تم اصرار کرتی ہو تو میں تمھارا نام سنیچر رکھتا ہوں (۳۰) میرا نام بادشاہ بے وزیر ہے (۳۱) اچھا تو تمھارے یہاں عاشق ہونا ہوتا آیا ہے (۳۲) اچھا تو تم جاؤ۔ تم کہاں رہتی ہو وہاں جہاں چار انار ہیں۔ (۳۳) تم تو تکلف کرتی ہو (۳۴) اجی میں تم کو کہاں پہنچاؤں تم خود ہی چلی جاؤ (۳۵)۔ اچھا تم دو روز آتی رہیں (۳۶) کل نہ آنا اب تو ایک ہفتہ کی مہلت دو (۳۷) اچھا جاؤ۔

اس تمام گفتگو کے دوران میں سانس جلد جلد چل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے انداز صاحبہ کے جانے کے بعد کوئی دو ہی منٹ بعد انھوں نے زور سے کہا کہ پھر آ گئی تو خبیث وہ آئی بڑھیا انداز عرف بے نظیر کی ماں ۲۔ تیرا یہاں کچھ کام نہیں ہے تو نکل جا۔ ۳۔ یہاں کمبخت انداز بے نظیر نہیں آئی جا نکل جا۔

اس کے بعد انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور تھوڑی دیر میں حالت ٹھیک ہو گئی صبح کو اٹھے تو دریافت پر انھوں نے کہا مجھے کچھ یاد نہیں دوسرے روز مکاں بدل دیا اور کوئی آٹھ روز تک انھیں سونے نہیں دیا گیا

ایک روز سُلایا تھا کہ ایک بجے کے قریب ہی انھوں نے ایک دفعہ تسلیمؒ کی اور پھر اسکے بعد وہ ہوشیار ہو گئے دوسری رات کو وہ آرام سے سوتے رہے۔
اسکے چند روز بعد ہمارے بادشاہ بے وزیر صاحب دہلی گئے اور وہاں ان پر سوائے اسکے اور کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا کہ وہ رات کو غائب ہو جاتے تھے اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے۔ اب طبیعت میں ضرورت سے زیادہ اکھڑپنا آگیا ہے۔ دہلی سے واپس پھر لکھنؤ آنے کے بعد سے بادشاہ بے وزیر پھر بدستور اچھے ہیں۔

(بزمی)

ہائے اللہ

یہ الفاظ یوں تو بہت سیدھے سادے معلوم ہوتے ہیں مگر جب انپر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے میں کس بلا کا درد رکھتے ہیں کونسی تڑپ ان الفاظ میں مضمر ہوتی ہے جو سننے والے کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جس نے یہ الفاظ نہ سُنے ہوں۔

عام طور پر یہ جملہ کسی مریض، مصیبت زدہ۔ یا عاشق کی زباں سے نکلتا ہے۔ گویا جملہ تکلیف اور رنج کی شہادت دیتا ہے۔ مریض اپنی شدت تکلیف کے وقت "ہائے اللہ" کہکر خدا سے فریاد اور مدد کی درخواست کرتا ہے۔ اسطرح ایک طالب جو اپنے مطلوب سے الگ اسکے تصور میں کہیں بیٹھا اپنے زندگی کے دن پورے کرتا ہے عالم محویت میں اسوقت جبکہ اسکے دل سے زیادہ عزیز دلدار کی یاد چٹکیں لیتی ہے اور دل پر اس خیال سے ایک گھونسا سا لگتا ہے کہ "ہم اس سے دور ہیں اور زندہ ہیں اس گھونسے کی ضرب سے جو تکلیف اس عاشق حرماں نصیب کو ہوتی ہے اسکا نتیجہ یہی "ہائے اللہ" ہوتی ہے۔ اس ہائے اللہ کا کچھ اہل درد ہی لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ محمد ابراہیم دہلوی

غزلیات

جناب منشی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم

اُٹھے تری محفل سے تو کس کام کے اُٹھے ‌ ‌ ‌ دل تھام کے بیٹھے تھے جگر تھام کے اُٹھے
دم بھر مرے پہلو میں اُنہیں چین کہاں ہے ‌ ‌ ‌ بیٹھے۔ کہ بہانے سے کسی کام کے اُٹھے
افسوس کہ اغیار نے کیا کیا نہ ملے ہاتھ ‌ ‌ ‌ وہ بزم سے جب ہاتھ مرا تھام کے اُٹھے
دنیا میں کسی نے بھی یہ دیکھی ہے نزاکت ‌ ‌ ‌ اُن سے نہ کبھی حرف مرے نام کے اُٹھے
اس بزم سے اُٹھکر تو قدم ہی نہیں اُٹھتا ‌ ‌ ‌ گھر صبح کو پہنچے ہیں کہیں شام کے اُٹھے
جو ظلم و ستم تم نے کیے سب وہ اُٹھائے ‌ ‌ ‌ اک رنج و قلق ہم سے نہ الزام کے اُٹھے
چھوٹے تو بہت قید میں جھیلے مرے دل نے ‌ ‌ ‌ جھٹکے نہ مگر زلفِ سیہ فام کے اُٹھے
ہے رشک کہ یہ بھی کہیں شیدا ہوں اسکے ‌ ‌ ‌ تربت سے بہت لوگ مرے نام کے اُٹھے
افسانہ حُسن اُسکا ہے ہر ایک زباں پر ‌ ‌ ‌ پردے نہ کبھی جسکے در و بام کے اُٹھے
آغازِ محبت میں مزے دل نے اُڑالے ‌ ‌ ‌ پوچھے تو کوئی رنج بھی انجام کے اُٹھے

دل نذر میں دے آئے ہم اک شوخ کو بیخود
بازار میں جب دام نہ اس جام کے اُٹھے

ارمان اگر نکلے ارمان کا کیا کہنا ‌ ‌ ‌ احسان کرو دل پر احسان کا کیا کہنا
معشوق سہی پریاں مشہور سہی حوریں ‌ ‌ ‌ انسان سے کیا نسبت انسان کا کیا کہنا
اُس بات کی ضد کیسی جو سُن نہ سکے کوئی ‌ ‌ ‌ ارمان ہے چڑ اُنکی ارمان کا کیا کہنا
پوشیدہ رہا دل میں اللہ رے ترا پردہ ‌ ‌ ‌ ہر شے میں نظر آیا اس شان کا کیا کہنا
ہے جان کا غم زاہد اس بت کی محبت میں ‌ ‌ ‌ ایمان سلامت ہے ایمان کا کیا کہنا

میں خاک میں ملکر بھی پاتا ہوں اُسے دلمیں
اُجڑے ہوئے گھر میں ہے مہمان کا کیا کہنا

خط میں مجھے لکھا ہے دشمن سے ملو جاکر
قسمت کا نوشتہ ہے فرمان کا کیا کہنا

مَیں اُنسے شبِ وعدہ دیوانہ نہیوں کہہ کر
جب پاس گلا گھوٹے ارمان کا کیا کہنا

کیا بات ہے اُس دل کی تو جسمیں سما جائے
قربان ہو جو تجھپر اُس جان کا کیا کہنا

چٹکی میں ہے تیر ابتک چٹکی سے نہیں چھوٹا
آنکھوں میں کھٹکتا ہے پیکان کا کیا کہنا

بیخود کی دلبری سے گم ہوش ہیں قاتل کے
قدموں ہی پہ دم توڑا اوسان کا کیا کہنا

جانشین میرزا غالب ۔ حضرت ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی

روتے روتے شام ہوئی ہے کبتک خون بہائینگی
بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا آنکھیں بھی تھم جائینگی

جاتے جاتے جسم سے جانیں اہلِ وفا کی جائیں گی
آتے آتے دل لینے کی تم کو گھاتیں آئیں گی

اُلٹی اُلٹی باتیں اُنکی مقصد تک پہنچائیں گی
سیدھی سیدھی راہیں مجھکو باتوں میں مل جائینگی

چونکو چونکو خواب غفلت سے ایام جوانی میں
اُٹھو اُٹھو سونے والو راتیں پھر بھی آئیں گی

آؤ آؤ قتل کے بعد اب دفن میں جلدی کاہے کی
بیٹھو بیٹھو دم تو لے لو لاشیں بھی اُٹھ جائینگی

آئیں آئیں ساری بلائیں صدقے ہوں ویرانے کے
مٹتے مٹتے مٹینگے ہم اب کسکی خاک اوڑائینگی

لاتے لاتے دام میں الفت لائیگی زنجیروں کو
بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوق کمر ہو جائینگی

بھرتے بھرتے آہوں کو دل خالی کرہی ڈالیگے
جلتی جلتی زنداں سے اب گرم ہوائیں آئینگی

بیٹھے بیٹھے دیکھے جاؤ اُلجھن وقتِ آخر کی
چپکے چپکے میری سانسیں کچھ تمکو سمجھائینگی

ٹکرا ٹکرا کر یہ ناوک خاک سے مجھ تک آئیں گے
نیچی نیچی اُنکی نگاہیں میرا دل پا جائینگی

ہوتے ہوتے ہوگا ظالم واقف رسم الفت سے
رفتہ رفتہ میری وفائیں راہ پر اُسکو لائینگی

بگڑے بگڑے تیور اُنکے عقدۂ لاحل ہوں لیکن
بنتے بنتے اُنکی زلفیں یہ گتھی سلجھائیں گی

رکھدے رکھدے تیر و کماں کو چھد گئے دل مشتاقوں کے
نازک نازک باہیں تیری او قاتل تھک جائینگی

سنتے سنتے میرے نالے دل اُنکا بھر آیا ہے
اللہ اللہ آج تو آہیں جی میں بہت اترائینگی

مخفی مخفی ظلم کیے تھے پردہ اُلٹا محشر نے
کیسے کیسے راز کھلے ہیں اب آنکھیں شرمائینگی

اُبلے اُبلے شیشے مے کے بزم میں ساقی لایا ہے
اُٹے اُٹے جاموں سے اب نہیں شرمائینگی

مانو مانو کہنا مانو آئینگے وہ خود دل تھامے
ثاقب ثاقب آہیں تمہاری کھینچکے اُنکو لائینگی

موسن ثانی جناب مولانا مولوی محمد عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی

شاہد کتاب عشق ہے وہم و خیال کی
تصویر کھینچ دیتے ہیں رنج و ملال کی

وقت خوشی زیادہ ہے حاجت ملال کی
ملتی ہے چھیڑ چھاڑ سے لذت وصال کی

ذکر فراق چھوڑیے شب ہے وصال کی
ماضی سے ہو سکے گی نہ گرداں حال کی

اچھا طواف تھا کہ لحد پائمال کی
ظالم کی چال نے یہ قیامت کی چال کی

تجھکو خبر ضرور ملی میرے حال کی
چھپتی نہیں چھپائے سے صورت ملال کی

آتی نہیں ہے وہم میں وسعت خیال کی
ملنے لگی فراق سے لذت وصال کی

ظالم نے جب سے میری لحد پائمال کی
گردوں زمین ہوگیا گرد ملال کی

وحشی کو تیرے ہوش ہے انجام عشق کا
سب کچھ خبر ہے بیخبری میں مآل کی

کیوں بار بار پوچھتا ہے مدعا مرا
صورت سوال ہے نہیں حاجت سوال کی

ناصح ہماری وحشت دل کو نہ کھو سکا
تردید کر سکا نہ ہمارے خیال کی

دریائے رحمت اُسکا ابھی آئے جوش میں
اک بوند اگر گرے عرق انفعال کی

وہ اور میری یاد میں اور اُسکو بھول جاؤں
قاصد یہ ساری باتیں ہیں خواب و خیال کی

نیرنگ ایک رنگ سے جی آشکار ہے
جو ہجر کی ہے شب ہی شب ہے وصال کی

بالکل نظر نہیں ہے اُسے میرے درد پر
مطلق خبر نہیں ہے اُسے میرے حال کی

عیش اپنا اُسنے ترک کیا میرے واسطے
ہر وقت فکر رہتی ہے اُسکو ملال کی

اُس بدگماں سے دشت میں وحشت رہی مجھے ‎ دیکھیں نگاہ بھر کے نہ آہیں غزال کی

اپنے مزاج اپنی طبیعت سے تنگ ہوں ‎ کوئی گھڑی خوشی کی ہے کوئی ملال کی

جود اُسکا سین واو الف لام سے کھلا ‎ ہے ابتدا حروف ہجا سے سوال کی

خرقت زدوں کا تیرے یہی زادراہ ہے ‎ دنیا سے لیکے جاتے ہیں حسرت وصال کی

رحمت سے اُسکی ابر کرم ہے بروز حشر ‎ تردامنی مرے عرق انفعال کی

خوش چشم تیری چشم سے تڑپیں نہ کسطرح ‎ تیر نظر کے زخم ہیں آنکھیں غزال کی

کرتے ہیں اپنے رُخ کتابی کا وہ ادب ‎ تمہید ہے یہ بوسۂ رُخ کے سوال کی

اپنی نظیر آپ ہے تو دیکھ آئینہ ‎ حاجت مشاہدہ میں نہیں احتمال کی

ڈوبے ہیں بیگنہ کو بھی لے کر گناہگار ‎ کچھ حد نہیں رہی عرق انفعال کی

سائل نے اپنے نفس کو مارا نہ کس لیے ‎ تلوار کیوں نہ کھینچ لی دست سوال کی

گویا جناب یوسف ابھی تک ہیں چاہ میں ‎ تجھ سے عیاں ہوی یہ بلندی جمال کی

سارا زمانہ حشر میں اپنی کہا کیا ‎ فرصت نہ دی کسی نے مجھے عرض حال کی

دریا اُدھر ہی بہتا ہے جس سمت ہے نشیب ‎ حاجت ہے دست جود کو دست سوال کی

جلوہ ہے اُسکا آنکھ میں بھی اور دل میں بھی
حاجت کلیم کو نہ رہی دیکھ بھال کی

لسان القوم مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

دیکھیے کیا ہم اسیروں پہ بلا آتی ہے ‎ آج کچھ روزن زنداں سے ہوا آتی ہے

کسطرح دیکھیے زنداں میں قضا آتی ہے ‎ روشنی آتی ہے جسمیں نہ ہوا آتی ہے

گوش مجنوں میں یہ لیلےٰ کی صدا آتی ہے ‎ چھوڑ دو پردۂ محمل کہ ہوا آتی ہے

بستر غم پہ الٰہی دل بیمار کی خیر ‎ کچھ مرے کان میں رہ رہ کے صدا آتی ہے

خون ہو کر بھی نہ بدلا دل بیتاب کا رنگ ‎ سانس لیتا ہوں جہاں بوے وفا آتی ہے

مہرباں جو مری قسمت میں لکھا تھا وہ ہوا
آپ شرمندہ نہوں مجھکو حیا آتی ہے

پوچھتے بھی نہیں آکر سرِ بالیں وہ کبھی
جن کو بیمارِ محبت کی دوا آتی ہے

میرے پہلو میں ٹھہر جائے تڑپتا ہوا دل
تجھکو ظالم کوئی ایسی بھی ادا آتی ہے

ڈالنے پاؤں میں شوریدہ سروں کے زنجیر
آج پھر تا بہ کمر زلفِ رسا آتی ہے

کیجیے چل کے ذرا بتکدۂ حسن کی سیر
ذرہ ذرہ میں نظر شانِ خدا آتی ہے

آنکھیں سلوائی گئیں شکوۂ بیخوابی پر
ہم نے چاہا تھا کہ نیند آئے قضا آتی ہے

رات بھر خواب پریشاں نظر آتے ہیں صفی
نیند کیا آتی ہے گویا کہ بلا آتی ہے

جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

اثر شادی و غم کا رفتہ رفتہ یوں مٹا دل سے
ہنسی کا ذکر کیا رونا بھی آتا ہے تو مشکل سے

یہ کہکر روح نکلی ہجر میں رگہائے بسمل سے
ورق ہستی کا الٹا شدتِ بیتابیِ دل سے

کسے ناخواندہ مہماں کہتے ہیں پوچھو مرے دل سے
نکلوایا گیا اکثر یہ معشوقوں کی محفل سے

دیارِ عشق میں بجلی کا گرنا سب نے دیکھا ہے
کسی کی شوخیوں سے اور مری بیتابیِ دل سے

ہنسی آتی ہے مجکو چارہ سازوں کی توجہ پر
سمجھ لینگے خدائی راز گویا نبضِ بسمل سے

مصیبت اپنی اپنی اہلِ محشر بھولے جاتے ہیں
وہ باتیں بے تکلف چھڑ گئیں مقتول و قاتل سے

فلک کے دور میں کیا جانیں کیسا انقلاب آئے
قرینِ مصلحت ہے دور رہنا انکی محفل سے

مجھے مارا تلاشِ دوست کی ناکامیابی نے
بنائی جائے تربت بھی غبارِ راہِ منزل سے

جوانی کی قسم کھا کر وہ سوتے ہیں تو چونکیں گے
خدائی کانپ اٹھی فرقت کی شب بیتابیِ دل سے

غمِ فرقت کی تاثیر اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی
کہ ہم نے اپنے دلکو خود بھی پہچانا ہے مشکل سے

سفینے کو خدا حافظ نہ کہیے پھر تو کیا کہیے
کہ موجیں مثلِ پیغامِ اجل آتی ہیں ساحل سے

نکالا قدرتِ جذباتِ حسن و عشق نے مل کر
مہِ کنعاں کو اپنے گھر سے اور لیلی کو محمل سے

وہ ساعت آگئی دنیائے منقلب ہوگی
حضور اُٹھ جائیے منہ پھیر کر پہلوئے بسمل سے

مری جان تم سے سوچتے تمہارا تیر بہتر ہے
بظاہر دشمن جان اور باطن میں ملا دل سے

وہ خوش تقدیر کیونکر بیٹھنے پائے کہیں دم بھر
نہ بھایا نا مزاج دوست جسنے رنگ محفل سے

کیا موسیٰ نے وہ کار نمایاں جو نہ ممکن تھا
اُبھارا نقش برق حسن کو بیتابیِ دل سے

حیات عشق میں محشر خدا وہ دن نہ دکھلائے
کہ جانا اور پھر زندہ پلٹنا کوئے قاتل سے

جناب منشی نوبت رائے صاحب نظر ایڈیٹر اودھ اخبار

فرقت میں کسقدر ہم مشتاق تھے اجل کے
کیا روح خوش ہوئی ہے اس جسم سے نکل کے

آوارہ کسقدر ہیں دو چار اشک حسرت
رُکتے نہیں یہ چلکے تھمتے نہیں نکل کے

کیا کوئی دل شگفتہ ہو اُسکی خوابگہ میں
جب غنچے ہو گئے ہوں بستر کے پھول ملکے

اے انقلاب عالم تو بھی گواہ رہنا
کاٹی ہے عمر ہمنے کروٹ بدل بدل کے

اُٹھے گی لاش میری ہمراہ ہونگے وہ بھی
بیٹھے ہیں اہل عالم گھر سے نکل نکل کے

لے نکلی اس جہاں سے فرقت کی بیقراری
پہنچے میان محشر ہم کروٹیں بدل کے

میرا ہی دامن اُسنے آنکھوں پہ میری رکھا
مجھسے سوا ہیں نادم آنسو مرے نکل کے

کسطرح جان دی ہے فرقت میں کیا بتاؤں
کرنا پڑے ہیں مجھکو جو کام تھے اجل کے

جو پائے صبح وصلت ہوائے نظر اگر تم
کاٹو شب جدائی کروٹ بدل بدل کے

جناب قاضی عبدالعزیز صاحب عزیز بی اے۔ ایڈیٹوریل اسٹاف اودھ اخبار لکھنؤ

میں کہتا ہوں کہ تم دل لیگئے اور دلستاں تم ہو
اگر سمجھو مرے حق میں بلائے ناگہاں تم ہو

مجھے کہتے ہو جو کچھ تم سمجھ کر بزم میں کہنا
زبان تم، کان تم، دل تم، مرے روح رواں تم ہو

مرے صحرا، ترے آباد کوچے کو خدا رکھے
تمہارا نام روشن ہو وہاں میں ہوں یہاں تم ہو

شکایت مجھسے دنیا کو شکایت مجھکو دنیا سے
مرے رہنے کی دنیا تم زمیں تم آسماں تم ہو

کسی سے حالِ دل کہنا عبث معلوم ہوتا ہے
دوائے درد تم، نامہرباں تم مہرباں تم ہو

ہمارے قلب مضطر لیکے تم بھی مضطرب ہو گئے
تمھارا ہم سے رم کرنا کہے دیتا ہے ہاں تم ہو

کہوں گا رازِ دل تم سے مجھے بھی تم سے کہنا ہے
مگر یہ سوچ لو دل میں کہ مجھسے بدگماں تم ہو

نہ چھپ سکتے ہو چھپنے سے نہ کھل سکتے ہو کھلنے سے
جو سونگھو مثل بو ظاہر جو دیکھو تو نہاں تم ہو

کسی مرقد سے خاک اُٹھنا جواب اس بات کا ہوگا
ارے تم چاہنے والے مرے بے نام و نشاں تم ہو

مری حیرت نے حیرت میں انھیں خود ڈال رکھا ہے
وہ مجھسے پوچھتے ہیں "دیکھنے والے کہاں تم ہو"

قسم تم کو اسی سر کی کبھی دل سے ہمیں چاہا
عزیز اکثر کہا کرتے ہو ہم سے دلستاں تم ہو

جناب منشی مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی

ناتمام

بگولے ناچتے تھے نجد میں اور قیس عریاں تھا
یہ سب کیا تھا فقط لیلےٰ کی دلچسپی کا ساماں تھا

مرا دل ڈاک بنگلہ اور تصور خانساماں تھا
خیالِ یار جنٹلمین کی صورت سے مہماں تھا

جنوں اک شعبدہ تھا میرے خاک اُڑتے ہوئے دل کا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

ابھی فرہاد تو تھا پھوٹیا اور قیس تھا کنجڑ
وہ رہتا تھا پہاڑوں پر مکاں اسکا بیاباں تھا

منڈا کر ہو گیا وہ فارغ البال انکی الجھن سے
مرا معشوق زلفوں سے بہت اپنی پریشاں تھا

خواتین کی خدمت میں "تمدن" کی التجا

منجملہ اور خدمات کے "تمدن" نے حقوق نسواں کی حمایت کی بھی ایک خدمت اپنے ذمہ لی ہے ابتک خدا کے فضل سے اس خاص خدمت کی ضمن میں بہت کچھ کیا ہے۔ اور اسلیے ہم مجاز ہیں کہ فرقۂ اناث سے درخواست کریں کہ وہ سابق کی طرح اپنے رشحاتِ قلم سے "تمدن" کو مزین اور ناظرین "تمدن" کو محظوظ فرمائیں اور مجھے ممنونیت کا موقع دیں۔ امید ہے کہ فرقۂ اناث کی طرف سے بھی اسی قدر مضامین ہم کو موصول ہونگے جتنے طبقۂ ذکور کی طرف سے وصول ہوں گے۔

ایڈیٹر

تمدّن کا لکھنوی دور

ناظرینِ تمدن کو عم مکرم مولانا عبد الراشد صاحب الخیری کے اس اعلان سے جو اُنھوں نے گذشتہ پرچہ میں کیا ہے علم ہوا ہوگا کہ انھوں نے ازراہ کرم تمدّن کو اس امید پر مجھے دیدیا ہے کہ میں اسکی اصلی شان کو پھر قائم کردں اور از سر نو پبلک کی ان امیدوں کو انشاء اللہ پورا کرنے کی کوشش کروں جو ناظرین اس چھوٹے سے رسالہ سے وابستہ کر سکتے ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ میں اپنی تمام کوششوں میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ملک کے مشہور اہل قلم اپنے رشادِ قلم سے اس ادبی رسالہ کی امداد نہ کریں اور آپ ناظرین اسکی توسیع اشاعت کی کوشش نہ کریں۔ ایک کام اگر دو شخصوں پر منقسم ہو اور دونوں شخص اپنی اپنی قابلیتوں کو کام میں لائیں تو وہ کام ادھورا کیا کچھ بھی نہ ہوگا اگر میں ناظرین سے یہ توقع کروں کہ وہ باوجود میری بے قاعدگی اور رسالہ میں عمدہ مضامین نہ ہونے کے رسالہ کی خریداری کرتے رہیں تو یہ میری غلطی ہوگی اس طرح اگر پبلک اور اہل قلم حضرات مجھ سے اپنے فرائض کی انجام دہی چاہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک برسر حق ہوں گے۔ میں پبلک سے توسیع اشاعت اور ملک کے اہل قلم سے مضمون لکھنے کی درخواست کرتے وقت بھی اس امر کا متوقع ہوں کہ ثمرات ضرور میری امیدوں کے مطابق ہوں گے اور انشاء اللہ اب یہ "تمدّن" اُردو داں ہندوستان کے تمدّن ہی نہیں بلکہ ادب۔ معاشرت اور دیگر اہم باتوں کے لیے ایک راہبر ثابت ہوگا اور اسکے ساتھ ہی ساتھ زبان اُردو زبان کی خدمت کرے گا

"تمدّن" کا پرچہ ارسال خدمت ہے امید کہ ناظرین ہم کو فوراً دوسرا پرچہ بذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔

مجھے یہ پرچہ ۳۰۔ اگست کو ملا اور اس کے ساتھ دو مضمون سے جنہیں سے ایک "تمدّن" کی پالیسی کے کچھ بہت مطابق نہیں تھا۔ ۳۰۔ اگست کو مجھے معلوم ہوا کہ اگست کا پرچہ مجھے نکالنا ہے۔ اس قلیل مدت میں پریس وغیرہ کے انتظام کرنے کی دقت اور لکھنؤ لانے کی مشکلوں کو طے کرکے جو کچھ کر سکا وہ حاضر خدمت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں اس پرچہ میں اپنے ان وعدوں کو پورا نہ کر سکا ہوں جو میں نے کئے ہیں مگر اس قلیل مدت اور کام دونوں کو پیش نظر رکھ کے ناظرین خود مجھے قابل معافی تسلیم کریں گے۔

"تمدّن" کے دہلوی دور میں بعض اوقات دو ماہ کا ایک پرچہ نکالا گیا ہے میں نے سوچا تھا کہ میں ہرگز ایسا نہ کروں گا چنانچہ میں نے یہ انتظام کیا کہ اگست کا پرچہ ۱۵ ستمبر کو نکال دوں اور ستمبر کا پرچہ ۳۰۔ اکتوبر کو پوسٹ کردوں تاکہ وہ ٹھیک وقت پر ناظرین کو مل سکے اور اس طرح باقاعدہ ٹھیک وقت پر نکلنے لگے۔ ۱۵ تاریخ کے بعد تک جون اور جولائی کے پرچے جو مولانا عبدالراشد صاحب الخیری کو نکالنے ہیں نہ نکلے تو مجھے مجبوراً اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اگست اور ستمبر کا پرچہ میں ایک میں نکال دوں اور گویا اس دن سے اشاعت ٹھیک وقت پر ہونے لگے یہ بھی خیال تھا کہ اگست کا پرچہ ۳۰ ستمبر کو نکال دیا جائے کیونکہ اس سے قبل تو وہ اس وجہ سے نہیں نکل سکتا تھا کہ اس سے چند ہی روز پہلے جون اور

جولائی کے پرچے نکلے تھے اور ۱۵ اکتوبر کو ستمبر کا پرچہ شائع کیا جائے مگر میری طبیعت دو پرچوں کو تاریخ مقررہ کے بعد شائع کرنے کی اجازت نہ دے سکی اور ایک ہی نمبر کو ناوقت ہونے کی وجہ سے دوسرے پرچے کے ساتھ ملا دینا مناسب جان کر یہ دو پرچوں کا ایک رسالہ حاضر خدمت ہے۔ گو "تمدّن" کے لکھنوی دور کے پہلے ہی پرچے کا ڈبل نکلنا بہت بُرا شگون ہے مگر انشاءاللہ لکھنوی دور کا یہ ڈبل نمبر پہلا اور اخیری خود ہی ہوگا۔ وی۔ پی بھیجنے کی اجازت کا کارڈ رسالہ میں رکھ دیا گیا ہے۔ براہ کرم آپ اس پر صرف نام و پتہ تحریر فرما کر روانہ کردیں پرچہ جناب کے نام جاری کردیا جائیگا ناظرین سے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم پابندی وقت کا اسقدر خیال رکھیں گے کہ انشاءاللہ آئندہ کم از کم اس بات کی ناظرین کو کبھی شکایت نہ ہوگی۔

چونکہ پرچہ نسبتاً دیر میں شائع ہو رہا ہے اس سے ہم نے رعایت کے زمانے کو بڑھا دیا ہے اور اب ۳۰ اکتوبر کی جگہ ۱۵ اکتوبر تک نئے خریداروں کو پرچہ تین روپیہ چھ آنہ (۶/۳) کے بجائے تین روپیہ (۳) سالانہ میں ملے گا۔

ایڈیٹر

عرضداشت

خط وکتابت کے وقت "تمدّن" کا موجودہ پتہ تحریر فرمائیے۔

گفتارِ بیخود

دلّی کے "چمنستانِ شاعری" کا ایک گُل۔ گُل افشانی کرتا ہے، اور آپ ان پھولوں کو نہیں چنتے: کیا یہ ممکن ہے؟ کیا آپ نے کسی کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھے ہیں؟ "نہیں دیکھے" تو آپ جناب منشی سید **وحید الدین** صاحب **بیخود** دہلوی جانشین حضرت **داغ** کا دیوان دیکھئے جو آج دس برس کے بعد چھپ رہا ہے۔ دیوان کی تعریف ہم نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنی تعریف خود آپ سے کرا لیگا ضخامت تقریباً ۲۵ جز و قیمت عہ اور جو لوگ پیشگی قیمت ادا کریں اُن سے صرف ایک روپیہ۔

حضرت بیخود کی نثر کا نمونہ دیکھنا ہو تو آپ ہم سے اُنکا بے مثل و نایاب ناول

"ننگ و ناموس"

طلب فرمائیے جس میں پردے کی پورے طور پر حمایت کی گئی ہے اور جسپر دربار رام پور سے گرانبہا انعام مل چکا ہے قیمت ۸/

ملنے کا پتہ

مفتی محمد مسعود حسین المعروف بہ مفتی محمد ظہور الاسلام ساکن قصبہ کرتپور ضلع بجنور حال مقیم شہر دہلی۔ بازار لال چاہ۔ بازار میر جملہ

سفرنامہ قاری

اس تحریر میں میری اُن کوششوں کا ذکر ہے جو میں نے توفیق ایزدی سے اشاعت اسلام کے لیے کی ہیں۔ اور تمہید کے طور پر بعض وہ حالات درج ہیں جنھوں نے مجھے اس مقدس کام کی طرف متوجہ کیا۔

۱۸۹۰ء میں علیگڈھ کالج چھوڑنے اور کسٹم ریٹ کے محکمہ کی نوکری اختیار کرنے کے بعد کئی سال تک مجھے کسی بات کا خاص طور پر شوق نہ ہوا۔ سب سے زیادہ امتیازی بات میری یہ تھی کہ میں اپنے دوستوں کو ہنساتا اور اس خوشگوار فن کے جسقدر متعلقات ہیں اُن میں ترقی کرتا رہتا تھا۔ نظم۔ نثر۔ مذاق۔ تفریح یہ مشغلے پیٹ کے دھندے کے بعد کسی وقت پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ حسن و عشق اور تصوف کی باتوں سے سرے سے لگاؤ تھا۔ میلے تماشوں۔ عرسوں اور قوالی کی مجلسوں میں اکثر جاتا تھا اور کبھی کبھی حال بھی آتا تھا۔ چشتیہ نظامیہ فخریہ میں بیعت ہو چکا تھا اور باوجود تفریحی مشاغل کے نماز اور تھوڑا بہت وظیفہ ضرور پڑھ لیتا تھا۔ شادی پہلے ہی ہو چکی تھی اور کثیر العیالی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو اپنے ہم عمر دوستوں کی تفریحی صحبت دن رات ملتی تھی مگر دوسری طرف بڈھوں اور بزرگان دین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مذہبی بحث مباحثے اور فرقہ بندی کی باتوں سے طبیعت کو نفرت تھی۔ پبلک جلسوں میں تقریر کرنے کا یا کچھ پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ کالج کے زمانے میں یونین کے مباحثوں میں اکثر حصہ لیتا تھا اور کیمبرج سپیکنگ پرائز بھی حاصل کیا تھا کرکٹ میچوں کی مذاقیہ نظمیں اکثر لکھا کرتا تھا۔ مشاعروں میں غزلیں بھی بہت

پڑھی ہیں۔ مولود خوانی اور مرثیہ خوانی بھی کی ہے۔ شاعری میں مولوی سیف الحق صاحب ادیب دہلوی کا شاگرد تھا۔ اپنے وطن دہلی (یعنی عربک اسکول) میں جناب مولانا حالی صاحب مرحوم سے اور علیگڈھ کالج میں مولانا شبلی صاحب مرحوم اور یوروپین صاحبان میں مرحوم مسٹر بک۔ مسٹر (اب سر) تھیوڈور ماریسن اور مسٹر آرنلڈ سے فخر تلمذ رہا۔

خدا کے فضل سے بیوی بہت سیدھی سادی اور مطیع و فرمانبردار ملی تھیں خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت دے کبھی اللہ کی بندی نے یہ شکایت نہ کی کہ تم رات رات بھر مشاعروں اور جلسوں میں کیوں رہتے ہو۔ الغرض ایسے اُستادوں سے پڑھکر۔ ایسی صحبتوں میں رہ کر اور گھر کی طرف سے اسقدر آزادی پاکر میں ایک معجون مرکب بنا جس کا تھوڑا بہت اندازہ آیندہ کے صفحات سے ہوگا۔ کالج چھوڑ کر اور نوکری کے سلسلے سے میرٹھ آن کر ڈپٹی نجم الدین صاحب مرحوم کی صحبت میں خاص طور سے بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے مکان پر نہایت پاک صحبت جمع ہوتی تھی مولوی گل حسن صاحب مولوی عبد الحکیم صاحب مرحوم اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کا مقدس جمگھٹا یہیں رہتا تھا۔

یہ سب بزرگ حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحبؒ پانی پتی کے نظر یافتہ تھے اور تصوف کا دن رات چرچا رہتا تھا۔ توحید تنزیہی اور قلندرانہ رنگ کی باتیں یہاں اکثر ہوتی تھیں مگر ہر بزرگ شریعت حقہ کا متبع اور اتقاء میں درجۂ امتیاز رکھتا تھا۔ ان صاحبوں کی صحبت خصوصاً ڈپٹی نجم الدین صاحب مرحوم کا رنگ مجھپر چڑھنا شروع ہوا۔ ڈپٹی صاحب مثنوی شریف کے حافظ اور ماہر تھے اور اکثر اُسکے نکات بیان فرماتے تھے۔ ہنود کے تصوف سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ اور اکثر اپنے ہاں کی اور ہندوؤں کے تصوف کی باتیں ملا کر بیان

کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اسی مخلوط تعلیم کا شوق ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ہندو فقیروں اور سادھوؤں کی صحبت میں بھی جانے لگا۔ اور عیسائی پادریوں سے بھی ملنے لگا۔ ایک ہندو فقیر تو ایسے ملے جنھوں نے ترک حیوانات کرا دیا اور پانچ مہینے اُس غذا پر رکھا جسے ست گنی بھوجن کہتے ہیں۔ گھر والے تنگ تھے۔ سب کے لیے الگ پکے میرے لیے الگ۔ اکثر دوست عموماً اور گھر والے خصوصاً ڈرتے تھے کہ کہیں یہ ہندو نہ ہو جائے۔

ان ہی دنوں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور اخلاقی ناول تصوف کے رنگ میں لکھے مگر ہر ناول میں یہ واحد خصوصیت ضرور تھی کہ طول طویل مجالس رقص و سرود اور تصوف کا ذکر ہوتا تھا۔ میرے ناولوں کی دوستوں نے خوب تعریف کی۔ اس سے قدم آگے بڑھایا تو انجمنوں اور کانفرنسوں میں لکچر دینے اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ان مشاغل سے فائدہ تو ہوا یا نہ ہوا مگر اسقدر نقصان ضرور ہوا کہ مذاق آفرینی کا مادہ کم ہونا شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں اتفاق وقت سے چکاگو ملک امریکا میں جو عالمگیر نمائش کے موقع پر مذہبی جلسہ اعظم ہوا تھا اُسکی رپورٹ کا ریویو میری نظر سے گذرا اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مشہور بزرگ سوامی وے ویکانند جی جنھوں نے وہاں ویدانت یعنی اہل ہنود کے تصوف تنزیہی کا وعظ فرمایا تھا وہ سب واعظوں پر فوق لیگئے اور اسلام کا وعظ جو امریکن نومسلم مسٹر رسل وب نے کیا تھا اُسپر لوگوں نے التفات نہ کیا۔ دل میں اسکی کریدنی پیدا ہوئی اور سوامی جی کے جتنے مطبوعہ انگریزی لکچر تھے منگا کر پڑھے۔ گیتا اور تھیوسوفی کی کتابیں بھی پڑھیں اور یہ رائے قائم کی کہ امریکا میں اسلام کے تصوف تنزیہی کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ کئی سال تک اس کام کے لیے ضروری

علمی تیاری کی اور انگریزی میں محاسن اسلام پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا اور امریکا کے مذہبی رسالوں میں اُسے چھپوایا۔ یہ بھی ارادہ ہوا کہ خود امریکا جاکر جابجا لکچر دوں مگر یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ تاہم یہ خیال دل میں جگہ پکڑ گیا کہ نئی روشنی کی ضرورتوں کے موافق مذہب کا وعظ کیا جائے۔ بنا برآں متھرا کے جلسۂ مذاہب اعظم میں جو غالباً سنہ ۱۹۰۰ء یا سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا اللہ کے فضل سے بڑی کامیابی کے ساتھ محاسن اسلام پر لکچر دیا۔

سنہ ۱۹۰۲-۱۹۰۳ء میں نوکری پر سے تین مہینے کی رخصت لے کر علیگڈھ کالج میں آکر رہا اور متعدد لکچر اسلام کی خوبیوں پر دیے۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء کی ایک یادداشت مجھے اپنے کاغذات میں ملی ہے جس میں میں نے خدمت و اشاعت اسلام کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں ملک کے اسلامی اخبارات خصوصاً وکیل میں یہ خبریں مشتہر ہوئیں کہ ملک جاپان میں چکاگو ملک امریکا کی طرح ایک مذہبی کانفرنس کا انعقاد ہوتا ہے اور جاپانی جس مذہب کو بعد تحقیقات کے سب سے اچھا سمجھیں گے اُسے قبول کریں گے۔ جناب حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب اور جناب شمس العلما مولانا مولوی محمد عبدالحق صاحب (صاحب تفسیر حقانی) کے مشورہ سے میں نے جاپان کا سفر اختیار کیا۔ اور شروع نومبر سنہ ۱۹۰۵ء رمضان شریف کے مہینے میں کلکتہ کے راستے سے روانہ جاپان ہوگیا۔

سفر جاپان کے مختصر حالات

اس سفر کی تیاری میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آئی کہ چھوٹا بھائی اور بیوی بیمار تھیں۔ دوسرے گھر والوں کو یہ سفر بالکل بیکار معلوم ہوتا تھا

برابر کے دوستوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو میرے اس ارادے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہو۔ بہت سے لوگوں کو تو یقین بھی نہ آتا تھا کہ اسکی تہ میں کوئی راستی یا استہزا کی مضمر ہے۔ مگر میں جناب باری میں نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگتا رہتا تھا اور دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ میری بہترین عبادت یہ ہے کہ علوم انگریزی میں جو تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی ہے اُسے جب موقع ملے خدمت اسلام میں صرف کردوں۔ میں نے اس آرزو کے پورا کرنے کے لیے مزارات پر جا جا کر دعائیں مانگیں۔ جواہر القرآن کا وظیفہ چالیس دن تک پڑھا۔ اور نوکری۔ بال بچے داری اور تفریحات سے جو وقت بچا اُسے مطالعہ کتب میں صرف کیا۔ قوم انگریزی کی خصوصیات کا مطالعہ خاص طور پر مدنظر رکھا۔ نوکری کے سلسلہ میں دس سال تک نینی تال رہنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں اسکی واقفیت بہم پہنچانے کے بہت موقع ملے۔ پادریوں سے ملنا۔ اُنکے گرجاؤں اور جلسوں میں جانا۔ عرصۂ دراز تک شعار رہا۔ جاپان جانے کے وقت تک میرے خیالات کچھ اس قسم کے تھے کہ مذہب کی روحانیت کو بڑی چیز اور سب کچھ سمجھتا تھا۔ انگریزی تمدن اور تہذیب میں جو باتیں اچھی ہیں اُنکا دلدادہ تھا اور موجودہ پردے کی حد سے زیادہ قیود۔ اور عورتوں کے جاہل رکھنے اور اُن سے عمدہ برتاؤ نہ کرنے کو بہت بُرا جانتا تھا اور اپنے گھر کی عملی زندگی میں ان معاملات میں ایک خاص حد تک اصلاح کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ حُسن پسندی کا مرض ابتک موجود تھا اور مجھ میں اور میرے متذکرہ بالا تفریحی مشاغل میں کوئی بیّن فرق نہ آیا تھا۔ بھلا ایسی حالت میں مجھے کوئی شخص خالص مشنری اور سچا خادم اسلام کیونکر سمجھ سکتا تھا ریاکاری میرے بس کی بات نہ تھی ورنہ میرے ایک دوست تو یہاں تک آمادہ تھے

اور یہ تجویز انھوں نے خود اپنی طرف سے مجھ سے بیان کی کہ تم کو حضرت سلطان المشائخؒ کی سترھویں شریف کے موقعہ پر دستار باندھی جائے اور نئی روشنی کے نوجوانوں کے لیے پیر بنا دیا جائے۔

یوں تو کئی مہینے سے اخبار وکیل امرتسر اور ملک کے دوسرے اخبارات میں جاپان میں اشاعتِ اسلام کے بارے میں خبریں اور مضامین شائع ہو رہے تھے مگر وہ خاص مضمون جس نے مجھے جاپان جانے پر فوراً آمادہ کر دیا اور جس کی وجہ سے نہ میں نے رمضان شریف کا خیال کیا اور نہ بھائی اور بیوی کی بیماری کا حسب ذیل ہے:-

از اخبار وکیل امرتسر مطبوعہ یکم نومبر ۱۹۰۵ء مطابق
۳ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ یوم چہارشنبہ صفحات ۲ و ۳

" + + + + + + + + + + "

اسلام جاپان میں

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

امریکہ کے ماہوار رسالہ "دی ورلڈ" میں مشہور امریکن سیاح مسٹر بنک روز سیاح بلاد مشرقیہ کا ایک پرزور مضمون بعنوان "جاپان میں اسلام" شائع ہوا تھا جس کا ترجمہ ہم آگے چل کر درج کرینگے۔ اسپر رسالہ مذکور کے اڈیٹر نے جیسا کہ مسیحی مصنفوں کی بالعموم عادت ہے کچھ جلے کٹے ریمارک کیے ہیں۔ جنسے پایا جاتا ہے کہ جب سے اقصائے مشرق میں آفتاب صداقت طلوع ہونے کے آثار عیاں ہوئے ہیں

اُس وقت سے حامیان صلیب پرستی اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھادیں۔ اور اسکی منور شعاعوں کو اطراف عالم میں پھیلنے نہ دیں۔ لیکن وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ان کی صلیب کو دو ہزار سال کی مدت مدید میں اسقدر گُھن لگ چکا ہے کہ اب اس کی درستی و استحکام کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ مشرق تو مشرق خود مغرب میں بھی اسکی طرف سے بیزاری و مایوسی پھیل چلی ہے یوروپین اقوام کے جہلاء و عوام تو کس گنتی میں ہیں ان کی مذہبیت کو پہلے بھی سچی عیسائیت سے کون سا بڑا تعلق تھا؟ لیکن متوسط طبقہ کے ذی ہوش لوگوں اور نیز انکے محققین و خواص میں تو کچھ مدت سے تثلیث کی لغویت اور توحید کی وقعت و عظمت اچھی طرح گھر کرتی جاتی ہے۔ پوپوں اور پادریوں نے بائبل مقدس میں آئے دن ترمیم در ترمیم اور تحریف در تحریف کرکے ہر چند کوشش کی کہ اس بھول بھلیاں کو زمانے کی رفتار اور حوادث روزگار سے گزند نہ پہنچے۔ لیکن باوجود ان کی حیرت انگیز بیعدیل مساعی اور بیشمار مصارف کے جن کا بار محض تحفظ دین کی خاطر اُٹھایا جاتا ہے۔ افسوس کہ **طلسم صلیب** اس تہذیب و تحقیق کے زمانے میں کسی طرح......

...... لیکن حیف ہے ان لوگوں کی عقل پر جو اپنے گھر کی حالت سے بے خبر جہاں عملی طور پر صلیب مذہبی کا گویا خاتمہ ہی ہو رہا ہے دنیا کی دوسری جاہل تو جاہل شائستہ۔ فرزانہ و بیدار مغز اور محقق طبع قوموں پر بھی ابتک اُن ہی عقائد باطلہ کو پیش کیے جاتے ہیں جنھیں عقل سلیم مدتوں سے مردود و مسترد ٹھہرا چکی ہے اور جن کا نقش خود ان کے بیشمار سمجھدار ہمقوموں کے دل سے مٹ چکا ہے۔ جاپان میں تبلیغ و اشاعت نصرانیت کے لیے کتنی فوج کا مشن خاص اہتمام سے بھیجا جانا اسی لیے تجویز ہوا کہ جاپانی

ایک ہونہار قوم ہے - اور نے الحال دنیا میں حیرت انگیز و عالمگیر عزت و شہرت حاصل کر چکی ہے اُسے بھی تثلیث اور صلیب پرستی کی دعوت دی جائے - تاکہ صلیب پرستوں کی جمعیت میں جن کا سلسلہ دنیا میں پہلے ہی دور تک پھیلا ہوا ہے لاکھوں کروڑوں کا اور اضافہ ہو جائے - لیکن یہ نہیں سوچتے کہ جاپانی جہاں مہذب ہونہار اور مترقی ہیں اسکے ساتھ ہی کچھ عقل و خرد بھی رکھتے ہیں بلکہ ان کی اس ترقی و عظمت کا موجب ہی انکی یہ صفات ہیں - پھر کیونکر سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ موجودہ مسیحیوں کے مجروح معتقدات پر اندھے بن کر صاد کریں گے - اور آمنا و صدقنا کہہ کر ان ہی کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے - ع

ایں خیال ست و محال است و جنوں

برخلاف ازیں جاپان میں اسلام کا رفتہ رفتہ اس سرے سے اُس سرے تک پھیل جانا اب بفضلہ قریباً یقینی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ وہ در اصل ایک روشن خیال اور حق جو قوم ہے - اسکے خواص میں دین متین اسلام سے ایک طرح کا اُنس اور اس کی جانب میلان عام پیدا ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی تفصیل بیان کر چکے ہیں جاپانیوں کی ایسوسی ایشن متعلقہ تحقیق مذاہب بھی اسلام کی پرکھ، پرتال پر متوجہ ہو گئی ہے -

بہرحال یہاں ہم پہلے اصل آرٹیکل کا ماحصل درج کرتے ہیں - پھر ایڈیٹر دی ورلڈ کی رائے ازاں بعد اپنی طرف سے کچھ ریمارک کریں گے -

مسٹر روزبنیک لکھتے ہیں :-

"باخبر لوگوں کو معلوم ہے کہ مذہب اسلام نے موسوی اور عیسوی مذاہب کے

علمی۔ ادبی اور اخلاقی کتب کا ذخیرہ

کتب بچوں اور مستورات کیلئے

معیشت معاشرت جسمیں انتظام خانہ داری اور روزمرہ کے وہ اصول جو عورتوں کی صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں بیان کیے گئے ہیں مصنفہ علیا حضرت سرکار فرمانروا بھوپال قیمت حصہ اول و دوم ۸ / ۔

سبیل الجنان ایمان۔ اسلام اور نماز روزہ زکوٰۃ حج پر حضور والیہ بھوپال کی نہایت عالمانہ تقریریں قیمت ۱۲ / ۔

تہذیب النسوان و تربیت الانسان۔ امراض مخصوصہ نسوں کی طبی احتیاطیں۔ خانہ داری کی ضروری امور کار آمد باتیں دیگر امور مولفہ نواب شاہجہان بیگم صاحبہ بھوپال قیمت ۱۲ / ۔

تعلیم اصول خانہ داری روزمرہ کی کہانیوں میں نہایت ضروری تعلیم مولفہ منشی ابوالحق صاحب ایم اے قیمت حصہ ۲ / ۔

ہدایات تیمار داری ڈاکٹری اصول کے مطابق تیمار داری کے ضروری طریقے درج ہیں قیمت ۲ / ۔

تربیت الاطفال بچوں کی تربیت اخلاق کی اصول والدین کو کار بند ہونا چاہیے صفحات ۱۰۴ قیمت ۸ / ۔

بچوں کی پرورش بچوں کے متعلق حفظان صحت کی ترغیبات اور خطرات کی اطلاع قیمت ۴ / ۔

عقیلہ بیگم۔ ایک نفاست شعار تعلیم یافتہ بیگم کے تدبر سے ایک بادشاہ کی سلطنت کا برباد ہونا اور اسکے انتظام کی بدولت ایک گرتا ہوا ملک سنبھالنا عجیب و غریب قصہ قیمت ۳ / ۔

لاڈلا بیٹا تعلیم کی ضرورت کا اظہار ناول کے پیرایہ میں غازی الدین کے لیے

شریف بیبیاں دنیا کی مختلف اقوام و ممالک کی شریف خاتون کے حالات زندگی ۵ / ۔

روزنامچہ سفر حجاز و شام و مصر خواجہ حسن نظامی کا مشہور و معروف سفرنامہ جسمیں آپ نے مقامات مذکورہ کی عجیب و غریب حالات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے ہیں بلا تصویر عہ با تصویر ۱ / ۔

حقانیت اسلام عقائد اور ارکان پر جتنے شکوک فی زمانہ وارد کیے جاتے ہیں ان سب کا نہایت معقول اور مدلل جواب عقائد اسلامیہ کو قلب میں راسخ اور ایمان کو مستحکم بنانے والی کتاب ہے۔ مولفہ منشی انوار احمد صاحب ایم اے

خیالات ممتاز جسمیں اہل ہنود کا مذہب اور اسکی حقیقت بودھ مذہب کے بانی کا حال مسیحی اور یہودیوں اور آتش پرستوں کے اصول اور انکی اشاعت تثلیث کا ذکر۔ دہریوں کے خیالات توحید و رسالت و فطرت کا بیان اور پاک اسلام اور اسکے بانی کا تذکرہ اور دنیا میں کس قدر مذاہب شائع ہیں اور اسلام کس مذہب کے موافق اور کس کے مخالف ہر مذہب کیا چیز ہے اور دنیا کو اس سے کیا فائدہ ہے قابل دید کتاب ہے قیمت ۸ / ۔

سیاحت ہند یعنی ہندوستان کا ہفت سالہ سفرنامہ جسمیں ہندوستان کے صوبوں اور شہروں کے چشم دید حالات واقعات تمدنی ترقیات اور قابل دید مقامات کا تفصیلی بیان نیشنل کانگریس کی قدیم اور موجودہ شورش کی اجمالی کیفیت اور بعض مشاہیر علماء امراء کا بھی ذکر ہے ایک نقشہ ہندوستان اور ۴۳ اعلیٰ درجہ کے فوٹو شامل ہیں مرتبہ حافظ عبدالرحمن صاحب امرتسری حجم ۹۰۰ صفحہ قیمت ۸ / ۔

انقلاب ٹرکی سلطنت عثمانیہ کے گذشتہ انقلاب اور پارلیمنٹری دور کے آغاز کی ایک مفصل اور جامع تاریخ قیمت ۱۲ / ۔

ملنے کا پتہ منیجر تمدن بک ایجنسی نیا گاؤں لکھنؤ

Important

علمی۔ ادبی۔ اور اخلاقی کتب کا ذخیرہ

المدنیۃ الاسلام۔ یہ کتاب ایک زبردست معرکۃ الآرا محمد فرید وجدی کی تصنیف ہے جو مغربی تعلیم اور مغربی علوم و فنون کی بدولت جو شکوک اور شبہات مذہب کے متعلق پیدا ہو رہے ہیں اور الحاد و دہریت کا جو سیلاب مغرب کی طرف سے چلا آ رہا ہے اس کے استیصال کے لئے یہ کتاب آب حیات سے کم نہیں ہے قیمت عہ

اخلاق محمدی۔ اس کتاب میں طرز معاشرت آداب مجالس اخلاق کسب معاش ہمت و استقلال ہمدردی حقوق باہمی غیرت تمام صفات حسنہ کے متعلق آیات و حدیث جمع کر کے معہ اصل ترجمہ کے طبع کی گئی ہے علم اخلاق میں اس طرز کی کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی مسلمانوں کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے قیمت ہر دو حصہ عہ

حکمت عملی۔ فلسفہ عملی پر مبسوط اور جامع کتاب ہے اس میں افراد انسانی کی روحانی ارتقائی تدابیر کے ساتھ قومی ترقی اور حکومت حاصل کرنے کے اصول بھی بیان کئے گئے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کی اہمیت کا ذکر بھی موقع بموقع کیا ہے عبارت نہایت دلچسپ ہے لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی قیمت تین روپیہ ہے

البرامکہ۔ خلیفہ ہارون رشید عباسی کے وزرا یحییٰ فضل و جعفر برمکی کے مفصل و مشرح حالات از مولانا عبدالرزاق صاحب کانپوری قیمت عہ

رموز فطرت۔ علم طبیعیات علم طبقات الارض جغرافیہ طبعی اور کواکب وسیارے کے ابتدائی اور بنیادی اصول کی تشریح قیمت عہ

حدیقۃ الاخلاق۔ اکاڈمی آف ہندیا للائف کا اردو ترجمہ اس کتاب کے نصائح موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں قیمت ۱۲ مجلد عہ

رسائل شبلی۔ مولانا شبلی مرحوم کی وہ بیش قیمت تصنیف ہے کہ جس میں مندرجہ ذیل رسائل شامل ہیں۔

۱۔ اسلامی شفا خانہ	۵۔ کلیمنکس اور مسلمان	۹۔ تراجم
۲۔ اسلامی کتب خانہ	۶۔ خطبہ	۱۰۔ اسلامی مدارس
۳۔ حقوق الذمیین	۷۔ الفطر	۱۱۔ قدیم تعلیم
۴۔ جزیہ	۸۔ کتب خانہ سکندریہ	

کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی حجم ۲۰۴ صفحہ قیمت عہ

دیوان شبلی۔ مولانا شبلی کی ان فارسی نظموں کا مجموعہ جنہوں نے ہندوستان کے قومی جلسوں میں اگلے بزرگوں کی شان و شوکت کو یاد دلایا ان نظموں میں اندلس و بغداد کے خلفائے اسلام کے دارالحکومتوں کی شاندار تصویریں کھینچی گئی ہیں جن سے مطالعہ عہد رفتہ کی شاندار ترقیوں کا پتہ ملتا ہے لکھائی اور چھپائی کاغذ نہایت عمدہ قیمت ۸

لغات جدیدہ۔ عربی زبان کے تقریباً چار ہزار الفاظ کی تشریح و تحقیق جو آجکل عربی زبان میں مستعمل ہیں اور جنکو بغیر عربی اخبارات اور رسائل اور جدید تصنیفات سے متمتع نہیں ہو سکتے اور عربی زبان کے مولد و دخیل الفاظ پر محققانہ بحث مرتبہ جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی قیمت عہ

مکاتیب شبلی۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے ان خطوط کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً انہوں نے اپنے عزیز دوستوں کے نام لکھے اور جنمیں ملکی قومی مذہبی علمی اور اصلاحی خیالات و مسائل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے دو حصہ قیمت

ارض القرآن۔ قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید میں عرب کے جن مقامات کا ذکر ہے انکی جغرافیائی تحقیق عرب کی جن اقوام کا ذکر ہے انکی اجتماعی تمدنی مذہبی اور اخلاقی تاریخ مصنفہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عہ

ملنے کا پتہ۔ منیجر "تمدن" بک ایجنسی۔ نیا گاؤں لکھنؤ

تمدن

جاپان میں صنعت و حرفت کی ترقی

اگر ہم جاپان کی حرفتی ترقی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ زمانۂ ترقی چھ تدریجی حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے پانچ حصوں کے متعلق تو صرف چند الفاظ کافی ہیں لیکن آخری حصہ کو جس میں جاپان مشرق اقصیٰ کا ایک حرفتی مرکز بننے کا امتیاز حاصل ہوا ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔

جاپان ۲۵۷۸ سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصے سے آباد ہے۔ اسی بنا پر مرقومۂ بالا چھ مختلف ادوار صورت ذیل میں منقسم ہوتے ہیں۔

پہلا دور	سنہ ۶۶۰ قبل مسیح	سے	سنہ ۵۳۹ء تک
دوسرا دور	سنہ ۵۴۰ء	سے	سنہ ۸۰۶ء تک
تیسرا دور	سنہ ۸۰۷ء	سے	سنہ ۱۱۸۵ء تک
چوتھا دور	سنہ ۱۱۸۶ء	سے	سنہ ۱۵۹۳ء تک
پانچواں دور	سنہ ۱۵۹۴ء	سے	سنہ [illegible]ء تک
چھٹا دور	سنہ ۱۸۶۸ء	سے	سنہ ۱۹۱۸ء تک

جیساکہ معمولاً کسی قوم کی حرفتی تاریخ خوراک و پوشاک اور دیگر لوازم زندگی کی دریافت سے شروع ہو جاتی ہے غالباً مناسب ہوگا کہ ہم بھی جاپان کے قدیم طریق معاشرت سے اپنے مضمون کی ابتدا کریں۔

پہلے دور (۶۶۰ قبل مسیح تا ۵۳۹ء) میں جاپان مفتوح ہوا۔ فاتحین موجودہ جاپانیوں کے آباؤ اجداد تھے۔ اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادی تہذیب سے ایک حد تک واقف تھے اُن کے قدیم نوشتوں اور روایتوں سے جو نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی ہیں اُنکے طریق ماند و بود پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ موجودہ زمانہ کی بہ نسبت اُسوقت جاپانیوں کی خوراک کا بیشتر دار ومدار جانوروں کے گوشت پر تھا اور غالباً اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُسوقت تک جاپان میں گوشت کے استعمال کی کوئی بندش نہ تھی جیساکہ بعد میں بدھ مذہب کے شیوع سے پیدا ہوئی اقسام اشربہ میں سے صرف "ساکی" کے متعلق روایت کی جاتی ہے کہ وہ استعمال کی جاتی تھی۔ کھانا منھ تک لیجانے کے لئے دو چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جیساکہ اب بھی دیکھنے میں آتا ہے رائج تھیں۔ مٹی کے برتنوں میں کھانا کھایا جاتا تھا اور شاہ بلوط کے پتوں کو دونے کی طرح بنا کر گلاس وغیرہ کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ قدیم جاپانیوں کے مکانات بالکل سادہ ہوتے تھے پتھر کا رواج نہ تھا۔ سارا مکان لکڑی کا ہوتا تھا۔ جانوروں کی کھال یا گھانس سے فرش اور چٹائی کا کام لیا جاتا تھا۔ کپڑے لوگ اپنے درجے کے مطابق چکدار۔ نرم یا موٹے استعمال کرتے تھے۔ پرانے نوشتوں سے سُراغ ملتا ہے کہ یہ کپڑے کاغذ اور شہتوت کے پتوں کو جو آجکل ریشم کے کیڑوں کو کھلائے جاتے ہیں اُبال کر اور ایک دھاگہ میں پرو کر بنائے جاتے تھے۔ مکانات۔ ملبوسات اور خورد و نوش کے علاوہ قدیم افسانوں سے دھوتیوں۔ شلوکوں۔ کرتوں۔ پاجاموں اور ٹوپیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ تفصیل و تشریح کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ہے تاہم اگلے زمانہ میں جو گہنے استعمال ہوتے تھے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت بھی جاپان فن خیاطی سے بالکل نابلد نہ تھا۔ لباس کی قطع و برید ایک ایسی صناعی تھی جو باپ سے بیٹے تک سینہ بسینہ پہنچتی تھی۔ اس طرح کے لوگ موروثی ماہر فن کہلاتے تھے اور یہ بات خاندانوں کے ناموں سے بخوبی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے جو اُس وقت بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ہر خاندان کا نام کسی نہ کسی پیشہ کا مفہوم ظاہر

کرتا ہو۔ مثلاً "یمگی" کمان گر، "یا" دزد کوری" تیر ساز، "ناٹبی" سپر ساز، "سلز و کوری" بارانی دوز، "ہاٹوری" خیلہ وغیرہ وغیرہ
ان پیشہ ور آدمیوں کی ایک جماعت کسی امیر الامرا یا ڈمیس کی ملازم ہوتی تھی۔ یہ امرا ان پیشہ وروں کو تنخواہیں دیتے تھے اور اُن سے اپنی فوجی ذخائر کے لئے سامان تیار کراتے تھے۔ اس زمانہ میں صنعت و حرفت کی ترویج و ترقی ان مقامی امرا کی توجہ پر موقوف تھی۔

دوسرے دور (۵۵۲ء تا ۷۹۴ء) میں بدھ مذہب جاپان میں کوریا سے پہونچا۔ بدھ مذہب کے آنے کے یہی معنی نہ تھے کہ بدھ کی زریں مورت جاپان میں آگئی۔ بلکہ بدھ علما کا ایک گروہ بھی ملک میں وارد ہوا۔ اسی زمانہ میں ہندوستان، چین اور ایران کے بعض لطیف فنون بھی جاپان میں نمایاں ہوئے۔ نگسازی اور تعمیر کا فن بھی خیالات پیدا ہوا۔ مختلف ممالک کی صناعیاں دیکھ کر وہ فریفتہ ہو گئے اور بہت جلد اُن کی نقل اُتارنے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ اس دور میں جاپانیوں نے مختلف فنون میں خصوصیت کے ساتھ ترقی حاصل کی۔ کانچ کے ظروف تیار کئے گئے اور کپڑے پر گل بوٹے بنانے کا کام لوگوں نے سیکھا۔ اس زمانہ میں صنعت و حرفت ایسی تیزی سے ترقی کر رہی تھی کہ دنیا کے ہر گوشے سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں جسقدر بادشاہ گذرے وہ شخصی طور پر مذہبی سرگرمیوں سے ہمدردی رکھتے تھے اور صناعوں کی پوری ہمت افزائی کرتے تھے۔ مگر اسوقت تک جاپانیوں کی جسقدر صنعت و حرفت تھی وہ صرف دیگر ممالک کی نقالی پر مبنی تھی اور اس نے ذاتی طور پر ایجاد و اختراع کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔

تیسرے دور (۷۹۴ء تا ۱۱۸۵ء) میں پہلے کی طرح جاپان کی صنعت و حرفت ایک غیر مرتب حالت میں تھی لیکن اس زمانہ میں ممالک غیر سے اُس کے تعلقات قائم ہو گئے تھے چنانچہ ہندوستان اور چین کے رنگ اور نمونے جاپان میں بکثرت نظر آتے تھے جن کو جاپانیوں نے اپنے مذاق کے مطابق بنا کر ایک نئی صورت میں نمایاں کیا تھا۔ اس زمانہ میں جاپان نے ریشم کی ساخت میں خاص طور پر ترقی کی۔ کاغذ بھی چین اور کوریہ سے اچھا بننے لگا تھا۔ تربیت حیوانات کے فن میں جاپان کو ایک بڑی حد تک مہارت ہو چلی تھی اور تقریباً ۸۰۰ صوبے اس کام میں مصروف تھے۔ جاپانیوں نے چین و کوریہ سے کاغذ سازی کے تمام اصول معلوم کر لئے تھے اور وہ اچھی طرح واقف ہو گئے کہ مختلف پودوں سے کس طرح کاغذ کے لئے خمیر بنایا جاتا ہے۔ لیکن چین اور کوریہ کے رائج طریقوں کی مطابقت

کمزور کاغذ تیار ہوتا تھا۔ جاپان نے خام مٹیریل کو جوش دیکر اور اُس میں ایک اور درخت کا عرق شامل کر کے نہایت مضبوط کاغذ تیار کیا۔ اور اسوقت کی دنیا میں جاپان کی اس جدت طرازی کو ایک بڑی ایجاد سے تعبیر کیا گیا۔

چوتھے دور ۱۱۹۲ء تا ۱۳۹۵ء میں جاپان کی صنعت و حرفت گزشتہ صدی سے بالکل جدا نظر آتی ہے۔ اُس نے اپنی قدیم حالت کی طرف پھر عود کیا اور عرصۂ دراز تک یہی صورت قائم رہی۔ یہ بات ملک کے خیالات میں عظیم تغیر پیدا ہونے کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں بدھ مذہب کا مشہور داعی زین جاپان میں آگیا تھا۔ اور اُس نے اپنے لکچروں میں سادہ زندگی کی طرف جاپانیوں کو توجہ دلائی تھی۔ ایک یہ سبب بھی تھا کہ ملک کی طاقت زیادہ تر فوج کے قیام و استحکام میں صرف ہو رہی تھی۔ کیونکہ منگولیا کی فوجیں جاپانی ساحل پر لنگر انداز تھیں۔ قوم کو اسوقت اُن چیزوں کی پروا نہ تھی جو لوازم زندگی سے فاضل ہیں۔ ان وجوہ سے اس زمانہ میں جاپان نے عام صنعت و حرفت میں کوئی ترقی نہیں کی لیکن ملک کے صناع و کاریگر اپنی پوری طاقت سے اسلحہ سازی اور جہازوں کی تعمیر پر جھک پڑے۔ لیکن جب یہ نصف صدی کا ہنگامہ خیز زمانہ ختم ہوا اور قومی مصروفیتوں نے دوسرے مشاغل کے لئے جگہ نکالی تو اب جاپان میں ایک نئی صورت معاملات رونما تھی اور وہ یورپین ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کرنے پر مجبور تھا۔ پرتگیز اور باشندگان اسپین پہلے پہل جاپان میں وارد ہوگئے اور اپنے ساتھ یورپین اسباب تجارت تبادلے کے لئے لائے۔ اس واقعہ سے جاپان میں ایک نیا محکمہ تجارت قائم ہوا۔ اس سے پہلے چین اور کوریا یورپ کے تجارتی مرکز بنے ہوئے تھے۔ جاپان نے اس موقعہ پر پرتگیزوں ہندوستانیوں اور باشندگان اسپین سے مختلف اقسام کی صنعتی تعلیم حاصل کی۔ چمڑے کی دباغت اور رنگ سازی کا کام۔ ہندوستان۔ ایران۔ میکاؤ اور لیتو رن سے جاپان میں پہنچا۔ یورپین وضع کی جہاز سازی کا کام ولیم آدم نامی ایک یورپین سے جس کا جہاز جاپانی ساحل پر تباہ ہوگیا تھا جاپانیوں میں پھیلا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جاپان نے مغربی ممالک میں شہرت حاصل کی جسکا بڑا سبب مارکو پولو کے سفرنامہ اور یورپین اہل تجارت کی مسلسل آمد و رفت پر مبنی ہے۔ بہرکیف بیرونی اقوام کے میل جول سے اس زمانہ میں جاپان کے تجارتی مضمونوں میں غیر معمولی وسعت اور ترقی پیدا ہوئی۔

پانچویں دور ۱۳۹۵ء تا ۱۶۰۳ء میں رفتہ رفتہ جاپان کی صنعت و حرفت ایک مستقل اور باقاعدہ صورت میں آگئی کیونکہ اسکی تجارتی برآمد میں روز افزوں ترقی تھی۔ تجارتی تاریخ کا معائنہ کیا جائے تو اس صدی کے آغاز میں مالک دور دراز کے سمندر اسیاح جنوبی ہند اور جنوبی جزائر میں تجارتی

مقصد سے پھیلے ہوئے نظر آئینگے - اس تجارت نے جو عموماً بحری راستے سے ہوتی تھی جہاز سازی کی صنعت کو غیر معمولی ترقی دی اور جاپانی قوم میں سیر و سفر کا ولولہ پیدا کیا - ملک کے اندرونی حصص میں امراء نے جو اضلاع میں وسیع رقبہ ہائے اراضی کے مالک تھے اپنے اپنے علاقوں میں صنعت و حرفت کو فروغ دیا اور بعض صنائع کو ایسی ترقی ہوئی کہ ابتک بعض دیگر ممالک باوجود جد و جہد انکا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی ہیں - ان کو چھوڑکر ہم بعض اُن حرفتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کو اس زمانہ میں خاص ترقی حاصل ہوئی ۱۸۶۸ء میں بعض امراء نے یہ منصوبہ باندھا کہ یورپین طریقوں پر جاپان میں بعض صنائع کو رواج دیا جائے - امرائے ستسوما میتو و ساگا خاص طور پر ان کوششوں میں سرگرم تھے - چنانچہ اول الذکر نے آبگینہ کے ظروف اور دیگر اشیا کا کارخانہ ڈچ نمونہ پر قائم کیا اور انگلستان سے کاتنے کی مشین منگوا کر وسیع پیمانہ پر ایک تیلی گھر کی بنیاد ڈالی - اس طرح رفتہ رفتہ جاپانی افق سے جدید صنعت و حرفت کی صبح نمودار ہونے لگی -

چھٹے دور ۱۸۶۸ء تا ۱۹۱۲ء میں جدید صنعت و حرفت کی تجلی کے ساتھ ہی جاپان میں سیاسی تغیرات کا ستارہ صبح بھی چمکا اور عظیم الشان انقلاب واقع ہوا جس کی وجہ سے جاپان میں آئینی سلطنت کی بنیاد پڑی - چنانچہ جدید گورنمنٹ نے بحال ہوتے ہی ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے تین طریقے اختیار کئے یعنی

(۱) کارخانہ قائم کیے

(۲) حرفتی مدارس کی بنیاد ڈالی

(۳) کثیر التعداد طلبہ کو حرفتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ممالک یورپ روانہ کیا -

۱۸۷۲ء میں گورنمنٹ نے ایک ریشم کا کارخانہ قایم کیا جسکے تربیت یافتہ کاریگروں کو ان اضلاع میں بھیجا جاتا تھا جو ریشم کی پیداوار کے لئے ممتاز و مخصوص تھے اسی طرح ٹوکیو کی نواح میں اون کا کارخانہ بھی کھولا گیا لیکن روئی کاتنے کا ایک کارخانہ بھی اُس زمانہ میں نہ تھا - چند روز میں گورنمنٹ نے شیشہ آلات، کاغذ، صابون، چینی کے ظروف اور رنگ سازی وغیرہ کے بہت سے کارخانے مغربی طریقوں پر قائم کئے -

اسی اثنا میں بہت سے پرائیویٹ کارخانے بھی کھل گئے - گورنمنٹ اُنکی نگراں کار تھی اور بعض کو امداد بھی دیتی تھی - اس عام احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے بعد گورنمنٹ کو اپنے کارخانے قائم رکھنے کی ضرورت نہیں رہی اور اُس نے ۱۸۸۰ء میں ملک کے سرمایہ داروں کے ہاتھ انکو فروخت کر دیا

سنہ ۱۸۸۱ء میں گورنمنٹ نے حرفتی تعلیم پر خاص طور سے توجہ کی اور اس مقصد کے لئے ایک مخصوص محکمہ کی بنیاد ڈالی سنہ ۱۸۸۱ء میں ایک حرفتی کالج قائم کیا گیا جس میں سول انجنیری، حرفتی انجنیری، جہاز سازی، کیمسٹری، زراعت، کان کنی اور علم فلزات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو طلبہ اس کالج سے فارغ ہو کر نکلتے تھے وہ دیگر حصص ملک میں حرفتی تعلیم پھیلاتے تھے۔ اور ملک میں صنعت و حرفت کو فروغ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں ابتدائی حرفتی تعلیم کے لئے ایک اسکول کھولا گیا۔ ڈاکٹر ویگز اس اسکول کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ یہ اسکول نہایت مفید ثابت ہوا۔ اور اسوقت ٹوکیو میں صنعت و حرفت کا جو ہائی اسکول قائم ہے اسکا سنگِ بنیاد یہی قدیم مدرسہ ہے۔ اب گورنمنٹ دیگر امداد و عطایا کے علاوہ مستقل طور پر ڈیڑھ لاکھ ین سالانہ حرفتی تعلیم پر صرف کرتی تھی۔ اُسی زمانہ میں حرفتی مدرسین کے لئے ایک ٹریننگ اسکول بھی قائم کیا گیا سنہ ۱۸۹۰ء میں ایسے ۲۳ مدرسے تھے جن کو گورنمنٹ سے امداد ملتی تھی۔ ان میں سے ۶ خالص حرفتی اسکول تھے۔ ۱۳۔ اسکول مزدور پیشہ اشخاص کی تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص تھے اور ۴ زائد یا ترمیمی تھے۔

اس طرح جاپان میں حرفتی تعلیم گورنمنٹ کی توجہ اور نگرانی میں سال بسال فروغ و ترقی حاصل کرنے لگی اور جس وقت وہ دو عظیم معرکہ آرائیاں جن میں گورنمنٹ جاپان مصروف تھی ختم ہوگئیں تو جاپان پوری صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہوا اور علمی و عملی ہر حیثیت سے آگے بڑھنے لگا۔ اسوقت جاپان میں پانچ اسکول تھے جن میں اعلیٰ حرفتی تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ بریں ملک کے چالیس صوبوں میں علیحدہ علیحدہ ایک اعلیٰ اور ایک ابتدائی اسکول قائم تھا۔ یہ پانچوں ہائی اسکول براہِ راست امپیریل گورنمنٹ کی امداد و نگرانی میں جاری تھے اور صوبہ وار اسکولوں کا اہتمام پراونشیل گورنمنٹوں یا میونسپلٹیوں کو سپرد تھا۔ سرکاری اسکولوں کے علاوہ صدہا پرائیویٹ اسکول بھی جابجا بڑے شہروں اور قصبوں میں کھل گئے تھے۔

الغرض جاپان میں اس وقت صنعت و حرفت کو جو فروغ حاصل ہے اور وہ مشرق اقصیٰ میں ایک حرفتی اور تجارتی مرکز تسلیم کیا جاتا ہے یہ صرف گورنمنٹ جاپان کے اُنھیں تین اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ہے جسکا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو گورنمنٹ نے مختلف ایوانِ تجارت قائم کئے جنکا مقصد یہ تھا کہ خام اور تیار کردہ مٹیریل کے نقائص کی تحقیقات اور ان کے دور کرنے کی تدابیر پر عمل کریں یہ تجویز نہایت کامیاب ثابت ہوئی حالانکہ اس سے پہلے گورنمنٹ جاپان اس مقصد کے لئے مختلف تدابیر اختیار کر چکی تھی اور ان سب میں ناکامی

ہوئی تھی۔ ان حرفتی انجمنوں یا متحدہ جماعتوں نے اپنی مجموعی طاقت کو پیداوار اور مصنوعات کی اصلاح و ترقی پر صرف کیا اور خاصکر ان اشیاء کے متعلق اس معاملہ میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا جن کی برآمد دیگر ممالک کو ہوتی تھی۔ اب جاپانیوں کو اپنی مصنوعات امریکہ و یورپ بھیجنے میں بھی کوئی پس و پیش نہ تھا۔ جاپان میں پہلا ایوان تجارت ۱۸۵۳ء میں قائم ہوا اور پہلی پہل اس نے اپنی مصنوعات ۱۸۶۱ء میں نمائش آسٹریا کو بھیجیں۔

ان طریقوں پر عمل کرنے سے جاپان جدید صنعت و حرفت کی موجودہ منزل تک پہنچا اور سال بہ سال اس کی طاقت ایک صناع کی حیثیت سے مشرق اقصیٰ میں بڑھتی گئی۔ گزشتہ دس سال سے جاپان نے جہاز سازی۔ روئی کے کاتنے حرفتی انجنیری اور کان کنی میں خاص طور پر قابل تذکرہ ترقی کی ہے۔

۱۹۱۱ء میں جہاز سازی کے پرائیویٹ کارخانوں کی مجموعی تعداد ۲۱۶ تھی۔ ان کارخانوں نے ۳۵۸۰ اسٹیمر اور جہاز طیار کیے جنکی مجموعی گنجائش وزن ۴۵ ہزار ۳ سو ۱۶ ٹن ہے لیکن ۱۹۱۴ء میں ۱۳۲ اسٹیمروں کا اضافہ ہوا ہے جنکی مجموعی گنجائش وزن ۵۹ ہزار ایک سو ۳۲ ٹن ہے۔ ۱۹۰۵ء میں ۸۰ روئی کاتنے کے کارخانے تھے جن میں ۶۵ ہزار ۹ سو ۱۱ آدمی کام کرتے تھے ۱۹۱۴ء میں ان کارخانوں کی تعداد ۱۰۳ تک پہنچ گئی جن میں ایک لاکھ ۱۶ ہزار ۵ آدمی کام کرتے تھے اور برآورد کی مقدار پہلے سے دگنی ہوگئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں ۷۵ ہزار ۵ سو ۵ آدمی کوئلہ کی کانوں میں کام کرتے تھے لیکن ۱۹۱۲ء میں انکی تعداد ایک لاکھ ۲۸ ہزار ۶ سو ۸۳ تھی۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کے مزدور پیشہ اور کاریگروں کے متعلق بھی چند لفظ لکھے جائیں۔ کیونکہ ایک بڑی حد تک اس مسئلہ پر جاپان کی حرفتی ترقی کا دارومدار ہے۔

۱۹۱۴ء میں جاپان کے تمام کارخانوں کی مجموعی تعداد ۱۰ ہزار ۲ سو ۶۲ تھی۔ ان میں سے جو کارخانے انجن کی طاقت سے چلتے تھے وہ ۱۰ ہزار ۳ سو ۴۳ تھے اور ۹ ہزار ۸ سو ۶۸ کارخانوں میں انجن کے بغیر کام ہوتا تھا۔ ان کارخانوں کے ملازمین کی مجموعی تعداد ۸ لاکھ ۵۳ ہزار ۹ سو ۴۶ تھی ان میں ۳ لاکھ ۱۸ ہزار ۶ سو ۷۶ مرد اور ۵ لاکھ ۳۵ ہزار ۲ سو ۷۰ عورتیں تھیں کیونکہ روئی کاتنے اور کپڑا بننے کی ملوں میں زیادہ تر عورتیں ہی کام کرتی ہیں۔ ان کام کرنے والوں کا معاوضہ بہت قلیل ہوتا ہے۔ اور اگر اسے یورپین ممالک کی اجرتوں سے مقابلہ کیا جائے تو نہایت حیرت ہوگی

روئی کاتنے کی ملوں میں کام کرنے والی عورتوں کی روزانہ مزدوری ۱۷ ین یا ۴ پنس یا بالفاظ دیگر ۴ رہوتی ہو۔ اس موقع پر یہ عرض کردینا بھی ضروری ہو کہ جاپانی اپنے کاریگروں اور مزدوروں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ تقریباً نصف صدی پہلے آقا اور ملازم کے تعلقات بالکل باپ اور بیٹے کے تعلقات کی طرح تھے۔ ملازم اپنے آقا اور اُس کے خاندان کے ساتھ رہتا تھا لیکن جب سے جاپان میں صنعت و حرفت کو زیادہ فروغ ہوا اور کام بڑھا اُسوقت سے اس قسم کے تعلقات کا باقی رکھنا ناممکن ہوگیا۔ گورنمنٹ بھی مزدور پیشہ جماعت کے مفاد و حقوق کی پوری نگرانی رکھتی ہے اور اُسنے کارخانوں کے لئے ایسے قوانین وضع کردیے ہیں۔ جو کاریگروں اور مزدور پیشہ جماعت کے لئے نہایت کارآمد و مفید ہیں۔ صنعت و حرفت کی ایسی ترقی اور عام ترویج کے باوجود جاپانی کارخانوں کو مزدوروں کی ہڑتالوں کا بہت ہی کم اتفاق ہوتا ہے۔ اور اسکی وجہ یقیناً یہی ہے کہ وہاں کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات مغربی ممالک کے خلاف نہایت خوشگوار ہیں لیکن آئندہ بھی یہی حالت باقی رہے گی یا نہیں اِس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن جاپان کے کارخانہ داروں کو اپنے کاریگروں کے جذبات و ضروریات کا اسی طرح احساس باقی رہا تو کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔

موجودہ جنگ نے جاپانی صنعت و حرفت کی رفتار غیر معمولی طور سے تیز کردی ہے۔ اور اُسکی ہر شاخ میں کام کی کثرت نظر آرہی ہے جہاز سازی کوئلہ اور سوت کی حرفت کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا ہے۔ اور یہ کارخانے اگرچہ اپنی پوری طاقت سے کام کررہے ہیں تاہم اُن کو مشینوں اور کاریگروں کی کمی محسوس ہو رہی ہے بہت سے چھوٹے چھوٹے کارخانے کام کی کثرت کی وجہ سے جابجا کھل گئے ہیں اِس اتفاقی فروغ صنعت و حرفت اور کارخانوں کی عظیم پیداوار سے جاپان میں سیم و زر کی بارش ہو رہی ہو۔ جس نے جاپان کی صورت حال کو بالکل بدل دیا ہو اور ایک شاندار مستقبل پیش نظر کردیا ہے۔

(ترجمہ) سید ظہور احمد چشتی شاہجہانپوری

ضروری گذارش

تمدن بلا طلب جن حضرات کی خدمت میں نمونتاً یا کسی دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنے ارادۂ خریداری سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائیگی اور دوسرے ماہ میں انکا نام درج رجسٹر کرکے تیسرے ماہ کا پرچہ ذریعہ وی پی بھیجا جائیگا۔ جسکا وصول کرنا انکا اخلاقی اور قومی فرض ہوگا۔

منیجر

شرطی اور ورق

(ایک فیلالوجیکل اسٹڈی)

منجملہ ان فرائض کے جو ایک لکسکوگرافر (لغت نویس) کے ساتھ وابستہ ہیں، ایک فرض یہ ہو کہ وہ الفاظ کی اصلیت، انکے مبادی، انکے مصادر پر غور کرے، اسیکا نام فیلالوجی ہو علم فیلالوجی کا مطالعہ کرنیوالا جب کسی لفظ کے ماخذ ماہیت اور حقیقت پر آگاہ ہوجاتا ہو تو اسکو اتنی ہی مسرت ہوتی ہے جتنی ایک شاعر کو جبکہ اسکو کوئی تازہ مضمون ملجاتا ہو افسوس ہو کہ ہماری غفلت نے جہاں علمی میدان میں ہمیں پیچھے ہٹادیا ہے وہاں ہم میں سے یہ احساس بھی مفقود ہوگیا ہو کہ ہم صرف اون چیزوں کا اہتمام کریں جو ہماری قومیت یا مذہب سے متعلق ہیں عربی زبان ہی کو لیجئے جسکا تعلق ہم سے مذہب اور قومیت دونوں لحاظ سے ہو لیکن غیر قومیں برابر اسکی تحقیقات میں مصروف ہیں اور ہمیں خیال بھی نہیں ہماری اس بے حسی کا آخر یہ نتیجہ نکلا ہو کہ ہم جب کسی لفظ کی اصلیت کے متعلق بزرگان سلف کی تحقیق دیکھتے ہیں تو بغیر انتقاد نظر اسکو ماننے پر تیار ہوجاتے ہیں دل میں اسکا خیال بھی نہیں گزرتا کہ یہ تحقیق کس حد تک صحیح اور کہانتک غلط ہو اسی لہر یلے خیال کا یہ اثر ہے کہ آج ہماری جدید عربی کی لغتوں میں الفاظ کی حقیقت کے متعلق وہی الفاظ دہرادئے گئے ہیں جن کو قدما اپنی تصنیفات میں لکھ آئے ہیں۔

ہم نے جو اوپر دعوی کیا ہو اسکے لئے، ایک دو نہیں، بلکہ متعدد دلائل ہیں انہیں سے بعض کو بغرض اثبات دعوی و اظہار حق ہم بیان کرتے ہیں۔

اسوقت ہم ناظرین کا ذہن عربی الفاظ "شرطی" اور "ورق" کیطرف متوجہ کرنا چاہتے اور بتلاتے ہیں کہ کیونکر عرب مصنفین میں بوجہ تقلید کوئی جدید انکشافات اور تحقیقات ان الفاظ کے متعلق نہیں کی جا سکی ان الفاظ کے متعلق قدیم مسلمان لغت نویسوں کا یہ فیصلہ تھا کہ یہ عربی الاصل ہیں قدما کا زمانہ گذرنے کے بعد بوجہ تقلید کسی کو اسبات کا خیال تک نہ پیدا ہوا کہ اس کے متعلق کوئی نئی تحقیق کرے سب سے پہلے جن لوگوں نے ان الفاظ کے متعلق جدید خیالات ظاہر کئے، وہ صرف یورپ کے بعض مستشرق تھے اب ہم ان الفاظ کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہیں۔

"شرطی"

علاوہ قدما کے جدید عرب لغت نویسوں کا بھی یہی خیال ہو کہ یہ لفظ عربی الاصل ہی،

چنانچہ فیروزآبادی نے اسکے بارے میں جو کچھ لکھا ہی، اُسکا ترجمہ یہ ہی۔

"شُرطة بالضم جس کی جمع شُرَط ہ بروزن صُرد آتی ہی کسی فوج کے اول حصے کو کہتے ہین جو میدان جنگ میں حاضر ہو اور جان دینے پر تیار ہو اور اس گروہ کو بھی کہتے ہیں جو کسی والی یا حاکم کی اعانت کرے، اسکا اسم منسوب شرطی مثل ترکی و جہنی کے ہوگا وجہ تسمیہ اس کی یہ ہی کہ انھوں نے اپنے لئے کچھ علامات مقرر کرلئے تھے جنکے ذریعہ سے لوگ انکو پہچانتے تھے الخ"

سید مرتضٰی نے بھی بجنسہ یہی لکھا ہے اور اس رائے کو اصمعی کیطرف منسوب کیا ہی ابوعبیدة نے بھی اس رائے کی تائید کرتے ہوئے کہا ہی کہ "لأنہم اعدوا" یعنی شرط انکو اس لئے کہا گیا کہ انھوں نے اپنے آپ کو لڑائی کے لئے مستعد کرلیا تھا اور مختلف علامات کے ذریعے سے اپنے کو ظاہر کرتے تھے صاحب لسان العرب اور تمام مسلمان لغت نویسوں نے شرطہ کی وجہ تسمیہ یہی بتلائی ہی اور انھیں لوگوں کی تقلید بہت سے یورپین لغت نویس مثلاً فولیوس، فریتاغ، قزمیرسکے، لین صاحب وغیرہ نے کی ہی۔

اس رائے پر ایک بہت بڑا اعتراض جسکی وجہ سے اسکو عربی الاصل نہیں قرار دیا جا سکتا یہ وارد ہوتا ہی کہ یہ تحقیق اصول عربیت کے خلاف ہے اور ہر وہ شخص جو زبان کے اصول کا تتبع کرتا ہو، ہرگز ہرگز شُرطة کی اس وجہ تسمیہ کو نہیں مان سکتا اس اعتراض کی تفصیل یہ ہی کہ اگر یہ لفظ شُرط سے ماخوذ ہوتا جسکے معنی نشان کے ہیں تو عرب اسکو بجاے شرطی یا شرطہ کے یا تو "شارط" کہتے جیسا کہ انلوگون نے ضبط سے ضابط (افسر پولیس) بنالیا ہی، یا "مشترط" جیسا کہ التزام سے ملتزم (ٹھیکہ دار) بنالیا گیا ہی، یا اوراسی قسم کے مشتقات جو عربی کے اصول کے موافق فاعلیة پر دلالت کرتے ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ یہ لفظ عربی ہین منجملہ الفاظ دخیلہ کے ہی۔ چنانچہ یورپ کے مستشرق لغت نویسوں کی یہی راے ہو سب سے پہلے جس شخص نے اس لفظ کو دخیل قرار دیا، جرمن کا محقق فرنکل ہی جو اپنی تصنیف "الالفاظ الارمیة فی اللغة العربیة" مین یہ خیال ظاہر کرتا ہو کہ وہ یونانی لفظ سے ماخوذ ہی چنانچہ اسکی عبارت کا ترجمہ یہ ہی،

"میرے نزدیک بہتر یہ ہی کہ عرب کے لغت نویس اسکو مصری یونانی لفظ کو آرس (χωρ[illegible]) یا محض یونانی لفظ چورتھس ([illegible]) سے مشتق بتلائیں۔"

اس بارے میں اُسکی تقلید پادری لامنس یسوعی نے بھی کی ہی چنانچہ اسنے جو کچھ اپنی تصنیف

"کتاب الفروق" میں لکھا ہوا اسکا ترجمہ یہ ہی "

"اسبات کا بھی احتمال ہی کہ جسطرح لفظ "کہردستہ" گھوڑوں کا جرگہ (گلہ) مصری
یونانی لفظ کوآرس (χωδes) سے ماخوذ ہے اسی طرح لفظ شرطہ بھی اُسی سے
ماخوذ ہو"

میں اس رائے کی بھی مخالفت کرتا ہوں کیونکہ یہ دونوں لفظ (χωδes) اور (Χωδes)
جنکو یہ دونوں مصنف لفظ شرطہ کا ماخذ بتلاتے ہیں، صرف کسی گروہ یا فوجی جماعت یا لشکر پر دلالت
کرتے ہیں اور اسم جمع ہیں جنکا کوئی واحد نہیں آتا اور اسطرح گو یہ کہنا صحیح ہو جاتا ہی کہ ان دونوں
لفظوں سے لفظ "شرطہ" جو گروہ پر دلالت کرتا ہی" ماخوذ ہے لیکن اسوقت لفظ "شرطی" کے اعتبار سے
یہ کلام صحیح نہیں ہوتا۔ اسلئے ضروری ہے کہ لفظ مشتق منہ مفرد ہوتا کہ اسکی تعریب بصورت مفرد صحیح ہو
اور ایسا اسوقت میں ہوگا جب ہم کہیں کہ "شرطی" یونانی لفظ اسٹرٹیوٹس (στρατιωτης)
یا فرنچ لفظ اسٹریدیات (stradiat) اور (stradiot) سے ماخوذ ہے جنکے
معنی بعینہ وہی آتے ہیں جو عربی میں شرطی کے آتے ہیں اور شرطہ یونانی لفظ اسٹرٹیا سے ماخوذ
ہے جسکے معنی اُس لشکر کے ہوتے ہیں جو میدان جنگ میں حاضر ہو اور تا دم مرگ کارزار کے لیے مستعد
ہو۔ لفظ شرطہ میں ایک قرینہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ یونانی لفظ اسٹرٹیس سے ماخوذ ہو جسکے معنی فوج
کے آتے ہیں۔ چنانچہ چند انگریزی الفاظ میں بھی جو اس یونانی لفظ سے مشتق ہیں، فوج کا
مادہ مشترک پایا جاتا ہے۔ مثلاً Strategus (فوج کا جنرل) Stratagem
(فوجی داؤں گھات) Stratography (فن سپہ سالاری)
Stratocracy (فوجی گورنمنٹ) وغیرہ وغیرہ۔

"ورق"

ورق ان درہموں کو کہتے ہیں جو مضروب ہوں یعنی جن پر ٹھپا دیا گیا ہو۔ اس لفظ کی
اصلیت کے متعلق تمام مسلمان لغت نویس خاموش ہیں جن سے بطور عکس یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ انھوں نے
اسکو عربی الاصل سمجھا اسلئے اسکے متعلق ایک لفظ بھی انھوں نے اپنی کتابوں میں نہیں لکھا۔ اس
نظریہ کے تیقن کے لیے چند کتابوں کے حوالے کافی ہیں۔ صاحب قاموس فرماتے ہیں۔

"وَرْق اور وَرِق اور وَرَق بروزن جبل اور وِرْق بروزن کتف ان درہموں کو کہتے ہیں
جن پر ٹھپہ دیا گیا ہو۔ اسکی جمع اوراق اور وِراق آتی ہے اور رقۃ کے معنے بھی یہی ہیں"

تاج العروس کا مصنف بھی یہی لکھتا ہے اور ابن سیدہ سے یہ قول نقل کرتا ہے۔

"بعض دفعہ چاندی ہی کو ورق کہتے ہیں اور رقہ کے معنے خالص کے بھی ہوتے ہیں۔
چنانچہ اعطاہ الف درھم رقۃ کی مراد یہ ہے کہ اس نے اسکو ہزار درہم کے
علاوہ اور کوئی چیز نہیں عطا کی"

ابو الہیثم کہتا ہے۔

"ورق و رقہ کا اطلاق صرف دراہم پر ہوتا ہے"

شمر کہتا ہے۔

"رقہ صرف اس مال پر دلالت کرتا ہے جو نقرئی ہو"

اسی طرح آپ جس لغت کے صفحات الٹئے، آپکو اسکے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ملیگا، اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قدماء نے اسکو عربی الاصل سمجھا تھا۔ اور انکے دل میں اسکا وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ لفظ انکے زبان میں منجملہ الفاظ دخیل کے ہے۔ اکثر یورپین مصنفین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے کیونکہ ابتدائً یورپ میں مصنفین کا بھی یہی دستور تھا۔

سب سے پہلے جس شخص نے اس لفظ کو غیر عربی الاصل تبلایا وہ فرنکل ہو جسکا تذکرہ اوپر گذر چکا ہو۔ اُس نے اپنی کتاب میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ لفظ ارمی "یرق" یا حبشی رقہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک دونوں زبانوں میں اسکا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ یہ دونوں لفظ ابتدائً اسی معنی کے لئے وضع کئے گئے تھے بلکہ بہت ممکن ہے کہ خود ان زبانوں نے عربی لغت سے یہ لفظ اخذ کیا ہو۔

پادری لامنش یسوعی کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ لفظ غیر زبان سے ماخوذ ہے، چنانچہ اُنھوں نے اسکے متعلق جو کچھ اپنی تصنیف "کتاب الفروق" میں لکھا ہو اسکا ماحصل یہ ہو۔

"جب ورِق سے مراد دراہم مضروبہ ہوتے ہیں، تو اس میں تین اور نعتیں بھی کلام عرب میں وارد ہوئی ہیں وَرْق، اور وُرْق، اور میرے خیال میں وہ عربی الاصل نہیں ہے اور نہ شعراء متقدمین (؟) میں سے کسی نے اسکا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔

علامہ موصوف نے اس مقام پر دو غلطیاں کی ہیں، اولاً تو یہ کہ ورق میں صرف چار لغتیں بتلائی ہیں حالانکہ صحیح یہ ہے کہ اسمیں پانچ لغتیں ہیں، وَرْق اور وَرَق، دوسرے یہ اُنھوں نے یہ فرمایا ہے کہ قدماء کے کلام میں یہ لفظ نہیں پایا گیا حالانکہ شاعر سدوسی خالد

بن ولید، اور اُنکے علاوہ اور شعرا نے بھی جابجا اسکا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ فارسی "پرہ" سے ماخوذ ہے جسکے معنی جیسا کہ غیاث اللغات میں مرقوم ہے "برگ کاہ" اور "جزو" کے آتے ہیں۔ اسکے علاوہ ایک دوسرا لفظ پارہ بھی ہے جس کے معنی صرف ٹکڑے کے ہیں۔ ان دونوں لفظوں میں یعنی پرہ اور پارہ میں جو مشابہت حرفی موجود ہے وہ ناظرین کی نظروں سے مستتر نہیں ہے حقیقت اسکی یہ معلوم ہوتی ہے کہ پرہ کے اصل معنی "جزو" ہی کے رہے ہونگے اور برگ کاہ کا اطلاق اسکے اوپر مجازاً ہوا ہوگا۔ یہ دعوی اسوقت میں بالکل درست ہو جاتا ہے جب ہم کہیں کہ لفظ "پرہ" دوسرے فارسی لفظ "پارہ" سے مشتق ہوگا اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ "پرہ" کا لفظ جتنے معانی پر استعمال ہوتا ہے، پارہ کا لفظ اتنے معانی پر استعمال نہیں ہوتا بلکہ پارہ جن معانی پر بولا جاتا ہے "اسپرہ" کا لفظ بھی صادق آتا ہے برخلاف اسکے جن معانی پر پرہ کا اطلاق ہوتا ہے اُن پر پارہ نہیں بولا جاتا، اور جب یہ مقدمہ مان لیا گیا تو ہم دوسرا مقدمہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اصل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسکے تمام متعلقات منقول میں پائے جائیں بخلاف اسکے عکس کے۔

(۵) "پرہ" کا لفظ نقرئی سکہ پر بھی دلالت کرتا ہے جیسا کہ لفظ پارہ اسی معنی میں پچاس برس پہلے مستعمل تھا چنانچہ اس مناسبت سے "پارہ" کا اطلاق قدیم فارس میں "رشوت" پر بھی ہوتا تھا۔ کیونکہ رشوت سکے ہی پر مشتمل ہوتی ہے، پھر اسکے بعد "پرہ" کا اطلاق اس سکے پر بھی ہونے لگا جو تانبے سے بنا ہوتا تھا اور اس طرح صرف نام کا اشتراک رہ گیا۔ گو مادہ مختلف ہو گیا

جب کسی فارسی لفظ کے آخر میں ہ ہوتی ہے اور وہ لفظ عربی میں منتقل کیا جاتا ہے تو وہ ہ بدلکر قاف، کاف، جیم، اور ت ہو جاتی ہے مثلاً بابونہ سے بابونج، برزعہ سے برذعۃ، بورا سے بورق، نیزہ سے نیزک، وغیرہ وغیرہ

پائے فارسی تین قسم کا ہوتا ہے (۱) رقیقہ مثلاً پاپوش و پاشنہ اس حالت میں پائے فارسی واو یا ب سے بدل جاتا ہے مثلاً مذکورۂ بالا دونوں لفظوں میں کہ جب عربی میں منتقل کریں گے۔ تو انکو بابوش اور واشق کہینگے (۲) فخیمہ اور اس حالت میں اسکو عربی میں فا سے بدل دینگے اسپہان سے اصفہان (۳) وہ پے جو ان دونوں کے درمیان میں ہے یعنی جسکی آواز مذکورہ بالا دونوں قسموں کے بیچ سے نکلے اس حالت میں اسکو ب، فا، و اور ف سے بھی بدل دیتے ہیں مثلاً کپان سے قفان و قبان۔ تاج العروس میں مادہ قفف میں

اصمعی کا ایک قول منقول ہے جسکا ترجمہ یہ ہے :-

"قطان یعنی کپاس (ترازو) اس لفظ میں وہ پ جسکی آواز ب اور ف کے درمیان سے نکلتی ہے ف سے بدلدیا گیا ہے اور اسکو ب سے بھی بدلنا جائز ہے کیونکہ سیبویہ نے اس پ کو جسکی آواز ب اور ف کے درمیان سے نکلتی ہے، ب و ف دونوں سے بدلنے کی اجازت دی ہے"

اب جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں، انھیں اصولوں کے مطابق پرہ سے بدلکر عربوں نے ورق اور پارہ سے بارہ بنا لیا ہوگا۔ پہلے لفظ میں اُنھوں نے پ کو و آ و سے اور ہائے ہوز کو ق سے بدلا اور دوسری لفظ میں پ کا تغیر ب سے کر لیا، لیکن جب عربوں کو اسبات کا خیال گزرا کہ یہ لفظ ورق سے مشتق ہے جسکے معنی انکے یہاں پتی توڑنے کے ہیں تو اس میں اُنھوں نے دو لفظوں کی اجازت دی یعنی ورق و ورقۃ

سب سے عجیب بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے رقۃ کی جمع رقین و رقون یعنی جمع سالم بنالی جسطرح سے کہ اُنکے یہاں ارۃ کی جمع ارون و ارین آتی ہے جسکے معنی آتشدان کے ہیں لبعض عربوں نے رقین کو فعیل کے وزن پر واحد خیال کیا اور اسطور پر عربی میں ایک دوسرا لفظ جسکا مادہ رقن تھا پیدا ہوگیا اور اس کے معنی درہم کے قرار دیے گئے۔ رقیم جسکے معنی نوشتہ کے ہیں۔ غالباً اسی رقین کی تصحیف ہے جیسا کہ انکے یہاں اکثر ن کو م سے اور م کو ن سے بدل دیتے ہیں۔ امثال کے طور پر چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

این سے ایم (بمعنے سانپ)
غین سے غیم (ابر)
اسود قاتن سے اسود قاتم (زیادہ سیاہ)
حزن سے حزم (غم اور تردد)
فعن سے فعم (ناک کی کجی)

اور انکے علاوہ اور سیکڑوں الفاظ ہیں جن میں ن کو م سے یا م کو ن سے بدل دیا گیا ہے۔ ان اُمور سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کے یہاں ایک ہی لفظ میں کسقدر تبدیلیاں و تغیرات ہوتے ہیں اور یہ کہ اُنکی زبان میں کتنی وسعت ہے۔ وہ لوگ جب کسی لفظ کو اسکے ماخذ سے لیتے ہیں تو چند ہی مدت میں اسمیں اسقدر تغیر و اشتقاع پیدا کرتے ہیں کہ اصل کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ یہ سب حقیقت

کے راز ہیں جنپر واقف ہوکر، ہر وہ شخص جسکو اس وسیع لغت کے ساتھ ذوق ہو دلچسپی حاصل کرسکتا ہے اور جب یہ معلوم ہوچکا کہ ورق اصل میں فارسی لفظ برہ یا پارہ سے ماخوذ ہے تو یقینی طور پر ورق کے معنی پہلے عام طور پر "کل قطعۃ من قطع الملوکات" کے رہے ہونگے جسکا ترجمہ فرنچ میں "une piéce de monnoie" ہوتا ہے پھر اسکے بعد ورق کا اطلاق چاندی ہی کے درہموں پر یا مطلق درا ہم پر خواہ وہ نقرئی ہوں یا طلائی یا مسی بشرطیکہ وہ کسی مضروب دھات کا ٹکڑا ہو، ہونے لگا اور پہلے معنی جس سے یہ خاص معنی منقول ہوئے تھے بالکل مٹ گئے۔

مرزا نبی احمد بیگ

عشق

عشق کی مجمل تعریف کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ "دماغ میں ظاہری اور باطنی حواس کے قید ہوجانے کو عشق کہتے ہیں" مناظر اور تصورات کا اثر فوراً دماغ کے محافظ خانہ میں پہونچکر قوت متفکرہ کی لوح پر اس طرح نقش ہو جاتا ہے کہ اُس میں کسی اور طاقت کے قبول کرنیکی صلاحیت و قابلیت اور گنجائش نہیں رہتی۔ اسی حالت کا نام عشق ہی، اور اس صفت کے موصوف کو عاشق کہتے ہیں۔ ثبوت کیلئے کسی حجت کی ضرورت نہیں، اس سے قریب قریب ہر شخص واقف ہی کیونکہ عاشق کی قوۃ باصرہ محبوب کے حسن وجمال، سامعہ معشوق کی آواز کی مشتاق ہوتی ہے۔ لامسہ مطلوب سے بغلگیر ہونا چاہتا ہی، شامہ کو معنبر زلفوں کی خوشبو سے معطر ہونے کی آرزو ہوتی ہی ذائقہ لب جان بخش کے بوسے کا امیدوار اور طلبگار رہوتا ہے یہ حال تو حواس ظاہری کا ہے اب حواس باطنی کی کیفیت دیکھئے ادراک میں تصور دلدار، تخیل میں خیال وصال یار متصرفہ میں ذکر حسن گلعذار، واہمہ میں وہم فراق حافظ میں یاد معشوق کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور بجز مذکورہ امور کے دنیا بھر کی لذتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

اسکے اثبات میں کہ "محل واحد میں اجتماع حواس کا نام عشق ہے" نکتہ رس دقیقہ سنج

بھی مختلف آراء ہیں۔ اُن کا اعتراض ہے کہ تمام حواس کا اپنی حرکات و سکنات، اور ادراکات میں مستقل قرار دیا جانا صحیح نہیں اس لئے کہ حواس کا ایک جگہ جمع ہونا غیر ممکن ہے۔ اور اس دعوے پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ ایک [illegible] پھول سے جس میں بو نہ ہو باصرہ بصارت حاصل کرتی ہے مگر شامہ قطعی محروم رہتی ہے۔

ہمیں ان اختلافات سے غرض نہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حواس ظاہری و باطنی کے دماغ میں مقید ہو جانے اور کسی غیر معلوم قوت کا جسم کے تمام رگ پٹھوں میں مسلط ہو کر ہر کام سے بیکار و بیزار کر دینے کا نام عشق ہے عشق کے تسلط کے لئے ضرورت نہیں کہ دماغ ضعیف اور اس میں انفعال کی قابلیت ہو بلکہ جمال یار کی مقناطیسی کشش سے ہر نوع بشر کا کھنچ جانا فطری بات ہے اور خلاف قیاس نہیں۔ اور جبکہ یہ مسلمہ ہے کہ حواس کا مرجع دماغ ہے اور ہر چیز کا اپنے مرکز کی طرف رجوع ہونا سب مانتے ہیں تو ہر حاسہ کا اپنے محسوسات کو دماغ میں لیجانا کسی طرح غیر ممکن نہیں سمجھا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دماغ بطور دارالسلطنت کے ہے، اور ممالک کی طرح اس کی حکومت کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے کیونکہ تمام حواس اپنے محسوسات کو بالواسطہ یا بلاواسطہ دماغ میں پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں سے محاکمہ شروع ہوتا ہے۔

کسی کے جمال جہاں آرا پر نظر پڑی۔ اس نے بھولی بھالی اداؤں، ناز و انداز اور کرشموں وغیرہ سے متاثر ہو کر اپنے حاکم کو خبر کر دی حاکم نے اسکا نام محافظ خانہ کے رجسٹر میں درج کر لیا اسی طرح کان نے اچھی اور دل کو تڑپا دینے والی آواز سنی اس نے بھی اپنا فرض ادا کیا اور جب اس قدر واقعات وقوع میں آچکے تو ذوق کو بھی بوسہ کی خواہش ہوتی ہے۔ غرض سب حواس اپنا فرض منصبی انجام دیتے ہیں اس تعمیل اعمال کے دوران میں ممکن نہیں کہ دل کو ان خفیہ اور خاموش کارروائیوں کی خبر نہ ہو اُسکی توجہ بھی محبوب کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ سب قوتیں مل جلکر مستحکم صورت اختیار کر لیتی ہیں ان میں سے کسی نے اعراض کیا تو دماغ انھیں اپنے ارادہ پر مستقل نہیں رہنے دیتا۔

محمد اظہر ظاہر

بشرہ

کیوں نہ سمجھوں میں تیرے دلکی بات
تیرا بشرہ گواہی دیتا ہے

ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ انسان دو قسم کی قوتیں رکھتا ہے۔

(الف) ظاہری

(ب) باطنی۔

گو ان دونوں قسم کی قوتوں میں باہمی نسبت بھی ہے پھر بھی یہ دو قسم کی ہیں یا یہ کہ ان دونوں کے افعال اور تصرفات جداگانہ ہیں باوجود اس تفریق کے بھی ایک قوت دوسری قوت سے ایک علاقہ رکھتی ہے جسطرح معادی اور معاشری امور میں باوجود تمیز ہونیکے بھی تعلق اور وابستگی ہے اسی طرح ان میں بھی ہر عبادت الٰہی محض روحانیت کا شعبہ ہے لیکن معاشری امور پر بھی اسکا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔

یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ

"آدمی کا ظاہر اُسکے باطن کی تصویر ہے۔

"اور سب اعضاء میں سے انسان کا بشرہ اُس کے باطنی خیالات اور تصرفات پر مختلف پیرایہ میں روشنی ڈالتا ہے۔

انسان کی زبان اور انسان کا کلام انسان کے خیالات کی بابت بہت کچھ اطلاع دیتا ہے اور اسکی زندگی کے قریباً کل امور کا مدار اُسکے کلام پر ہے اُسکے دل و دماغ میں جو کچھ بھرا ہو اسکا اظہار اور اُسکی تکمیل اُسی کے ذریعہ ہوتی ہے زبان انسان کے دل کی باتوں اور دماغی خیالات کے اظہار کا ایک مستقیم آلہ ہے۔ لیکن جو لوگ انسانی اعضاء پر غور کرنیوالے ہیں اُنکی یہ رائے بھی ہو کہ انسان کا چہرہ بھی اُسکے خیالات پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے بعض کہتے ہیں انسان کا چہرہ بمقابلہ اسکی زبان کے زیادہ مکمل اور دلچسپ اطلاع دیتا ہے۔

"انسان کا چہرہ اُسکے دلی اور دماغی خیالات کا ایک کھلا ہوا دفتر ہے۔

"انسان کا چہرہ اُن رموز اور اُن اُمور کا مظہر ہے جو زبان ذرا تامل سے ظاہر کرتی ہو۔

"انسان کا بشرہ اُن اُمور کی خبر دیتا ہے جن سے زبان واقف نہیں۔

"زبان صرف اُن خیالات کا اظہار کرتی ہے جو وہ دل و دماغ سے سنتی ہو۔ لیکن بشرہ بسا اوقات وہ باتیں بتاتا ہے جنکا اظہار دل نہیں چاہتا گویا ان معنوں میں بشرہ انسان ایک سی آئی ڈی کا منصب رکھتا ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ انسان کا بشرہ صرف اُن امور اور اُن رموز کا مظہر ہے جو غصہ اور خوشی یا رنج و غم اور حسرت سے مربوط ہوں اُن رموز اور اُن اُمور سے واقف نہیں کر سکتا۔ جو اِن مراتب سے دور ہیں۔

دونوں طرف کے خیالات قابل بحث ہیں اِس بحث سے اول سوچنا چاہیئے کہ زبان اور بشرہ کے کاموں اور تصرفات یا احساسات میں کس قسم کا فرق ہے زبان ایک چھوٹا سا گوشت کا ٹکڑا ہے جو انسان کے منھ میں رکھا گیا ہے۔ اگرچہ زبان اور زندہ مخلوق بھی رکھتی ہے۔ مگر چونکہ انسان اسکے ساتھ طاقت نطق یا شرف نطق بھی رکھتا ہے اس واسطے وہ ناطق اور متکلم بھی ہے بشرہ وہ حصہ جسم ہے جسکا تعلق دہان اور سر سے ہے گویا دماغ بھی یا دماغ کا کچھ حصہ بھی بشرہ مین شامل ہو یا بشرہ کا ایک حد تک دماغ سے بھی واسطہ ہو بشرہ کے حدود میں ہی زبان بھی ہو زبان کے فعل یا تصرف کا تعلق ایک حد تک بشرہ سے بھی ہوتا ہے دیکھو جب کبھی انسان کچھ سوچتا یا کسی بات کی بابت غور کرتا ہے تو انسان کا چہرہ بھی ایک حد تک اس میں مصروف پایا جاتا ہو ایک شخص کو سوچ میں بیٹھے ہوئے ذرا غور سے دیکھو گے تو سمجھوگے کہ اُسکے چہرہ پر بھی اُسی سوچ کا کچھ نہ کچھ اثر ہے ایک غم زدہ تصویر اور ایک بشاش تصویر تمھیں بآسانی اس اثر کی خبر دے سکیں گی ایک حکیم مزاج اور ایک لاپرواشخص کے چہرے تمھیں باونی غور بتا دینگے کہ اُن کے خیالات اور افکار کا اُن پر کیسا اور کیا اثر ہے۔

جب کوئی بشر خوشی یا غم کی بات کرتا ہے تو ساتھ کے ساتھ ہی اُسکا بشرہ بھی تغیر پذیر ہوتا جاتا ہے جب کوئی انسان مسرت ناسماں دیکھتا ہے تو اسکے چہرہ کی کیفیت کچھ اور ہی

ہوتی ہو اور جب کوئی غم افزا سمان دیکھتا ہو تو اُس وقت اُسکی کچھ اور کیفیت ہوتی ہو۔
شیریں شے کھا کر انسان کے چہرہ کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ کسی کڑوی شے کے کھانے سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔

اس سے ہم انکار نہیں کرسکتے کہ بشرۂ انسان جاسوسی کرتا ہے اور اس کی باتوں پر ایک حد تک روشنی ڈالتا ہے گو انسانی چہرہ یا کتاب بشرہ کا مطالعہ بہت کچھ تجربہ بھی چاہتا ہے۔ مگر تجربہ کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ درحقیقت انسانی بشرہ ایک حد تک جاسوسی کا کام دیتا ہے۔

تو کہہ نہ کہہ دل میں ترے جو بات رہتی ہے
ترے بشرہ کی کیفیت بتانے سے نہیں رُکتی

اِن باتوں سے ثابت ہے کہ۔

انسان کے دل و دماغ پر جو کچھ گزرتی ہے یا جو کچھ وارد ہوتا ہے اسکا اثر بشرہ پر بھی پڑتا ہے یا بشرہ بھی اپنے رنگ میں اس سے اثر پذیر ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ بہ مقابلہ جسم انسانی کے اور اعضا کے دل و دماغ کا بشرہ سے زیادہ تر تعلق اور واسطہ ہے دیکھو کبھی جو ہاتھ اور پاؤں ماؤف ہوتا ہے اور بہ ظاہر کوئی زخم نہیں ہوتا ہاتھ اور پاؤں تو کوئی احساس بشرہ کو نہیں کرسکتا لیکن بشرہ جاسوسی کرنے سے باز نہیں رہتا یہ خوبصورتی اور بدصورتی جسکی بے میں ہزاروں روحیں غلطاں و پیچاں ہیں کیا ہے اور اسکا مقدم حصہ جسم انسانی میں کیا ہے یہی بشرہ تو ہے کسی نازنین کا اور سارا جسم خوبصورت اور سڈول ہو اگر بشرہ خوبصورت نہو تو کوئی اُسے خوبصورتی کا ڈپلوما نہیں دیتا اگر ایک شخص جسم کے اور حصے زیادہ سے زیادہ خوبصورت رکھے اور بدقسمتی سے چہرہ خوبصورت نہو تو کوئی شخص یا کوئی نقاد حسن بھی اسکو خوبصورتی کی سند نہیں دیتا اس سے ثابت ہے کہ صرف بشرہ ہی ایسا سارٹیفکیٹ دلاتا ہے۔

اِس مثال سے بھی ثابت ہے کہ چہرہ میں قدرت نے ایک خصوصیت مخفی رکھی ہے خوشی اور غم کا جیسے چہرہ پر اثر ہوتا ہے ایسے کسی اور عضو پر نہیں ہوتا اور اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اس سے ثابت ہے کہ دل و دماغ اور سلسلۂ اعصاب اور قویٰ میں خصوصیت کے ساتھ چہرہ سے ایک

وابستگی اور ایک نسبت رکھتی ہیں۔ دل و دماغ کی زیادہ مسرت اور غم کے اظہار رہنے کے ساتھ ہی چہرہ بھی متاثر ہو جاتا ہے اگر چہرہ بھی زبان نطق رکھتا فوراً ہی کہہ دیتا۔

اجازت ہوتی اگر مجھ کو کبھی یہ راز کہنے کی

تو میں اپنی زباں سے ہی سنا دیتا یہ سب قصہ

دماغ دل اور بشرہ کی رگوں اور اعصاب میں قدرت نے ایک قسم کی وابستگی رکھی ہو جب دماغ میں ایک خیال متخیل ہوتا ہے اور جب دل میں ایک موج اٹھتی ہو تو اس وابستگی کی وجہ سے چہرہ بھی متاثر ہوتا ہے اور اس طاقت احساس کی وجہ سے جو قدرت نے اسمیں رکھ چھوڑا ہے مختلف تاثرات اثر پذیر ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ بشرہ اُن کا رنگ قبول کرتا جاتا ہے یہانتک غور سے دیکھنے والے پا جاتے ہیں کہ اس شخص کا دل اس رنگ میں ہے ارسطو کہا کرتا تھا کہ

"بولو تاکہ میں تمھیں دیکھ سکوں"

اسکا مطلب صرف یہ لیا گیا ہو کہ کلام متکلم سے وہ اسکی نسبت رائے لگا لیتا تھا بمصداق

تا مرد سخن نگفتہ باشد

عیب و ہنرش نہفتہ باشد

لیکن اسکا مطلب یہ بھی ہو کہ چونکہ ہمیشہ کلام کا بہت سا حصہ متکلم کے چہرہ پر بھی مؤثر ہوتا ہے اسواسطے زبان سے سن کر چہرہ کے آثار سے اُسکا مقابلہ کر کے اندازہ لگایا جائے مثلاً جب کوئی گپی گپ ہانکتا ہو تو بعض اوقات اسکا بشرہ کہہ دیتا ہو کہ ایک خالی ڈھول ہو جب کوئی جھوٹا وعدہ کرتا ہے تو بعض لوگ آثار بشرہ ہی سے تاڑ جاتے ہیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔

تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

بشرہ کر دیتا ہو مخبری چھپ کے

تم دیکھتے نہیں کہ گفتگو میں بعض تنت آنکھیں اور بشرہ کے دیگر خط و خال کسقدر شگفتہ یا کشیدہ ہوتے ہیں اور جو کچھ متکلم کے ذہن میں متموج ہو رہا اسکا چہرہ پہ عکس پڑ رہا ہے یا چہرہ اس سے

متاثر ہو رہا ہے۔

انسان کے دل و دماغ میں جو کچھ گزرتا ہے وہ ایک قسم نہیں رکھتا بہت سی ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جنکا اثر انسان کے بشرہ پر نہیں ہوتا۔ ہو تو سکتا ہے یا ہونا تو چاہیے لیکن چونکہ رفتہ رفتہ طبیعت ایک حد تک ضابطہ ہو جاتی ہے یا صرف ایک بات ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک عادت کا درجہ رکھتی ہے اس واسطے بشرہ اُس سے متاثر نہیں ہوتا اگر کوئی شخص عرصے سے زہر کا استعمال کرتا ہو تو طبیعت اُسکی عادی ہو جائیگی لیکن اگر پہلا ہی دن ہو تو طبیعت پر کچھ اور اثر ہوگا اسی واسطے فلسفۂ اخلاق میں کہا گیا ہے کہ

"اگر بری عادت طبیعت ثانی ہو جائے تو انسان کی حس جاتی رہتی ہے بمقابلہ تجربہ کار اور مشاق لوگوں کے عام لوگوں کے دل و دماغ کے خیالات کا اثر اُن کے بشرہ پر زیادہ قابل احساس اور واضح پڑتا ہے کیونکہ اُنکی سادگی اور عدم مشاقی اُن کا توام ضبط خام رکھتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ ایک تجربہ کار چور آسانی سے اقبال جرم نہیں کرتا لیکن ایک نومشق چور چند گھنٹوں کے بعد ہی اقبال کر لیتا ہے طبیعت بھی رنگت بدلتی رہتی ہے اور اُسکے ساتھ ہی بشرہ بھی تبدیل پذیر ہوتا رہتا ہے۔

قدرت کا کوئی فعل بھی چونکہ لغو نہیں ہو سکتا اسواسطے یہ سوال دلچسپ ہوگا کہ بشرہ میں یا بشرہ کے حدود میں کیا کیا یا کون کون سے عضو شامل ہیں اور بشرہ میں جو ایسا احساس رکھا گیا ہے اسکا علماً اور عملاً کیا فائدہ اور کیا غرض ہے یہ دو سوال واقعی ایسے ہیں کہ ان پر غور کرنا ایک علمی مرحلہ متصور ہو سکے گا۔

چونکہ انسانی جسم کے حصہ مقدم ترین دماغ اور دل ہیں اور بشرہ ان دونوں سے ایک قسم کی وابستگی رکھتا ہے یا یہ کہ بشرہ کی ذاتی عظمت اور تقدم دل و دماغ پر بھی ایک اثر رکھتا ہے اسواسطے بشرہ کو یہ احساس بخشا گیا۔ بشرہ ایک آئنہ ہے جب تک آئنہ عکس پذیر نہ ہو تب تک نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک سفید اور شفاف آئینہ ہے اس واسطے اس میں یہ طاقت جبارا رکھی گئی۔

چونکہ سب سے پہلے انسان کے بشرہ پر ہی نظر پڑتی ہے اس واسطے اُسے بھی ایک قسم کا

ملکہ احساس دیا گیا اسکا علمی فائدہ یہ ہے تاکہ غور کرنے والے یہ سوچیں کہ۔
ایک اعلیٰ ترین حصہ جسم انسانی کا دیگر اور اعلیٰ ترین اعضاء دماغ و دل اور دیگر قوتوں سے کس قسم کا تعلق اور واسطہ رکھتا ہے اور بحث منطق فلاسفی میں یہ طے ہو جائے کہ خیالات کی پرواز اور اثر کہاں تک اور کیا ہے تاکہ اس کوچہ فلسفہ میں جانے والے ان مراتب سے بھی واقف رہیں اور انھیں اسباب پر غور کرنے کا بھی موقعہ ملے کہ انسانی ذہن اور جسم خصوص بشرہ کا آپس میں کیا کچھ واسطہ اور نسبت ہے اور یہ ڈاک کن کن ذرایع سے پہونچتی ہے اور اس سلسلہ میں کن کن صورتوں میں روک پڑ جاتی ہے۔
بشرہ ہی کے مطالعہ سے دنیا میں علم یا فن قیافہ کی بنیاد رکھی گئی اور بشرہ ہی اس علم کا بانی ہوا اور ثابت ہو گیا کہ خدائے کریم نے انسانی بشرہ کو کس درجہ تک ممتاز کیا ہے وہ نہ صرف اپنی فطری خوبصورتی زبان اور نطق کے اعتبار ہی سے ممتاز ہے بلکہ اس جہت سے بھی کہ وہ دل و دماغ کا آئینہ بھی ہے اور اس کے احساس سے ہم ایک بڑی حد تک کام بھی لے سکتے ہیں انسان کا سر اور بشرہ ایک خاص عظمت رکھتا ہے دیکھو ہر انسان سوائے کسی اعلیٰ طاقت کے سجدہ کرنا قبول نہیں کرتا یہ سر اور یہ بشرہ خدا ہی کے سامنے جھکتا یا جھکایا جاتا ہے کیونکہ انسانی جسم میں یہی اعضاء اعلےٰ اور مقدم ہیں جو لوگ زبان نطق فی العمل نہیں رکھتے اُن کا چہرہ ہی اُنکی حقیقت دل و دماغ سے آشنا کرتا ہے اگر بشرہ نہ ہوتا تو یہ ڈیوٹی کون ادا کرتا طبیب نبض سے بھی تشخیص مرض کرتے ہیں اور اسی طرح بشرہ سے استدلال ہوتا ہے اور بعض طبیب بمقابلہ نبض کے بشرہ سے زیادہ تر استدلال کے عادی ہیں۔
بشرہ ایک ایسا مخبر ہے کہ بے خوف و خطر مخبری کر دیتا ہے اور اس کے مطالعہ سے ایک دشمن بھی پتہ لگا لیتا ہو کہ اس شخص کے دل و دماغ میں کیا کچھ گزر رہی ہے اور اسکا بشرہ خاموشی سے کیا کچھ مخبری کر رہا ہے۔
بشرہ میں آنکھیں، کان۔ ناک رخسار شامل ہیں اور اسکے حدود میں زبان اور دماغ بھی ہیں اور اُسکی وابستگی دماغ اور دل دونوں سے ہے۔ بشرہ کی خوبصورتی اگرچہ ایک

خاص قیمت رکھتی ہے اور لوگ اسکی لے میں ایک بڑی حد تک سرگرداں رہتے ہیں۔

مشتاق روئے زیبا ہوں

دل سے اُسکا شیدا ہوں

لیکن اگر غور سے دیکھو تو یہ زیبایش محض ایک عارضی سماں ہے تھوڑی سی تکلیف بھی اس زیبایش کی دشمن ثابت ہوتی ہے وہ حسین جنھیں سارا زمانہ چار آنکھوں سے دیکھتا اور اُن کے بشرہ کو مد مقابل ماہتاب و آفتاب سمجھتا تھا ایک ہی بخار میں ایسا زرد پڑا کہ عاشقوں کی نظر سے بھی اتر گیا شاعر نے جب نگاہ کی تو اُسکے تموج خیال میں فرق آگیا دنیا میں صدہا قسم کے سُراب ہیں لیکن اُن سب میں سے "سراب حسن" زیادہ تکلیف دہ ہے یہ وہ سُراب ہے جس سے خود حسین بھی باوجود ایسے ادعا اور تعلی کے ہراساں رہتا ہے وہ بشرہ زیادہ تر عزت اور محبت کے قابل ہے جس میں سیرت حسنہ کا زیادہ تر عکس پڑتا ہو خوبی عکس اور سوادی جھلک کچھ پائیدار نہیں ہوتی سیرتی عکس اور اتفاقی جھلک زیادہ تر توجہ اور محبت کے قابل ہے۔

حسن سیرت کے ہم تو قائل ہیں

حسن صورت ہے اک اضافی شئے

سلطان احمد

سلوک عبرت

مکن تکرار ہر دم اے نفس درسِ محبت را
مدہ در ہر دو عالم نشہ صہبائے حیرت را

زمانے کے نشیب و فراز بھی ایک عجیب طلسم کدۂ حیرت ہیں۔ روز آفرینش تا دور حاضرہ صدہا اقسام کے گوناگوں واقعات اس آب و رنگ کے پیش آتے رہتے ہیں جن پر دنیا نے ہمیشہ استعجاب و تحیر کا اظہار کیا ہے اور اسوقت تک رسائی فہم اُسی طرح قاصر ہے جس طرح کہ روزِ اول تھی۔ وہی مغرب جو آج اپنے آپ کو تمام دنیا کی تہذیب و شائستگی کا جادہ گاہ سمجھتا ہے کل تک وہاں توحش کے سوا کچھ نہ تھا۔

علم و فن کی جگہ جہل و تعصب نے لے رکھی تھی عقل و دانش سے کام لینے والوں کیساتھ وہ سلوک روا رکھا جاتا تھا جسکی نظیر تاریخ میں نہیں ملسکتی۔

اذن عام تھا کہ کسی علم میں عقل سے کام نہ لیا جائے۔ کتاب مقدس کو بھی عقل سے سمجھنے کی ممانعت تھی۔ ایک شخص پلاجؔ نے ثابت کیا کہ موتِ آدمؑ سے قبل بھی تھی، زمین پر رہنے والے جانور مرتے تھے لہذا موت کو آدم کے گناہ کا نتیجہ بتانا غلط۔

اسپر فوراً پلاج قتل کر دیا گیا۔ جولیس سیزر کے عہد حکومت میں کتب خانہ اسکندریہ جلا ڈالا گیا۔ ایک نوجوان عورت ہائی پیشیا جو ریاضیات فلسفہ او طبیعات میں ماہر و فاضل تھی۔ اسکے گرد بیشتر اہل علم کا مجمع رہا کرتا تھا۔ وہ باوجود اسکے کہ عیسائی نہ تھی کرپادری سیرل نے لوگوں کو اسکے برخلاف بھڑکایا اور قتل کر دی گئی اسکا جسم آگ میں پھونک دیا گیا۔ پوپ نوسنٹ کا قول تھا کہ کتھولک عقائد کے منکرین کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔



اسپین کی اعلیٰ اسلامی یونیورسٹیوں کو وہ چند باکمال مغربی جو فلسفہ ابن رشد اپنے ساتھ لیگئے اس فلسفہ نے ساکنانِ یورپ کی آنکھیں کھولدیں دماغ روشن کر دیئے جب انھوں نے بعض باتیں مذہب

عیسوی کے خلاف بیان کیں وہ ہر جگہ ستائے جانے لگے ایک شخص نے قوس قزح کی نسبت یورپ
کے عقائد و خیالات کے خلاف جب یہ کہا کہ یہ خدا کی انتقام لینے والی کمان نہیں بلکہ آفتاب
کی روشنی پانی کے بخارات پر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے تو اسکو قید کیا گیا اور مرنے کے بعد اسکی
نعش قبر سے نکالکر آگ میں ڈالدی۔

اسکے کچھ عرصہ بعد ایک خاص محکمہ تفتیش قائم ہوا اور اعلان کیا گیا کہ کوئی کتاب بغیر
اجازت پوپ نہ طبع ہو جسکا مقصد حقیقی یہ تھا کہ اُن علوم اور فلسفہ کا مقابلہ کیا جائے جو ابن رشد
کے تلامذہ کے ذریعہ اٹلی اور جنوبی فرانس میں پھیلتا جاتا تھا۔ اس محکمہ نے صرف سنہ ۱۴۸۱ء و
سنہ ۱۴۹۹ء کے مابین دس ہزار دوسو بیس اشخاص کو زندہ جلانے کا فتویٰ دیا جو زندہ جلا دیئے گئے
اور سولہ ہزار آٹھ سو ساٹھ (۱۶۸۶۰) اشخاص کو اس محکمے نے پھانسی پر لٹکایا اور (۹۷۰۲۳)
اشخاص کے لئے مختلف دیگر سزائیں تجویز کیں۔

یورپ کی تاریک دنیا میں اس ستمگرانہ روش کے علاوہ سزا دینے کا ایک عجیب
ظالمانہ قاعدہ یہ تھا کہ جنپر تہمت لگائی جاتی تھی اُنکو مخصوص اقسام کے مہلک آلات سے اس درجہ
تکلیف پہونچائی جاتی تھی کہ وہ الزام کا اقرار کر لیتے تھے۔ اور اقرار کے بعد فوری احکام نافذ ہوتے
تھے سنہ ۱۵۰۲ء میں پادریوں نے قرار دیا کہ ابن رشد کے فلسفہ کے مطالعہ کرنے والوں پر لعنت کیجائے
لیکن اسکا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ابن رشد کا فلسفہ جاننے والوں کو نکالا خوفناک
سزائیں دیں اور ستانے جلانے مارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

اس ظلم و عدوان کا کوئی ٹھکانا ہے۔ ایسے ستم و توحش کی کہیں مثال ہے کہ آج کے مہذب یورپ
نے کل سنہ ۱۴۸۱ء سے سنہ ۱۸۰۸ء تک (۳۴۰۰۰۰) اشخاص کو محکمہ تفتیش کے ذریعہ سے ہولناک سزائیں
دیں اور منجملہ اُنکے (۲۰۰۰۰) آدمی زندہ جلائے گئے۔

پادریوں کے خیال میں ابن رشد ہی اسلامی فلاسفر ہے جسنے یورپ میں علمی آزادی
کی روح پھونکی اور چونکہ یہودی اس فلسفہ کو سیکھکر ان خیالات کی نشر و اشاعت کے باعث ہوئے
تھے اسلئے یہودیوں اور مسلمانوں کو ایک ساتھ شہر بدر کر دینا تجویز ہوا۔ سنہ ۱۴۹۲ء [illegible]

کہ جو یہودی عیسائی ہونا قبول نہ کرے وہ جولائی سے قبل اسپین کو چھوڑ دے۔ ورنہ قتل کر دیا جائیگا
اسی طرح فروری سنہ ۱۵۰۲ء مین اشبیلیہ اور اسکے نواحی علاقون میں مسلمانوں کی جلا وطنی کا اعلان
کیا گیا کہ جو مسلمان عیسائی نہ ہو وہ اپریل سے پہلے اس ملک کو چھوڑ دے۔ غرض مسلمانوں پر بھی
قہر کی بجلیاں گرائی گئیں۔ ہزاروں قتل لاکھوں جلا وطن۔ بے شمار ہلاک اور بے تعداد تباہ ہوگئے!
بقول مورخین تیس لاکھ مسلمان نیست و نابود کر دیئے گئے۔

یہی نہیں ہوا ذرا یوروپ کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ یہی یورپ کی مہذب اقوام جو آج اپنے سوا تمام
دنیا کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہین۔ صدیوں تک ایشیاء سے بمراتب زیادہ وحشت و
خونریزی میں مبتلا رہی ہیں سولھویں صدی میں یوروپ کی بعض قوموں کے ہاتھ سے امریکا کے
اصلی باشندوں پر کونسا ظلم اور بے رحمی ہے جو روا نہ رکھی گئی جو ظلم اسپین والوں نے کئے انکی نظیر
دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ کورٹیز اور دوسرے جنرلوں نے یہ عزم کر لیا تھا۔ کہ میکسیکو کو کلیتاً
ویران کرکے وہاں اسپین کی ایک نو آبادی قائم کی جائے۔ چنانچہ وہاں کے باشندوں کے نیست
و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔

شہنشاہ میکسکو مونی زوما کو الٹا لٹکا کے اسکی رعایا کو اسکی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کیا

عیاذاً باللہ!

بڑے بڑے الاؤ سلگے ہوئے تھے جنمیں ہزارہا آدمی عام طور پر بلا تکلف جلائے جاتے تھے
معصوم بچوں کے سامنے اُنکے ماں باپ طرح طرح کی عقوبتوں کے بعد آگ میں جھونک دیئے جاتے
تھے دیہات اور گاؤں میں۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں ہزاروں آدمی کتوں سے پھڑوا ڈالے
گئے یہ اسپین کے وہی نیک کردار اور ملائک صفت عیسائی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو ایک
گنہگار اور ظالم و بد دین قوم کا الزام دیکر ملک اسپین سے اس تشدد و جبر کے ساتھ نکالا تھا کہ قریباً
تیس لاکھ بنی آدم لقمۂ اجل بنکر رہ گئے۔

غرض تقریباً دس لاکھ انسان ان مقدس و شائستہ عیسائیوں کے ہاتھ سے انواع و اقسام
کی سختیاں سہہ سہہ کے مارے اور جلائے گئے۔

یہی کیفیت پیرو کی ہوئی یہ ملک جنوبی امریکہ میں بحر الکاہل کے کنارے پر واقع ہے۔ فرنسسلو پزیروفی جو کہ اٹلی کا ایک مجہول النسب شخص تھا محض سونا چاندی کے حصول کی طمع میں ایک بیڑہ جہاز کا لیکر اسکو جلد فتح کر لیا۔ اس نے وہ وہ مظالم توڑے کہ عیاذاً باللہ ہزاروں بندگان خدا ملک چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے۔ جہاں وہ فاقون سے مر گئے اور بیشمار قتل کرا دیئے گئے۔ تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ ایسی ہولناک بے رحمی دنیا میں نہیں ہوئی۔

تسمانیہ کے قدیم باشندے صرف یوروپ والوں کی ہمسائگی کے باعث الیسو فنا ہو گئے کہ ایک متنفس بھی انکی نسل کا باقی نہیں رہا۔

آسٹریلیا کے قدیم اور اصلی باشندے بدبختی سے نہیں بلکہ محض انگریزی فاتحین کی آن بان سے اندرون ملک میں ایسے غائب ہوئے کہ بالکل معدوم ہو کر رہ گئے اب شاذ و نادر ہی پہاڑوں میں کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

ملک کانگو میں بلجیمیوں نے وہاں کے باشندوں کو صرف دو تین تولہ ربڑ کی چوری کے الزام پر اسقدر ستایا اتنے ظلم توڑے کہ لاکھوں آدمی مر گئے ہزاروں ولایتی کتوں سے پھڑوا ڈالے گئے۔ اور ہر طرف خون کی ندیاں بہا دیں۔ اور وہ کچھ کیا جس کی نظیر چنگیزی اور بخت نصر کی بیدادگریوں میں بھی نہ مل سکیگی!



اب وہ اصحاب جنکا محمودی اور عالمگیری مظالم کے فرضی افسانوں سے پارہ چڑھ جاتا ہے اور جو کہ مسلم سلاطین کے سلوک کو جابرانہ اور انکی طرز حکومت کو وحشیانہ کہا کرتے ہیں سوچیں اور غور کریں کہ دنیا کے فاتحین کس رنگ میں مفتوحین کے ساتھ کیا کیا برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ اور پھر دیکھیں کہ مسلمانوں نے مفتوحین کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا ہے۔

اہل ہند سے ہرگز وہ برتاؤ نہیں ہوا جو ہر فاتح کے ہاتھ سے مفتوح پر ہوتا رہا ہے۔ آریوں نے ایران سے آکر غیر آریوں کے ساتھ کیا کیا۔ بدھ مذہب کس طرح شنکر اچارجی مساعی سے تباہ کیا گیا یونانیوں نے ایران کی کیا گت بنائی۔ ایران نے شام عراق عرب میں کیا ساوک کیا بخت نصر نے ایک لاکھ قتل کرکے بھی چین نہ پایا ہانی بال نے اٹلی و سسلی میں کیا کیا بربادیاں نہیں

رومیوں نے قرطاجیوں کو تباہ کر کے شہر کارتھیج میں کونسا گھر سلامت چھوڑا ؟ خسرو نے ہرقل کو کیسا کیسا ذلیل کیا فرڈی نینڈ نے اسپین میں کوئی توحید پرست رہنے دیا ؟

کیا ستر ہزار بنی آدم کا خون بیت المقدس کی مسجد کے صحن میں نہیں بہایا گیا اور مسلم آبادی کی تباہی میں کوئی دقیقہ باقی رکھا گیا کیا اسپین سسلی ہنگری میں مذہب غلبے کے بعد کوئی اسلامی متنفس بھی زندگی کا سانس لے سکا کیا بلقان و ایران میں کوئی بیرحمی و ویرانی باقی رہگئی۔ کیا مشہد مقدس پر دن دہاڑے گولہ باری نہوئی تھی۔ کیا شام کریمیا سسلی میں کوئی مسجد بھی اغیار کی دستبرد سے بچ سکی۔ کیا ریمز کے گرجا اور لورین و اسکندریہ کے کتب خانے آگ سے مصئون رہگئے۔

عبرت کی آنکھیں کھولو حقیقت کی نظر سے دیکھو اگر مسلم شہریار ظالم ہوتے۔ یا دیگر فاتحین ہی کی طرح سلوک روا رکھتے تو کیا اسپین و سسلی کی طرح آج ہندوستان و شام اور اناطولیہ میں صدیوں کی حکمرانی کے بعد بھی ہنود و عیسائی آبادی کا غلبہ کثیر ہوتا تو ایک طرف ایک فرد واحد بھی مفتوح قوم کے مذہب کا باقی رہ سکتا۔ اور کریمیا۔ ہنگری اور بلقان کی طرح رعایائے ہند وغیرہ بھی کوئی حیثیت و رتبہ رکھتی ہوتی۔ مسلمانوں نے چھ سو سات سو برس انتہائی جاہ و جلال سے ڈنکہ حکومت بجایا! لیکن ابتک اصلی باشندوں کی بجنسہ کثرت ہے۔ اناطولیہ شام اور بلقان میں ترک صدیوں سے حکمرانی کر رہے ہیں۔ مگر آج بھی تعدادی غلبہ عیسائیوں کو حاصل ہے اور بہر صورت اسلامی تعداد غیر اسلامی تعداد سے کہیں زیادہ کم ہے۔ بخلاف اسکے جس ملک میں مسلمانوں کے بعد دیگر خود ساختہ مہذب قومیں غالب ہوئیں۔ مفتوحین چن چنکر مٹا دئے گئے۔ ڈھونڈ ڈھونڈھکر تباہ کئے گئے نہ انکی عمارات بچسکیں نہ انکے معابد! نہ انکی دولت رہی نہ انکی وقعت!!

تاریخ کے صفحات اس دعوے کے بہترین شواہد ہیں۔

عالمگیر محمود۔ سکندر لودی کے معائب بیان کرنے اور حالات کو روایت کی کسوٹی پر کسنے کے وقت ہندو صاحب یہ نکتہ نگاہ میں رکھیں کہ آجکل کی دنیا سے معیار سلوک نہ تلاش کریں بلکہ اسی زمانہ کی دنیا سے مقابلہ کریں۔ مثلاً جناب سکندر لودی کی ایک دو باتوں پر اعتراض کیا جائے تو یہ بھی دیکھیں کہ ... [illegible]

حقیقت پر بھی نظر ڈالیں کہ اسپین کے جنوبی ساحل پر اسوقت کتنے جہاز بے گناہ مسلمانوں سے بھرے ہوئے ڈبوئے جارہے تھے۔ نیز یہ کہ سکندر لودی نے کیا کیا رفاہ عام کے کام کئے۔

ادھر ہنود کو فارسی پڑھاکر دفاتر سپرد کئے جاتے ہیں لیکن اُدھر مغرب میں مسلمانوں کے علوم بحر اوقیانوس کی تہ میں غرق ہوتے ہیں اِس طرف ایک بنیا ہیمو مدار المہام سلطنت بنایا جاتا ہے اسطرف اسپین میں مفتوحین مسلمان جابجا قتل کئے جارہے ہیں۔

قطب الدین ایبک سے لیکر اورنگ زیب کے زمانے تک اگر ہندوؤں پر ظلم ہوتا رہا اور بقول مارسڈن۔ الفنسٹن اور لتھبرج اور شیو پرشاد صاحبان یہ زمانہ ہندوؤں کے لئے ایک سخت مصیبت و کلفت کا زمانہ تھا تو ذرا ۱۱۹۳ء سے ۱۷۰۷ء تک کے دیگر شاہانِ عالم کے برتاؤ پر غور کر لیا جائے کہ کونسا تاجدار اُسوقت اس زمانے کے مسلم فرمانرواؤں سے بہتر اور اعلےٰ سلوک رعایا سے کرتا تھا اور کس ملک میں ہندوستان سے زیادہ امن و انتظام تھا۔ اور اگر مسلم سلاطین ظالم و بے رحم تھے تو باشندگانِ ہند اُس عہد کے کس بادشاہ کو کس اسلامی بادشاہ پر ترجیح دیکر اُسکی رعیت ہونا گوارا کر سکتے تھے۔ کیا فرڈیننڈ کی رعایا بننے پر رضامند ہوجاتے جسنے اسپین کے مفتوحین میں آگ لگادی یا ہلاکو خانیوں کے سایہ میں بسنا گوارا کر لیتے جنھوں نے سیلاب بنکر ایشیائی تمدن و امن پر پانی پھیر دیا اٹلی کے پوپ اعظم کی حکومت پسند کرتے جہاں علم و عقل کی تباہی اب تک نفریں بھیج رہی ہے یہ بھی نہ سہی خود اپنے سلوک پر بھی غور کرو کہ شنکر اچارج کے پیرو بادشاہوں نے بودھیوں کے ساتھ کس درجہ بیرحمانہ سلوک کیا اور کس طرح بودھوں کی ہزار ہا سال سے زیادہ کی عظیم الشان سطوت و عظمت مٹاکر صفحہ ہند سے اُنکو قریبًا نابود کر دیا راجہ جیپال نے کیوں مسلمانوں کو چھیڑا اور ستایا تھا۔ آخر میں سکھوں اور مرہٹوں نے مفتوحین کے ساتھ کونسی کسر رکھی۔

غرض یہ کہ فاتح اقوام مفتوح کے ساتھ دنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایک خاص نوعیت کا سلوک کرتی آئی ہیں۔ اگر اس نگارستان میں کوئی اصلی خوبی و عمدگی رکھتی ہوگی تو وہ اسلامی تصویر ہے اور اس کلیہ سے مستثنےٰ نظر آئینگے تو صرف مسلمان جنھوں نے ہمیشہ مفتوحین کو برابر سمجھا اور کوئی بڑے سے بڑا امتیاز سردار اور عہدہ نہیں رہا جسپر مسلمانوں نے دیا ہوں

اور ہنود کو مقرر نہ کیا ہو دنیا میں اس رواداری کی نظیر سوائے مسلمانوں کے اگر کوئی پیش کر سکتا ہے تو کرے اور اگر اُس نے ایسا سلوک کیا ہو تو ثبوت دے۔

یورپ کے زبردست اور اعلیٰ ترین فلاسفر اور مصنف موسیو گستاؤ لی بان نے صاف بیانی سے اسکا اعتراف کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے "کہ تاریخ کو عربوں سے زیادہ عادل اور رحیم فاتح کا حال نہیں معلوم ہے۔

لیکن دنیا میں کوتاہ نظروں نے ہمیشہ مسلمانوں کو تعصب کی عینک سے دیکھا۔ حسد کے شعلوں سے دلوں کو جلایا۔ دیکھو دیکھو ابھی اس تمدن و وحشت کے نظارے اور باقی ہیں۔

بیچارہ ایک نامور عیسائی فاضل جو مونیار کے وحدت الوجود کا قائل تھا وہ محض اسی جرم پہ سنہ ۱۶۰۰ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ اب دیکھئے کُرویت زمین کا مسئلہ ابتداء خلافت بنی عباس میں مسلمانوں نے قبول کیا تھا جس سے اعلیٰ علمی شغف اور بہترین رہبری اسلام کے باعث کوئی شورش پیدا نہوئی مگر عیسائی دنیا میں یہ بحث چھڑتے ہی ایک قیامت برپا ہوگئی۔ اولو العزم کولمبس نے جب نئی دنیا کی جستجو کا قصد کیا تو تمام پادری اسکے مخالف ہوگئے۔ کولمبس کا قول ہے کہ "ابن رشد کی کتابوں نے مجھے اس عزم و ارادہ پہ آمادہ کیا تھا۔

نامور گلیلو کو اس لئے پادریوں نے سزا دی کہ علم ہیئت میں جو جدید انکشافات اُس نے کئے تھے وہ اُنکے نزدیک مذہب عیسوی کے خلاف تھے جیچک کا ٹیکہ ترکوں نے ایجاد کیا تھا۔ لیکن سنہ ۱۷۲۱ء میں جب میری مونٹاگو نے اس علاج کی یورپ میں ترویج چاہی تو پادریوں نے پوری قوت سے مخالفت کی۔ اسی طرح امریکہ میں سُن کرنے کی ایک اعلیٰ دوا ایجاد ہوئی جو دردِ زہ کے وقت عورتوں کو استعمال کرائی جاتی تھی۔ اول اول جب یورپ میں یہ دوا آئی تو پادریوں کے ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ کتاب پیدائش میں بیان کیا گیا ہے کہ ولادت کے وقت کی تکلیف عورتوں کے لئے بطور سزا کے ہے اور خدا نے ان پر لعنت کی ہے اس بنا پر پادریوں نے کہا کہ اس دوا کے استعمال کرنے والی عورتوں کو اس سزا و لعنت سے بچانا چاہتے ہیں جو خدا نے اُن کے لئے مقرر کی ہے۔ اسلئے اسکا استعمال ناجائز ہے اور اسپر نہایت شور و غضب ہا۔

انگلستان کی لانگ پارلیمنٹ کے زمانے میں ایک عورت محض اس الزام پر کہ وہ اپنی جرابیں

اتار کر اور صابون میں گھولکر طوفان برپا کر رہی ہو۔ پہلے اُسکے معصوم بچے کو اور پھر اُسے سولی پر چڑھا دیا اور اسی سال ایک خاص قانون عورتوں کو پکڑ پکڑ کر جلانے اور مار ڈالنے کا نافذ ہوا۔ سترھویں صدی کے وسط میں غریب عورتیں محض سحر جاننے کی وجہ سے بیہودہ عقیدہ پر ہزاروں کی تعداد میں سولی چڑھائی گئیں اور اس مہذبانہ طریق سے اقرار جرم لیا جاتا رہا کہ جنسے جرأت انکار کی ناخنوں میں کیلیں ٹھکوا دی گئیں۔ گرم لوہے کے داغ دیئے گئے اور طرح طرح سے ستایا گیا اور پھر لطف یہ کہ یہ بیدرد لوگ عفو و ترحم سے قطعاً بیگانہ ہوتے تھے اقرار جرم کا نتیجہ ہمیشہ مرنا اور زندہ آگ میں جلنا نکلا کبھی کسی کی خطا معاف نہیں ہوئی۔

غرض مصرع — شب آخر گشتہ افسانہ از افسانہ می خیزد

کبھی فرصت میں ثابت کیا جائیگا کہ دنیا کی تہذیب پر اسلام نے کیا کیا احسان کئے اور یورپ نے اس تصویر میں کیسے ہوش سے رنگ بھرا۔

ناظرین دعوے کرنے کو کوئی کتنے ہی کرے مگر اخلاق و سچی تہذیب کی کسوٹی پر کسی قوم کا کھرا اکھرا ناکارہ دار و دارہ کو حکندن کا مضمون ہے۔

اسلامی فاتحوں کے وہ کریمانہ اخلاق تھے جسکو یاد کرکے زمانہ برسوں سے حیرت کے آنسو رو رہا ہے۔

جس متشکک ہستی کو شک ہو وہ اس قیامت خیز یورپی جنگ میں ہی اخلاق کے اُن نہ مٹنے والے نقوش کو دیکھلے جو ٹرکی نے برطانوی اور فرانسیسی قیدیوں کے ساتھ نقیہ المثال سلوک روا رکھکے قائم کر دیئے ہیں اور جنکی طویل رپورٹیں ۱۹۱۴ء سے اسوقت تک متواتر وقتاً فوقتاً سٹیٹسمین اور ٹائمس میں چھپتی رہتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہر قوم کی ایک فطرت ہوتی ہے اور اسلام کی فطرت عدل و رحم ہے جو زمانہ کی ہزار دست درازیوں کے باوجود بھی نہیں مٹ سکتی اور دنیا کے اُس صبر آزما اور تہذیب شکن اوقات میں بھی جسکو جنگ کہتے ہیں اور جبکہ جذبات غضب و انتقام پوری قوت و ہیبت سے بھڑکتے ہوتے ہیں جن سے متمدن اقوام کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور جوش جنگی میں وہ وہ افعال کر گذرتے ہیں جنکا دھبہ تاریخ کے دامن سے کبھی

نہیں چھوٹتا۔ اسی لئے اسوقت میں دشمنوں کے قیدیوں کے ساتھ سلوک اور پھر وا بھی زمانۂ زوال میں ایک ایسا نقش پا ہے جو قافلہ کی کل حالت کی آئینہ برداری کر رہا ہے۔

مگر وائے نصیب کہ ہم آج زمانے کی بھیڑ دں میں رہکر اپنی اہلیت کو بھولے جا رہے ہیں کاش کوئی ایسا شیر پیدا ہو جو بیک آواز چہرہ حقیقت بے نقاب کر دے ؎

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

شریف احمد مرادآبادی سہروی

انتظار

شب فراق کے پردۂ تاریک میں میرا وہ دلچسپ انتظار جسکا ہر لمحہ مسرت خیز تھا۔ اور جس کی مسرت و لذت احساس کا اندازہ میں اور صرف میں ہی کر سکا۔ ایک عجیب دپرکیف انتظار اور لذت شیریں تھی انتظار کے بسیط فرش پر میری منتظر نگاہ اشک کے سُرخ موتی ٹانک رہی تھی اور میرا شہباز تخئیل تاریکیٔ شب کے حجاب خفا میں ایک صورت طلسمی کے نظارہ کے لئے پرواز کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی انتظار کے پہلو میں نہیں معلوم وہ کیا شئے تھی جو مجھے بیتاب کر رہی تھی۔

صبح امید کی شعاع خورشید نے آغوش زمین پر اپنے زریں بازو پھیلائے اور جہاں افروز حسن کا لمعہ برق چمکا۔ میں نے اُس پیکر حسن کو دیکھا، جسکا مجھے انتظار تھا لیکن نہ دیکھ سکا رعب حسن نے نگاہوں کو ماند کر دیا اور نظر اُٹھا کر دیکھنے کی قوت جاتی رہی۔

آہ! مایوسی کا یہ ایک تاریک لمحہ تھا جو خوش نصیبی سے نصیب ہے لیکن آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔

حافظ امام الدین اکبرآباد

شہاب کی سرگذشت

(بسلسلۂ گذشتہ)

(۶)

حسن جس کو اپنی شراب کے رسا ہونیکا علم اسوقت ہوتا ہے جب اس میں یہ خواہش پیدا ہو کہ وہ راتوں کو سونے نہ دیا جائے، گذرنے والی رات اُس کی مست بیداریوں کے فسانوں کی دولت کو لئے ہوئے رخصت ہو چکی ہے اور حسن جو ابھی سویا ہے، سو رہا ہے۔

جوانی جس کو اپنی سرشاریوں کا ہوش صرف اس طرح ہوتا ہے کہ ہر شام اُسے انتظار نظر آنے لگے اور ہر رات آغوش بیدار ختم ہو جانے والی رات اُس کے نشہ کی کیفیات سے مالا مال ہو کر جا چکی ہے اور جوانی جو انگڑائیاں لیتے لیتے ابھی تکیہ سے سہارا لیکر کچھ غافل سی ہو گئی ہے ہنوز بے خبر ہے۔ اس لئے اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ بمبئی کچھ نہیں ہے مگر کاشانۂ حسن و جوانی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت سارا شہر اک گہرے سکوت خواب میں ملفوف ہے اور اُسی وقت جبکہ دنیا کی ہر چیز جاگ اُٹھنا چاہتی ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ بیدار ہو جانے کے لئے بیتاب ہے بمبئی سو رہا ہے اور سوکے رہنے کیلئے ذرا تھکیا!

اللہ کی اُس مخلوق کا ذکر نہیں جو بمبئی میں صرف اس لئے آباد ہے کہ اپنی محنت، اپنی رات دن کی مشقت و جانکاہی کا عوض صرف اسقدر چاہے کہ دولت اُسے ٹھکرا نہ دے۔ جاہ و امارت جس سے تمام ثمرات محن حاصل کر لینے کے بعد صرف ایک خشک سی نان جویں دیکر اُسے ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لینے سے انکار نہ کر دے، قیمتی موٹروں اور زرق برق گاڑیوں میں متمکن رہنے والا حسن اُس کی عرق آلود پیشانی کے نتائج سعی سے اپنی حسین گردن کے لئے موتیوں کا ایک خوشنما ہار مہیا کر لینے کے بعد صرف اس بات کی اجازت دیدے کہ وہ اپنی شبانہ روز مشین کی طرح حرکت کرنے والی زندگی کو اُس کے لئے وقف کر دے۔ ہاں ایسی مخلوق، بمبئی کے اُس حصۂ آبادی کا ذکر نہیں ہے کہ اُن کی زندگی تو صرف ایک دن ہے اور اُنکی حیات یکسر انتظار و اضطراب۔ مگر بمبئی کی آبادی کا وہ عنصر عظیم جس نے رات کو دن بنا لیا حالانکہ اللہ نے اُس کو رات ہی بنایا تھا جس نے دن کو رات کر لیا حالانکہ خدا نے اُسکو دن ہی بنایا تھا۔ ہاں یہ آبادی جس کی ہر رات دن سے زیادہ روشن صدہا شبابیں غیر معصوم بیداریوں کی پیش کرتی ہے، جن کی رات کا ہر لمحہ۔ ایک اخلاق شکن کہانی، ایک دشمن

تہذیب فتر معنی، ایک عدوئے انسانیت داستان وحشت و درندگی ہی ہنوز محو خواب ہی اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے عیش و تفریح کی خستگی، وہ خستگی جو ہمیشہ ایسے دل کھول کر آزادی و بے باکی کے ساتھ لہو و لعب میں پڑ جانے والے دماغ پر مستولی ہو جاتی ہے وکب تک دور ہوگی۔ اور اُس کی آنکھ گھڑی کے کس گھنٹہ کی آواز سے کھلے گی۔

محمود رات کو تھیٹر سے واپس آنے کے بعد غافل ہو کر سو گیا۔ لیکن شہاب جو کبھی سونے کا معمولی وقت گذر جانے کے بعد نہیں سوتا تھا جاگتا رہا۔ اپنے کمرہ میں دیر تک کرسی پر دراز ہو کر رات کے واقعات تماشہ کی کیفیات وہاں کے کوائف و حالات پر غور کرتا رہا اور طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل محمود کے لئے ایک تحریر میز پر رکھکر کہ

"۸ بجے تک ساحل چرچ گیٹ پر انتظار کرونگا"

باہر نکل کھڑا ہوا۔

شہاب فطرۃً مظاہر قدرت سے نہایت گہری دلچسپی لینے والا دل رکھتا تھا، وہ صبح کی پُر سکون کیفیات اور شام کے رنگین مناظر کو دیکھ کر گھنٹوں ان میں مستغرق رہتا اور پھر اُس وقت دنیا کی کسی چیز کی اسکو پروا نہ ہوتی۔ یوں تو وہ فطرۃً حد درجہ بے پروا تھا لیکن ایسے اوقات میں تو استغنا اُس کے ہر ہر انداز سے اور بے نیازی اُسکی ہر ہر نگاہ سے ٹپکنے لگتی تھی۔ ساحل پر ایک سکون مطلق طاری ہے۔ صبح کی سپیدی ہر ہر چیز کو شگفتگی میں تبدیل کرتی ہوئی سیلاب کی طرح بڑھتی جا رہی ہے اور سمندر کی اونچی اونچی لہریں باقاعدہ وقفوں کے ساتھ شور کرتی ہوئی آتی ہیں اور ساحل سے ٹکرا کر پانی کی ایک وسیع چادر پھیلاتی ہوئی فنا ہوتی جاتی ہیں۔ شہاب پتھروں پر ایک کروٹ سے لیٹا ہوا سر کو ہات پر بلند کئے ہوئے دیکھ رہا ہی۔ اُس کے چہرہ سے، جس کو اس وقت تبسم زا کہہ سکتے ہیں ایک ایسا اطمینان پیدا ہی جس کو دیکھکر اگر سمجھا جائے کہ شاید یہی وہ سکون ہے جس کے لئے سمندر کی موجیں بیتاب نظر آتی ہیں تو غالباً نا روا نہ ہوگا۔

روشنی اچھی طرح پھیل گئی تھی اور آفتاب اپنے دامن کی دولت زر چاروں طرف بکھیرتا ہوا نمودار ہو ہی رہا تھا کہ محمود بھی آ گیا اور آتے ہی شہاب سے پوچھا کہ:۔

"تم نے مجھے کیوں نہ جگا لیا۔ بڑے خود غرض ہو۔"

شہاب: "تم بھی ایسے ہی ہو، تم نے مجھے کیوں نہ سلا لیا؟"

محمود: "مجھے معلوم تھا کہ تم اب نہ سوؤگے"

شہاب "میں بھی جانتا تھا کہ تم ابھی نہ جاگو گے"

محمود "مگر تمہارا یہ خیال غلط نکلا۔ دیکھو میں جاگ اٹھا کہ نہیں؟"

شہاب "ہاں اسوقت جب میں بھی سو سکتا ہوں"

محمود "شہاب، تم اس وقت مجھے بہت مسرور نظر آتے ہو۔ ایک بات کہتا ہوں، اک التجا کرتا ہوں اگر مان جاؤ۔ دیکھو انکار نہ کرنا۔ رد نہ کر دینا"

شہاب "میں ہر وقت مسرور رہتا ہوں۔ یہ بات دوسری ہے کہ تمھیں یا کسی کو ایسا نظر نہ آؤں لیکن اگر میری مسرت تمھارے اندر کوئی ایسی جسارت پیدا کر سکتی ہے کہ کوئی بات خوف و احتراز کی ایسے وقت میں کہ سکو تو میں اسکو تمھاری کمزوری سمجھونگا اور اپنے لئے اک مصیبت۔ اس لئے میری مسرت سے تو یہ فائدہ نہ اٹھاؤ۔ یوں مجھ سے کہو۔ میں کبھی انکار نہ کرونگا اگر اقرار کر سکا۔ میں اُسے رد نہ کرونگا۔ اگر منظور کر سکا"

محمود۔ (شہاب کی اس گفتگو سے کچھ مضمحل ہو کر) خیر جانے دو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم اس وقت سنجیدگی سے میری گفتگو سنوگے اور جواب دوگے، لیکن معلوم ہوا کہ اب تم سے کبھی اس کی توقع کرنا سخت حماقت ہے"

شہاب "یقیناً حماقت ہے اگر میری سنجیدگی سے کوئی شخص ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے۔ رہا یہ کہ تم کیا کہتے اور میں کیا جواب دیتا، سو اس کے متعلق میں بغیر اس کے کہ تمھارے سوال کو ظاہر کروں جواب دیئے دیتا ہوں کہ تمھیں اختیار ہے۔ میں تو ابھی اور قیام کرونگا بس وقت کی گاڑی سے جانے کا قصد ہے؟"

محمود "میں جسقدر تمھاری برہمی سے ڈرتا ہوں۔ اسیقدر رحم کو برہم پاتا ہوں تمھاری اس نوع کی اجازت اگر میرے لئے کافی ہوتی تو بغیر حصول اذن بھی میں جا سکتا تھا"

شہاب "محمود تم نے اس سے قبل بھی کتنی بار میری برہمی کا ذکر کیا لیکن میں خاموش رہا۔ آج تم نے پھر وہی الزام مجھ پر رکھا۔ دیکھو آج ہمیشہ کے لئے تمکو جان لینا چاہیئے کہ میں کبھی کسی سے برہم نہیں ہو سکتا کیونکہ میرے نزدیک اس سے زیادہ لغو حرکت اور کوئی نہیں۔ وہ شخص جو کبھی کسی سے کوئی توقع قائم نہ کرے۔ اُس کو عالم کی کوئی چیز ناخوش نہیں کر سکتی۔ ناخوشی نام ہے صرف آرزو کی مایوسی کا، تمنا کے اضمحلال کا اور تمھیں معلوم ہے کہ میں اس معاملہ میں کسقدر آزاد ہوں۔ ساری کائنات میں وہ چیز جس کے ساتھ میں اپنی تمناؤں کو وابستہ کر سکتا ہوں صرف فطرت ہے اور مجھے یقین ہے کہ

فطرت کبھی میری آرزوؤں کو پامال نہ کریگی۔ کیونکہ میں اُس سے اُس کی عوض وہ دولت طلب کرتا ہوں جو وہ عالم کی تمام مخلوق کو روز ہر وقت لٹاتی رہتی ہے۔ اگر آفتاب اپنے طلوع و غروب کی رنگین ادائیاں بدل سکتا ہے، اگر تارے فضائے آسمان میں راتوں کو جگمگانا فراموش کر سکتے ہیں، اگر ہلال اپنی کشتی سیمین کو آسمان کے وسیع و بے پایان نیل میں چھوڑ دینا بھول سکتا ہے، اگر چاند کی رات ہی کو ہو سکتی ہے دن کو نہیں، اگر دھوپ دن ہی میں نظر آ سکتی ہے رات کے وقت نہیں، تو تم مطمئن رہو کہ مجھے کوئی غم نہیں اور نہ میرے مغموم ہونے کی کوئی صورت، لیکن اگر فطرت اپنے اس نظام کو درہم برہم کر سکتی ہے، تو یقیناً اُسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ مجھے بھی تباہ و برباد، برہم و مایوس کرے لیکن جب تک فطرت کا یہ نظام قایم ہے اور اُس کے اصول برقرار، میں ایک بادشاہ ہوں اور بادشاہ بھی وہ جس کی حکومت غیر محدود ہے اور جس کی سلطنت کی وسعت بے پایاں۔ میں دیکھتا ہوں کہ سمندر کی بے پایاں موجیں ہیں اور موج کی بے تابیاں سمندر، اگر تم سے ممکن ہے تو میرے نظارہ سے اس لطف کو چھین لو۔ میں سنتا ہوں کہ لہروں کی روانی ایک زبان ہے اور اس زبان کی روانی ایک طوفانِ تکلم، اگر تم سے ہو سکتا ہے تو میرے سامعہ کو اس ذوق سے محروم کر دو اور پھر مجھ پر برہمی کا الزام رکھو ورنہ یونہی جب تک بہار و خزاں، شگفتگی و فسردگی، صبح و شام، سیاہ و سپید دو الگ الگ چیزیں ہیں، میں دنیا اور دنیا والوں کے لئے بیکار ہوں نہ اُنکی ایذا کا مجھ پر کوئی اثر ہو سکتا ہے اور نہ اُن کے لطف و رحمت کا۔ اس میں کلام نہیں کہ سارے عالم میں محمود صرف تمھارا ہی ایک وجود ایسا ہے جس کی نسبت مجھے علم ہے کہ میری زندگی میں اُس کا ایک حصہ شامل ہے اور میں اُس سے متاثر بھی ہوتا ہوں۔ لیکن شاید تمھیں خبر نہ ہوگی کہ میں تمھیں بھی مناظر فطرت کا ایک خوش سواد منظر سمجھتا ہوں اور اسی لئے تمھارا ہر تغیر میرے اوپر وہی اثر کرتا ہے جو مناظر فطرت کا تغیر۔ جس وقت تم میرے پاس نہیں ہوتے، میں مضمحل ہو جاتا ہوں بالکل اسی طرح جیسے چاند کے ڈوب جانے کے بعد، جب تم افسردہ ہوتے ہو تو مجھ پر خاص اثر ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک شگفتہ گلاب کو گرم ہوا کے جھونکے سے کمھلاتے ہوئے دیکھ کر۔ میں تمھارے نکاح سے اختلاف کرتا ہوں بالکل اسی طرح جیسے میرے سامنے کوئی شخص ایک نازک درخت کی شاخیں یا اُسکا تنہ کاٹنے لگے اور میں آسبر رہنی نہ ہوں۔ آج تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ "نہ جاؤں" میں کہتا ہوں "جاؤ" کیونکہ مجھے یقین ہوتا جاتا ہے کہ فطرت نے اس درخت میں گھن لگا دیا ہے اور شاید یہ اپنی زندگی پوری کر چکا ہے پھر اگر چند دن قبل یوں ہی قطع کیے [illegible] حیات ختم کر دو [illegible] تو کیا [illegible] ایک [illegible] سے چھین لیا اور

اس لئے اپنے دل کا ایک کونہ اس تباہی پر ماتم کرنے کے لئے ہمیشہ کے لئے ویران کر لونگا۔ اور کبھی کبھی جب مجھے ضرورت ہوگی تو تم کو یاد کرکے نہیں بلکہ صرف دل کی اُس ویرانی کو دیکھ دیکھ کر رو لیا کرونگا۔ رہا یہ کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں، سو ایسا ظلم تو مجھ پر روا نہ رکھو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ باغ سے روز ہزار ہا پھول توڑ کر اسے جدا کرکے خاک میں ملا دیئے جاتے ہیں لیکن یہ کیا لازم ہے کہ میں انسان کی اس بدقسمت زندگی کو خود اپنی آنکھ سے دیکھوں بھی۔ یقین کرو کہ میں نے بزمی کے ساتھ تمہیں جانے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن۔ ہاں اس میں میری یاس، میری حسرت، ضرور شامل ہے۔ سو اسکا دور کرنا تمہارے امکان میں نہیں اس لئے مجھے تم سے کوئی شکایت بھی نہیں۔ محمود اب میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بھول جاؤں قبل اسکے کہ سکینہ کی آغوش میں پہونچکر تم دنیا کے ساتھ مجھے بھی بھول جانے پر مجبور ہو جاؤ۔ اور یہ بھی صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ تم کو میرا بھلا دینا آسان ہو جائے اور اس طرح چند دن تو تم نکاح کے بعد وہ خیال پر مصنوعی نقش و نگار کی کیفیات فانیہ سے لطف اُٹھالو۔ آہ کاش دنیا حسن و قبح اور حق و باطل میں تمیز کر سکتی اور سمجھتی کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہے"۔

محمود جو دیر سے آبدیدہ ہو رہا تھا۔ اب ضبط نہ کر سکا۔ اور بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ شہاب خاموش ہو گیا اور خاموشی سے اُسکے رونے کو دیکھتا رہا۔ شہاب کے لئے محمود کی بڑی بڑی آنکھوں کا ایسے موٹے موٹے آنسوؤں سے رونا کوئی نئی بات نہ تھی، وہ اس سے قبل بارہا محمود کی حسین آنکھوں کو رلا چکا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا ہمیشہ محمود سے یہی التجا کی کہ "دیکھو مجھے دنیا میں جینے دو۔ مجھے تمہارے رونے سے اس لئے تکلیف نہیں ہوتی کہ تم رو رہے ہو بلکہ میں تو اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ دیکھنے کے بعد تمہاری آنکھیں کس سے دیکھی جائینگی اور انکی اس کیفیت استرحام کے سامنے کیونکر کوئی اپنے عزم وارادہ کو قائم رکھ سکیگا"۔ لیکن اسوقت محمود روتا رہا اور شہاب دیکھتا رہا یہانتک کہ محمود نے سُرخ سرخ افسردہ آنکھیں اپنی ٹھوڑی کو ہتھیلی پر ٹکاکر شہاب کی طرف سے ذرا گردن موڑ کر خاموش ہو گیا اور پورا آدھ گھنٹہ اسی حال میں گذر گیا۔ نہ شہاب سے محمود نے کوئی گفتگو کی اور نہ محمود سے شہاب نے۔ اب دھوپ تیز ہو گئی تھی اور بمبئی کا ہنگامہ شروع ہو چلا تھا۔ اس لئے شہاب اُٹھا اور اسی کے ساتھ محمود بھی اٹھا اور دونوں اپنی فرودگاہ پر پہونچ گئے۔

(۷)

جہاں انکا ایک دوست جو کچھ زمانہ سے بمبئی میں مقیم تھا انتظار کر رہا تھا اور اس لئے وہ سکوت جو

شہاب و محمود پر طاری تھا قائم نہ رہ سکا اور سب سے پہلے محمود ہی کو بولنا پڑا کیونکہ طفیل سے اس کے تعلقات دیرینہ تھے۔ شہاب نے کپڑے اُتارے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر طفیل کا اور اُس کے سراپا کو معہ اُس کے ملبوس کی نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ طفیل محمود کے اُن دوستوں میں سے تھا جو فیشن کے رکھ رکھاؤ کے لئے مشہور تھے۔ حلقۂ احباب میں ہر فرد کو معلوم تھا کہ طفیل سے زیادہ خوش زندگی بسر کرنے والا اور اُس سے زیادہ اپنے اوقات کو لطف و مسرت میں گذار دینے والا اور کوئی نہ تھا۔ اسکا دستورالعمل یہ تھا کہ "ہر شخص صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ پورا کیا جائے اور اسی کا نام زندگی ہے"۔ اسکے ہاں ماضی و مستقبل کا مفہوم کچھ نہ تھا وہ صرف حال کو دیکھتا اور چاہتا کہ ہر ممکن صورت سے اُس کو کام میں لایا جائے اُس کے نزدیک اخلاق صرف اس کا نام تھا کہ کسی کے واسطے دل تو نہ دکھایا جائے لیکن جو کچھ خدمت کسی کی ہو سکے کر دینا چاہیئے۔ بلا لحاظ اس کے کہ یہ ہمدردی میں داخل ہے یا نہیں چنانچہ بعض احباب کا خیال تھا کہ اُسکا ایثار بھی بالکل فیشن کے لحاظ سے تھا اور اُس سے تھوڑی سی نمود و نمائش بھی مقصود تھی۔ بہرحال طفیل عجیب و غریب اصول کا آدمی تھا اور اُسکی مرنجاں مرنج زندگی پر بعض احباب کو رشک بھی تھا۔

طفیل نے جو شب گذشتہ کسی خاص وجہ سے تھیٹر نہ جاسکا تھا سب سے پہلے ہی گفتگو شروع کی اور محمود سے سوال کیا کہ ——— "اختر کی نسبت تمہارا کیا خیال رہا؟"

محمود۔ "مجھ غریب سے کیا پوچھتے ہو (شہاب کی طرف اشارہ کرکے) ان سے پوچھو"

طفیل۔ "ہاں شہاب صاحب آپ فرمائیے"

شہاب۔ "مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسے اصول کا آدمی یہ سوال کرے۔ میں اگر آپکی جگہ ہوتا اور اختر کی نسبت وہ خیال قایم کر لیتا جو آپنے قایم کیا ہے تو میں کبھی کسی سے سوال نہ کرتا اس ڈر سے کہ مبادا وہ اختلاف کرے یا اس میں کوئی نقص بتائے اور پھر خواہ مخواہ ناگوار معلوم ہو۔ آپ انھیں اچھا سمجھتے ہیں یقیناً وہ اچھی ہونگی۔ میں کیا عرض کر سکتا ہوں جب کہ میں نے ابھی انھیں صرف ایک بار دیکھا ہے"

طفیل۔ "اس وقت تک جو رائے آپ نے اُنکے فن ایکٹنگ کے متعلق قایم کی ہے۔ میں وہی سننا چاہتا ہوں۔ یقیناً میرا خیال اُن کی نسبت بہت اچھا ہے اور اسقدر یقین کے ساتھ کہ اگر آپ نہایت آزادی سے کام لیکر کوئی بُری رائے ظاہر کرینگے۔ تو بھی مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا"

شہاب۔ "پھر آپکا پوچھنا اور میرا جواب دینا دونو بیکار ہیں۔ کیوں آپ مجھے ایسی گفتگو کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس سے متاثر ہونے کے لئے آپ آمادہ نہیں۔ شاید آپ کو یقین ہے کہ میں بھی آپکا ہم آہنگ ہونگا۔ اور اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ اپنی پسندیدگی و انتخاب کی داد مجھ سے حاصل کریں۔

اگر آپکی خوشی اسی میں ہو تو لیجئے میں بھی کہے دیتا ہوں کہ واقعی مس اختر ویسی ہی ہیں جیسی آپکے ذہن میں مرتسم ہیں اور اُنکا نظیر اس وقت دنیائے اسٹیج میں کوئی نہیں ہے۔ اور نہ شاید زمانہ آیندہ کوئی مثال ایسی پیش کر سکے"

طفیل:۔ "کیا میں آپکی اس رائے کا حوالہ اپنی گفتگو میں کسی دوسری جگہ دے سکتا ہوں"؟

شہاب:۔ "ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ رائے تو صرف آپکے خوش کرنے کے لئے تھی اور آزادانہ رائے تو میری محفوظ ہے جسے میں صرف اس شخص کے سامنے پیش کرونگا جو اُسکو وقیع سمجھے اور اگر معقول ہو تو تسلیم کرے یہ نہیں کہ پہلے ہی ارادہ کر لیا جائے کہ کسی طرح اثر کو قبول نہ کیا جائیگا۔

طفیل:۔ "اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں میں آپکی رائے کو وقیع بھی سمجھونگا۔ اور اسکے اثر کو بھی قبول کرونگا اگر قبول کر سکا۔"

شہاب:۔ (مسکرا کر) طفیل صاحب آپکے اس سوال کا جواب دینا میرے لئے نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ مجھے ابھی تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ دنیا کس ایکٹنگ کو بہتر سمجھتی ہے اور کس کو ناقص اور اسکے متعلق جو تنقید کیا ہو۔ ایکٹنگ نام ہے اظہار جذبات کا جوارح ظاہری کے ذریعہ سے اور چونکہ ہر شخص کے تاثرات ایک ہی چیز کی نسبت مختلف ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ جذبات میں بھی اختلاف ہوگا۔ اور جذبات کا اختلاف ایکٹنگ کا اختلاف ہے۔ اس لئے بالکل ممکن ہے کہ جن حرکات کو میں پسند کرتا ہوں آپ پسند نہ کریں۔ اور جنکو میں بُرا سمجھتا ہوں وہ آپ کے نزدیک اچھے ہوں۔ ایکٹنگ حقیقتاً ممنوعی ہے اور مصوری کچھ نہیں ہے۔ مگر حسن کے جزئیات کو ظاہر کر دینا۔ خواہ وہ حسن کسی قبیح ترین منظر و صورت سے کیوں نہ متعلق ہو۔ پھر جب نفس حسن کے متعلق مذاق انسانی میں باہم اسقدر تخالف ہو تو تصویر حسن کے متعلق کیوں نہ ہوگا۔۔ رہا یہ امر کہ میں نے کیا خیال قائم کیا ہے یعنے اپنے جذبات و مذاق کے لحاظ سے مس اختر کے ایکٹنگ کو کیا سمجھتا ہوں۔ سو مجھے افسوس ہے کہ کل کی ایکٹنگ اُن کی تمام تر طبیعت کے خلاف تھی۔ اور بدقسمتی سے میں اس کا قائل نہیں کہ ایک عورت واقعی کسی مرد کے لئے اسقدر بیتابی دکھا سکتی ہے جیسا کل مس اختر نے اپنے فرضی و مصنوعی عاشق کے لئے دکھایا اور اسی لئے میرے نزدیک اُن کے سارے حرکات غیر فطری اور خلاف حقیقت تھے"

طفیل:۔ "اس سے بحث نہیں کہ ایک عورت مرد کے لئے اس درجہ بیقرار و مضطر ہو سکتی ہے یا نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیجئے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور پھر بتائیے کہ مس اختر نے کیا کیا۔ ہم حقیقت سے تو بحث کرتے ہی نہیں کیونکہ تھیٹر میں جو کچھ ہے نقل ہے۔ اس لئے محض فن کے لحاظ سے تنقید کرنی

چاہیے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مس اختر نے جس مرد کے ساتھ تماشہ کے اندر اپنے جذبات کا اظہار کیا وہ اسکا محبوب نہ تھا۔ اور اس لیئے یوں بھی جو کچھ ہوا خلاف حقیقت تھا۔ مگر ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں، ہمکو تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ جن جذبات کی نمایش کی گئی وہ ایک ایسی مثال فرض کر لینے کی صورت میں فطرۃً ظاہر ہوتے ہیں یا نہیں اور ہمارا فرض یہیں ختم ہو جاتا ہے۔"

شہاب۔ "اگر آپ مجھے ایک خلاف حقیقت امر تسلیم کر لینے پر مجبور کرتے ہیں تو بیشک میری رائے یہ ہوگی کہ مس اختر کی ایکٹنگ غیر فطری ایکٹنگ کا ایک بہترین نمونہ تھی اور نہ صرف یہ بلکہ اگر حقیقتاً کوئی عورت کسی مرد کی طرف سے اپنے اندر ان جذبات کی پرورش کرے تو وہ قابل پرستش ہے۔"

محمود شہاب کے یہ الفاظ سنکر چونکہ پڑا۔ کیونکہ شہاب کے منھ سے یہ بالکل نئی بات اس نے سنی تھی اور اس لئے وہ دفعتہً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور شہاب سے کہنے لگا "شہاب کیا سچ کہتے ہو کیا تمھارا یہ سچا خیال ہے کہ اگر کوئی عورت ایسی نظر آئے تو اسکی قدر کرنا چاہیئے اس کی پرستش کرنی چاہیے؟"

شہاب۔ یقیناً لیکن ایسی عورت کا دستیاب ہونا میرے نزدیک محال ہے اور فطرت کے مقصود کے خلاف اور عورت کیا مرد بھی صحیح معنی میں کسی عورت سے الفت و محبت نہیں کرسکتا اور اس لئے مجھے یقین ہے کہ اسوقت یا اس سے قبل جب کبھی کوئی واقعہ حسن و عشق پیش آیا ہے وہ صرف لٹریچر کے لئے مواد تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اس پر اعتماد کر کے مرد یا عورت کے جذبات کی ساتکا تو جیہ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ مرد عورت کو چاہتا ہے اور اس میں ایک خاص غرض شامل ہوتی ہے۔ عورت مرد سے محبت کرتی ہے۔ اس میں اسکا ایک مقصود ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسپر غور نہیں کرتے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ غرض جسقدر قوی ہوتی ہے اسیقدر زیادہ سخت فریب ہمکو حقیقی عشق و محبت کا دیا جاتا ہے اور ہم اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہانتک کہ آج صرف خود غرضی کا نام محبت ہے اور عشق کا مفہوم کچھ نہیں ہے مگر حد درجہ کی مدعا پرستی۔ سوال یہ ہے کہ مرد و عورت شباب سے گذر جانے کے بعد اس جذبہ محبت کو کیوں کھو دیتے ہیں۔ اسوقت ان میں محبت کا مادہ کہاں چلا جاتا ہے؟ کیا سبب ہے کہ صرف جوانی کے زمانہ میں محبت کی جاتی ہے؟ اسکی وجہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ جوانی میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے وہ باہم ایک دوسرے کو کھینچ کر ملا دینا چاہتا ہے اور ہم صرف اسلئے کہ ہمارے اخلاق کے طرف سے کوئی برا خیال نہ قائم کیا جائے اس کشش کو کشش محبت، جذب صدق و خلوص اور خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ حالانکہ وہاں نہ محبت ہے نہ صدق و خلوص بلکہ صرف تولید خون کی زیادتی ہے۔ جو

بجائے بجائے پھرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عشق و محبت سے زیادہ مکمل مثال خود غرضی کی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ صرف ایک ذلیل خواہش پوری کرنے کے لئے انسان اپنی زندگی تک وقف کر دیتا ہے اور تا وقتیکہ وہ حاصل نہ ہو جائے چین نہیں لیتا۔ میرے خیال میں تو یورپ کے مادئین و ماہرین فلسفہ و سائنس کو اس استقلال و استحکام سے درس لینا چاہیئے کہ وہ بھی بڑے سے بڑے مسائل کی تحقیق و تفتیش میں اسقدر ایثار، ایسی جانکاہی، اسدرجہ شغف و انہماک سے کام نہیں لیتے جیسا ایشیا اور علی الخصوص ہندوستان کا عاشق کام لیتا ہے۔"

طفیل۔ "اچھا تو اس نالائق محبت کا وجود کہیں ہے بھی یا یونہی اسکی دھوم مچی ہوئی ہے؟"

شہاب۔ "میرے نزدیک محبت کا وجود کہیں نہیں ہے اور اگر ہے تو ایسی جگہ جہاں ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں۔"

طفیل۔ "وہ جگہ ملک کے کس گوشہ میں ہے، کس جغرافیہ میں تلاش کرنے سے پتہ چلیگا؟"

شہاب۔ (ذرا چیں بہ جبیں ہو کر) کیا آپ کو بتا دوں؟ معاف کیجئے، جو نہ صرف محبت کی توہین بلکہ اسکو غارت و برباد کر دینے کی اہلیت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ آپ حضرات کے سامنے تو اس مقدس جگہ کا نام لینا بھی کفر ہے۔ کیونکہ آج اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو کل شروع ہونے سے پہلے ہی آپ اس جگہ کی خصوصیت کو خراب کر دیں اور اسکی حرمت کو داغدار۔ طفیل صاحب، خدا کے لئے آپ کبھی محبت کی جستجو نہ کیجئیگا۔" آپ کی زندگی جو گذر رہی ہے خوب ہے۔ آپ کیوں اپنے اس لطف کو ہاتھ سے دینگے جو ہمیشہ محبت سے جدا رہنے ہی کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ بلبل کی طرح صرف گلاب بلکہ صرف پھول کے عالم پر سر دھننا کیا کوئی معقول بات ہے۔ آج کل اُسے حماقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ زندگی تو بھونرے کی ہے۔ کبھی اس کلی پر بیٹھ گیا اور رس چوس لیا کبھی اُس کلی سے لپٹ گیا اور اسکی شیرینی سے لطف اُٹھا لیا۔ جب جی چاہا اُڑ گیا۔ اور پھر جب سوجھ آئی اپنی سیہ مستی سے غریب کلی کو آکر پھر آزار پہونچانے لگا۔ بھونرے کا یہی کام ہے کہ جسوقت وہ باغ میں بلبل کا نالہ و شیون سنتے تو اسپر ہنسے اور بلبل کی یہی شان ہے کہ وہ یہ سب کچھ دیکھے اور اپنے غم میں آخر کار سوکھ کر کانٹا ہو جائے پھر اگر بھونرا آشیانۂ بلبل کا پتہ پوچھے تو میں کیا بتاؤں۔ طفیل صاحب اب میں آپ سے کیا کہوں محبت کا نشیمن کہاں ہے اور آپ اُس کو کہاں دیکھ سکتے ہیں۔ اس ذکر کو جانے دیجئے آپ کیوں اپنی وضع کی توہین کرتے ہیں۔ کہاں یہ کار ہائے دنیائی اور کہاں خیال محبت آزمائی معاف فرمائیے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپنے کبھی دعوائے محبت نہیں کیا اور نہ ایسا خیال کبھی قائم کیا۔ اس لئے میں نے عرض کر دیا۔

ورنہ شاید اس درجہ گستاخ آپ کی جناب میں نہ ہوتا۔ میں تو دراصل خواہش کرتا تھا کہ کسی وقت آپ سے پوچھونگا کہ آپکی زندگی کی مسرتوں کا کیا راز ہے اور میں بہت پسند کرتا ہوں ایسے شخص کو جو آپکی طرح زندگی بسر کرے۔ کیونکہ میرے نزدیک دنیا کی لذتوں کو چھوڑ دینے سے زیادہ مشکل اُنکا حاصل کرنا ہے اور وہ شخص جو اس میں کامیاب ہو جائے یقیناً مرد ہے اور اس قابل ہے کہ یہ آجکل کے محبت کرنے والے، عورت کی ہر ہر تحریر پر مٹ جانے والے اُس سے درس لیں اور معلوم کریں کہ جس چیز کو وہ لذت سمجھکر حاصل کرنا چاہتے ہیں سخت عذاب ہے اور جس چیز کو وہ پانی سمجھکر اپنی تشنگی رفع کرنا چاہتے ہیں صرف سراب ہے۔ (باقی آیندہ)

نیاز فتحپوری۔

غزل

حضرت مصطفٰے ملیح آبادی

عادت تجھے چھٹی تمھاری تو کی — کیوں پھر وہی چھیڑ گفتگو کی
کیوں تنگ ہے اے جنوں گریباں — پھانسی بن جائیگا گلو کی
نظروں سے گرا کے صورت اشک — مٹی مری تمنے آبرو کی
مٹ مٹ گئی نقش پا کی صورت — یوں کو بکو تری جستجو کی
سنتے ہیں بہت نکل چلی ہے — نکہت تری زلف مشکبو کی
مانگا ہے تمھیں سے بوسۂ رخ — ہے بات تمھارے روبرو کی
مجھسے تو نہ کھینچ تصویر یار — تصویر ہوں تیری آرزو کی
توبہ زاہد نماز کیسی — نیت ہی نہیں ابھی وضو کی
دیکھی جو تمھاری تیغ عریاں — کٹ کٹ گئیں مشکلیں گلو کی
جس روز سے منھ لگی خموشی — مٹی ہے خراب گفتگو کی
اللہ رے تمھارے گرم فقرے — لَو ہیں مری شمع آرزو کی

یہ مصطفٰے تیری پارسائی
صورت نہیں دیکھتا سبو کی

تلاشِ عشق

(بسلسلۂ گذشتہ)

مولوی فریدالدین مرحوم کے پیر و مرشد اُنکے انتقال کے وقت لکھنؤ میں نہ تھے۔ انکا خط آیا تھا جسمیں اظہار ملال کے بعد یہ خوشخبری بھی دی کہ میں جلد لکھنؤ آؤنگا۔
حسینہ کو انکے آنیکا سخت انتظار تھا۔ اُسے خیال ہوا کہ یہ ایک بزرگ شخص ہیں شاید انہیں سے کچھ ہدایت اُسے ملے اور قلبی اور دماغی بےچینی میں سکون ہو۔ انتقال کے تین ماہ بعد جناب موصوف کا لکھنؤ میں ورود ہوا۔ حسینہ کو فوراً اطلاع دی گئی۔ اُس نے خدمت میں حاضر ہونیکی خواہش کی لیکن جواب یہ دیا گیا کہ وہ خود تشریف لائینگے۔ حسینہ کو تین بار انتظار کرنا پڑا حضرت مولانا صاحب تشریف نہ لائے۔ چوتھی بار جب آنے کی خبر ہوئی تو اُس نے کہا کہ میں انتظار نہ کرونگی جسدن اور جسوقت اُنکا دل چاہے تشریف لائیں۔ بارے خیر اس مرتبہ تشریف لے ہی آئے۔ گھر میں آنے کی شان یہ تھی کہ دہنے بائیں دو آدمی بغلوں میں ہاتھ دیئے ہوئے تھے پیر کی ایڑی زمین سے اونچی تھی صرف پنجے لگتے تھے۔ اس طرح کشاں کشاں لائے گئے اور صدر مقام پر جہاں غالیچہ انکے واسطے بچھا تھا رکھدئے گئے۔ مولانا صاحب نے بیٹھکر پہلے رسم تعزیت ادا کی اُسکے بعد انسانی زندگی کی بےثباتی کے متعلق گفتگو شروع کی۔ اپنے ہر جملہ کی تقویت احادیث اور بزرگانِ دین کے اقوال سے کرتے جاتے تھے۔ مولانا صاحب کا سلسلۂ کلام قطع کرکے حسینہ نے سادگی سے یہ دریافت کیا کہ آپ لوگ اپنے مریدوں کو کیا بتایا کرتے ہیں۔

مولانا صاحب (تحقیرانہ تبسم کے ساتھ) جو ہمیں آتا ہے وہ انکو بتاتے ہیں۔

حسینہ۔ یہی تو میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپکو کیا آتا ہے۔

مولانا صاحب۔ یہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ فی الفور بتا دیجائیں اگر آپکو شوق ہے اور اس جانب رجحان ہے تو آپکو بتائی جائینگی اور انشاءاللہ جلد آپ حاصل کرلینگی۔

حسینہ۔ مولانا صاحب! میں کچھ حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپکو کیا آتا ہے اور آپ کیا بتلاتے ہیں۔

مولانا صاحب۔ اسی سوال کا تو میں نے جواب دیا۔ جب آپ حاصل کرنا نہیں چاہتیں تو آپکو کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کہ مجھے کیا آتا ہے اور کیا میں بتاتا ہوں۔

حسینہ۔ میں اپنا مطلب شاید ٹھیک ادا نہ کرسکی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ جیسے میں کسی درزن کے پاس سیکھنے بیٹھوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے سینا پرونا آتا ہے یہی اس سے سیکھوں گی یا کسی مولوی کے پاس پڑھنے بیٹھوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں زبان یا فلاں علم پڑھنے بیٹھی ہوں جو اسکو آتا ہے۔ اسی طرح جو کوئی آپکے پاس جائے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ کیا سیکھنے گیا ہے اور آپ کیا سکھائینگے

مولانا صاحب۔ آپ ان باتوں سے اپنا دماغ پریشان نہ کیجئے۔ آپکو جو کچھ بتایا جائے وہ کیجئے اگر راہ راست پر آنا منظور ہے اور ہدایت پانی آپکو خواہش ہے۔

حسینہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ میں یا کوئی شخص جو آپکے پاس جائے گمراہی میں مبتلا ہے۔ یہ تو بڑی دقت کی بات ہے کہ یہ معلوم نہو کہ گمراہی کیا ہے اور راہ راست کونسی ہے۔

مولانا صاحب۔ جو شخص مٹھاس کے مزہ سے ناآشنا ہو اُسے کسطرح بتایا جائے کہ اس کا مزہ کیسا ہے۔

حسینہ۔ مگر یہ تو ناممکن ہے کہ کسی مزہ سے آشنا نہو۔ کیونکہ ایسی حالت میں تو اُسے مٹھاس چکھا کے بھی مٹھاس کا مزہ نہیں بتایا جا سکتا گمراہی کو جب گمراہی جانیگا تب ہی تو راہ راست کا طالب ہوگا۔

مولانا صاحب کو حسینہ کی بے ادبی بہت ناپسند ہوئی یہ نہ تھا کہ وہ اُس سے بحث کرنے میں قاصر رہے اور قائل ہوگئے اگر وہ چاہتے تو سلسلۂ بحث گھنٹوں اور دنوں جاری رہتا لیکن اس قسم کی بحث کرنا خاصکر ایک عورت سے اپنی شان کے خلاف سمجھے۔

حسینہ بھی مولانا صاحب سے بہت بد دل ہوئی تھی۔ دراصل وہ حقیقت سے پوچھو تو اُن سے برگشتہ خاطر ہوگئی تھی جب وہ لڑکی تھی وہ آدمیوں کے کان الفاظ پر آشنا تھے۔ اسکے دل کی تسلی اور تسکین خاطر ان الفاظ اور فقروں سے نہیں ہوتی تھی جو استعمال میں آتے تھے اپنے معنی کھو بیٹھے ہیں۔ یعنی راہ راست۔ گمراہی۔ ہدایت وغیرہ انکو اپنے دل میں وہ شان تقدس کی تھی جس طرح بزرگی اور تقدس کا اظہار شکل و صورت میں بارعب ریش و دستار ہوتا ہے اسی طرح وہ خیال کرتی تھی کہ یہ الفاظ بھی صرف لوازمات تقدس میں سے ہیں۔ بذات خود کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بہت الفاظ ایسے ہی ہیں۔

میں ایسے ہیں جو پرانے کھنڈروں کی طرح اپنے مکین کا نشان بتاتے ہیں لیکن اب کوئی مکین نہیں رکھتے کبھی جذبات اور خیالات کے مولد تھے اور اب ایسے ویران ہیں کہ جذبات و خیالات کا ان سے پیدا ہونا تو درکنار قوت سامعہ تک کو اُنسے جنبش نہیں ہوتی مثلاً گمراہی کیسی روح فرسا انسانی مصیبتوں کے مجموعہ کا نام تھا کہ جنکو دور کرنے کے لئے خدا کو پیغمبروں کے بھیجنے یا خود مستقل اوتار آنیکی ضرورت ہوئی اب یہ کیا معنی رکھتا ہے؟ ایک خفیف غفلت جسکی تلافی صرف یہ کہہ دینے سے ہوسکتی ہے "کہ ہمیں یہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔ الفاظ بھی پلتے بڑھتے ہیں۔ اور ضعیف ہوکر فنا ہوجاتے ہیں انکی جوانی کے زمانہ میں انمیں مادہ حیات و حرارت کثرت سے ہوتا ہے یعنی وفور معانی سے ابلے پڑتے ہیں۔ وہی بڈھے ہوکر بزرگی تو اختیار کرلیتے ہیں لیکن حس و حرکت ان میں کم ہوجاتی ہے

حسینہ کا دل ان الفاظ کو ڈھونڈھتا تھا جو قلب میں اتر جائیں اور اسکو مشتعل کردیں۔ مگر الفاظ میں حرارت اُس قلب سے آتی ہے جسمیں سے وہ نکلے ہیں اگر اُس قلب میں بھی حرارت نہیں ہے تو الفاظ میں مشتعل کرنے کی قوت کہاں سے آئیگی۔

ایک دن رات کو حسینہ اپنے کوٹھے پر لیٹی تھی۔ گرمی کا زمانہ تھا مگر ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی پھولوں کی ہمیشہ سے شوقین تھی تکیہ کے دونوں جانب ہار رکھے تھے خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں کوٹھی سے تھوڑے فاصلہ پر کسی بزرگ کا مزار تھا۔ وہاں قوالی ہورہی تھی قوال خوش آواز تھے۔ گانیکا لطف گھٹا ہوا تھا بیچ بیچ میں [illegible] کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہوا کا رخ چونکہ کوٹھی کے جانب تھا اس لئے آواز بالکل صاف آتی تھی۔ تین چار غزلیں بے دردی سے گاکر قوال نے یہ غزل کھماچ میں شروع کی۔

اگر بینم شبے آں ماہ رو آں سلطان خوباں را — سرم بر پائے او آرم فدا سازم دل و جاں را

اس شعر پر ایسا جوش و خروش پیدا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کا بس نہیں چلتا نہیں تو زمیں سے اونچے ہوکر [illegible] رقص کرنے لگے۔ اسکا اثر حسینہ پر یہ ہوا کہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھی اور تھوڑی دیر بعد ٹھہر ٹھہر کر [illegible] لگی۔ جب قوالی ختم ہوئی تو حسینہ نے اس شعر کے اثر کا مقابلہ اس گفتگو کے اثر سے کیا۔ جو مولانا صاحب مدظلہ کی تھی دل میں کہنے لگی۔ ان الفاظ میں روح ہے مولانا کے الفاظ مردہ تھے"

حسینہ نے صبح کو ڈھونڈھکر دریافت کیا کہ رات کو قوالی کہاں ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ کسی غیر مشہور بزرگ کا مزار ہے وہاں پہلے جمعرات کو سالانہ عرس اور قوالی ہوتی تھی۔ یہ بھی لوگوں نے کہا کہ کسی

کو بشارت ہوئی تھی۔ اُسنے یہ سب سامان کیا۔ حسینہ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ یہ دریافت کرو کہ زور و شور سے حال کسکو آرہا تھا۔ اُنھوں نے آکر کہا کہ اسی محلہ میں ایک شخص آکر رہے ہیں۔ ریلوے میں نوکر ہیں اُنکو حال آیا تھا۔ عرس بھی اُنھوں ہی نے کیا تھا۔ مشتاق احمد انکا نام تبایا گیا حسینہ کو اُن سے ملنے کی خدا جانے کیوں خواہش پیدا ہوئی دل میں سوچی ایک غیر مرد سے بلا کسی وجہ خاص کے ملنا نہایت درجہ معیوب بات ہے۔ یہ سوال پیدا ہوا کہ مولوی عبدالغفور اور مولانا صاحب سے میں کیوں ملی اور کیوں انسے باتیں کیں مگر اسکا جواب بھی ساتھ ہی ساتھ ملگیا کہ اُنسے اور اُن لوگوں سے ملنے میں فرق ہے اُنھوں نے ہدایت اور رہنمائی اپنا پیشہ کر لیا ہے۔ اُنسے ملنے سے دنیا کو بُرا خیال نہیں ہوسکتا۔ بہرحال اس خواہش کو اپنے دل سے دور کیا لیکن اس مزار پر جانے کو اسکا بے اختیار دل چاہنے لگا۔ ایک روز گاڑی پر وہاں گئی اور آدھ گھنٹہ تک وہاں ٹھہری رہی۔ کھلا ہوا مقام تھا۔ دلکو فرحت ہوئی۔ قبر بہت پُرانی معلوم ہوتی تھی۔ بالکل ہی بے مرمت تھی اسکے دل میں یہ آیا کہ اسکی مرمت کرادوں۔ چنانچہ دوسرے ہی روز اسکی مرمت حسینہ نے شروع کرادی پانچ سات روز میں تیار ہوگئی۔ مشتاق احمد اُس زمانہ میں باہر گئے ہوئے تھے۔ باہر سے واپس آکر ایک روز مزار پر جو آئے تو دیکھا کہ مزار نہایت خوشنما بنگیا متعجب ہوکر لوگوں سے پوچھا تو سب نے بیان کیا۔ مشتاق احمد مولوی فخرالدین سے واقف نہ تھے انھیں لکھنؤ آئے دو ہی تین مہینے ہوئے تھے یہ سنکر چپ ہوگئے سمجھے کہ خدا کی بندی کوئی ہوگی۔ مگر انھیں خوشی بہت ہوئی۔

(۱۶)

بلقیس نے جب حسینہ کی یہ حالت دیکھی یعنی اپنی موجودہ زندگی سے بے اطمینانی اور برگشتہ خاطری تو اُسے خیال ہوا کہ حسینہ کا نکاح ہوجانا چاہیئے اور اس مرتبہ خوب سوچ سمجھ کے نکاح کیا جائے تاکہ میاں بیوی کے مزاجوں میں ناموافقت نہو حسینہ کی والدہ کو بلقیس نے بلا بھیجا اور اُن سے یہ تذکرہ کیا۔ بلقیس نے کہا "آپ جانتی ہیں کس قسم کی اُنھوں نے طبیعت پائی ہے۔ اگر کوئی قابل اعتراض بات نہ بھی کی تب بھی مجھے انکی طبیعت اور مزاج سے اطمینان نہیں ہے مذہب کی طرف جب توجہ ہوئی اسی میں نئی نئی باتیں بیٹھی نکالا کرتی ہیں۔ انکے دل کو کسی طرح قرار نہیں ہے۔ اسی کے پیچھے اگر سڑن ہوجائیں تو مجھے تعجب نہوگا"

حسینہ کی والدہ۔ یہ تو سچ ہے مگر تم نے خود انسے بھی ذکر کیا یا نہیں۔ اب کنواری بالی تو ہیں نہیں کہ ہم لوگ جسکے ساتھ چاہیں نکاح کردیں۔ انکی مرضی بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔ دوسری بات

یہ کہ اُنکے باپ کی شاید خوشی نہو گی - آجتک خاندان میں کسی عورت کا دوسرا نکاح نہیں ہوا ہو -
بلقیس - آپ ان باتوں کو جانے دیجئے - خانداں میں کہنے وہ باتیں کیں جو حسینہ نے کی ہیں - میں نے
ابھی حسینہ سے ذکر نہیں کیا ہے - انکی طبیعت کا اندازہ بیشک ضروری ہو - آپ سے میں نے صرف
اسوجہ سے کہا کہ آپ اور میں شریک ہو کر انکو آمادہ کروں - انکی طبیعت والی آدمی کا تنہا بے پناہ رہنا
مناسب نہیں ہو -

حسینہ کی والدہ بیٹی کہتی تو تم بہت عقل کی بات ہو - کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو خاندان بھر کی ناک کٹے -
بلقیس - خیر اسکا تو مجھے زیادہ ڈر نہیں ہے - مجھے زیادہ تر خدشہ انکی صحت کے متعلق ہو
حسینہ کی والدہ - بہن کبھی سوچا کرتی ہیں - خدا اور رسول کی بھی محبت موقعہ موقعہ سے اچھی معلوم ہوتی ہے
اس میں بھی میرے خیال میں بے موقعگی اچھی نہیں ہوتی - چاہے مجھے تم بیدین کہو میرا تو ہمیشہ سے
یہی قول ہو کہ بے موقعہ کوئی بات اچھی نہیں - آخر سوچنا ساچنا کیا ہے روزہ نماز کر دیے یہی دینداری
ہے زیادہ سے زیادہ کسی کی مرید ہو جائے - پیر صاحب جو کچھ وظیفہ وغیرہ بتا دیں وہ پڑھا کرو - ہماری
لڑکی کی تو ہر بات دنیا سے نرالی ہے دینداری بھی انوکھی ہے - کسی طرح اُنکے قلب کو اطمینان نہیں
مولانا صاحب کی باتیں دلکو نہیں لگتیں مولوی عبد الغفور صاحب کے وعظ سے انھیں گھن آتی ہے
انکے واسطے مولوی اور پیر بھی آسمان سے اُتر کے آئیں -
بلقیس - انھیں باتوں کو تو غور کرکے میری رائے ہوئی کہ نکاح ہو جائے تو بہت بہتر -
حسینہ کی والدہ - مگر بیوی اسبات پر تو ذرا غور کرو - خاندان کا کوئی مرد تو ان سے شادی کریگا
نہیں - تم اپنے خاندان کی حالت اچھی طرح جانتی ہو - اب رہا غیر خاندان کا کوئی آدمی تو ہمارے
بھائی بند غیر خاندان کے آدمی کے ساتھ شادی کو بھاگ جانے اور نکل جانے سے بہتر نہ سمجھیں گے -
بلقیس - یہ تو خیر کہیے نہیں کہ خاندان کا کوئی مرد شادی نہ کریگا کرینگے اور سر ٹیک کے کرینگے - روپیہ
ایسی چیز ہے کہ بڑے بڑے ہیکڑی والے سر جھک جائیں - بلکہ بات یہ ہے کہ خاندانی مرد کوئی اس
قابل نہیں ہے کہ اسکے ساتھ شادی ہو -

بلقیس دو ایک روز بعد حسینہ کے پاس گئی - دل میں جو خیال تھا حسینہ سے بھی کہا حسینہ ہنسنے
لگی اور کہا " دل تو بیشک میرا چاہتا ہے کہ کسی کے ساتھ نکاح کروں مگر مجھسے کون شادی کریگا - صورت
بگوڑی پھر طبیعت کی مزاج پریوں کا "
بلقیس : - کرینکو کیا ہوا اسکے طرز آدمی دنیا میں ہیں -

حسینہ۔ سیکڑوں نہیں لاکھوں ہونگے۔ لیکن دو شرطیں لگانے کے بعد ایک شخص بھی مشکل سے ملیگا
بلقیس۔ کونسی شرطیں۔
حسینہ۔ اول یہ کہ میرے دل کے موافق ہو دوسرے یہ کہ وہ مجھے بھی چاہے۔ بلقیس میں سچ سچ کہوں میرا کیا دل چاہتا ہے؟ میرا دل یہ چاہتا ہے کوئی شخص ایسا ہو کہ میں اسپر جان و دل سے فریفتہ ہوں اور وہ مجھے شدت سے چاہے۔ پھر خوب عیش ہو۔
بلقیس۔ ابھی تک تمھارے دل سے عیش کا خیال نہیں گیا۔
حسینہ۔ یہ خیال کیونکر جائیگا۔ اگر مجھے عیش نصیب ہو جاتا تو ممکن ہے کہ جاتا رہتا
بلقیس۔ مگر نہیں عیش دنیا میں کسی کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔
حسینہ۔ مگر اسکی تلاش ہر شخص کرتا ہے میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ عیش کی تلاش خدا کی تلاش ہے۔ یکسوئی اور تسکین خاطر کا نام عیش ہے۔ جسکو یہ حاصل ہو گئی سمجھو خدا مل گیا۔
بلقیس۔ تم تو اب اچھی خاصی صوفی ہو گئی ہو اور نئے طرح کی صوفی۔ اب تمھارے واسطے جو شوہر ڈھونڈھا جائے اسمیں علاوہ اور صفتوں کے ایک صفت یہ ہو کہ صوفی ہو۔
حسینہ۔ ہاں میں نے تم سے ذکر نہیں کیا۔ ایک روز رات کو محلہ میں قوالی ہو رہی تھی لوگوں کو حال آرہے تھے۔ مجھے بھی بہت لطف آیا۔ اب مجھے قوالی بہت پسند ہے۔
بلقیس۔ میں نے سنا ہے کہ آپنے کوئی مزار بنوایا ہے اور وہاں اکثر جایا کرتی ہیں۔
حسینہ یہیں قریب تو ہے سہ پہر کو تم بھی چلنا۔
بلقیس۔ میں نہیں جاتی۔ مجھے دلچسپی قبروں سے نہیں ہے۔
حسینہ۔ اچھا تم نے قوالی کبھی سنی ہے۔
بلقیس۔ ہاں ڈومنیاں حقانی چنیدیں گایا نہیں کرتی ہیں۔ یہ ہی تو قوالی ہے۔
حسینہ۔ میں نے بھی پاس سے کبھی نہیں سنی اس دن رات کو میں کیا بتاؤں کیا لطف آیا ہے۔ اچھا میں اپنے گھر میں قوالی کروں تو کوئی ہرج تو نہیں ہے۔
بلقیس۔ ہرج کیا ہے۔ مگر باہر بیٹھ کے سننے والا کون ہوگا۔ اسکے علاوہ یہ ڈر ہے کہ تم کو حال نہ آجائے اور محفل میں کودنے نہ لگو۔
حسینہ۔ تم نے مجھے بالکل ہی سڑن سمجھ لیا ہے۔ ناچنے کودنے کیوں لگی۔ مگر یہ سچ ہے باہر بیٹھ کے سننے والا کون ہوگا۔

بلقیس۔ کسی بزرگ کے فاتحہ کے نام سے محفل کردو

حسینہ۔ خوب یاد آیا۔ اسکی کیا ضرورت ہے۔ رجب کا مہینہ ہے رجبی کیوں نکروں۔

بلقیس۔ رجبی میں قوالی ہوتی ہے۔

حسینہ۔ الہ آباد میں بڑی دھوم سے رجبی ہوا کرتی ہے وہاں قوالی بھی سنا ہے کہ ہوا کرتی ہے اگر نہ بھی ہوتی ہو اور ہم کریں تو کیا بری بات ہے۔

بلقیس۔ نہیں کچھ نہیں۔

حسینہ۔ تو اب طے ہے۔ میں سامان کرنا شروع کردوں۔

بلقیس۔ ہاں ہاں کیا ہرج ہے۔ کہاں کی بات کہاں پہنچ گئی شادی کے بارے میں تمنے کیا کہا اسکے متعلق میں کوشش شروع کردوں۔

حسینہ۔ کوشش تم نکرو۔ تم ڈرو نہیں میں کسی کے ساتھ نکل نہ بھاگوں گی۔ اگر کوئی شخص اتفاق سے ایسا ہوا جسکے ساتھ رہنا مجھے پسند ہوا تو خود میں تم سے کہہ دوں گی میں چھوٹی لڑکی نہیں ہوں کہ میری نسبت ڈھونڈھی جائے۔

بلقیس۔ نہیں یہ ڈر مجھے نہیں ہے بلکہ ڈر مجھے تمھاری صحت کا ہے سچ پوچھو تو یہ تصوف وغیرہ کی جو باتیں کرتی ہو اسکو دیوانگی کا میں پہلا زینہ سمجھتی ہوں۔

حسینہ۔ خوب ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ کیونکہ ہسٹری اپنے کو سٹری نہیں جانتا یہ بھی ممکن ہے کہ تم لوگوں کی جو حالت ہے وہ دیوانگی اور کم عقلی کی ہو۔ (باقی آیندہ) عبدالوالی بی اے

غزل

بہت گو فاصلہ تحت الثریٰ سے لامکاں تک ہے
مگر پھر اس سے کم ہی جو ترے دل سے زباں تک ہے

طلب کر جلد یہ جنس گرامی جان دیکر بھی
متاع درد ارزاں رونق بازار جاں تک ہے

ہوا کیا خضر کو حاصل حیات جاودانی سے
بقا ہے زندگی گر کاوش سود و زیاں تک ہے

کہیں محو تماشا ہو کے منزل سے نہ رہ جانا
تجھے فرصت سیر بانگ کوس کارواں تک ہے

غم صیاد۔ فکر باغباں ایذائے خار گل
یہ غم بلبل تجھے سب آمد فصل خزاں تک ہے

بجائے لطف ساقی سے نہیں بچکر نکل سکتے
جناب شیخ کا تقوے در پیر مغاں تک ہے

بندھا ہے اپنے در سے عاشق شوریدہ سر کو تو
ترے کوچہ کی آبادی اسی بے خانماں تک ہے

ستم ہے چاند میں جس سنگدل پر جان دیتا ہوں
نہیں کچھ اسکے دل میں میری الفت کا نشاں تک ہے

چاند۔ ایڈیٹر تعلیم گزٹ

بیوفائی

(۱)

عموماً جنس ذکور میں سے ہر فرد۔ دولت۔ ثروت۔ حکومت۔ عزت۔ شہرت اور راحت کا قدرتی طور سے متمنی ہوتا ہے۔ لیکن عورت کی زندگی صرف محبت کے فسانوں کا مجموعہ یا ایک حکایت ہوتی ہے اُسکا دل ایک دنیا ہے جسمیں فطرتی خواہشات اور قدرتی احساسات کا اثر ظہور پذیر ہوتا ہے وہ فطرتاً محبت کی متلاشی ہوتی ہے۔ محبت اگر اسکے لئے بہترین نتائج بہم پہونچاتی ہے تو وہ خوش نصیب ہے ورنہ اکثر محبت کے فطری جذبات اور احساسات اُسکی حیات کی کشتی کو گرداب بلا میں پھنسا دیتے ہیں اور زندگی کو تلخ کر دیتے ہیں اور اس کے لئے تمام کائنات تاریک ہو جاتی ہے۔

ناشگفتہ رہگئی آس و تمنا کی کلی گلشن امید میں باد خزاں ایسی چلی

پتہ پتہ نخل حسرت کا پریشاں ہو گیا

عورت احساسات لطیفہ اور جذبات پاکیزہ کا مرکز ہے۔ اُسکی زندگی نسبتاً زیادہ بے خلل و غش کٹتی ہے۔ اور اس لئے اُسے تخیل کی دنیا میں غواصی کرنے کا زیادہ موقعہ ملتا ہے۔ دن رات وہ ایک ہی خیال میں محو رہسکتی ہے۔ ایک ناکام عورت اکثر خیالات میں غرق رہکر اپنی صحت خراب کر لیتی ہے عورتوں کی زندگی زیادہ تر محدود اور پابند ہوتی ہے۔ اُنکے پریشاں خیالات اُنکے مونس ہیں اور اُنکے مجروح دل غمگسار دوست کا کام دیتے ہیں۔ اُنکے ویراں دلکو اگر ایک تباہ شدہ قلعہ سے مشابہت دیجائے تو کچھ بیجا نہیں جسطرح ایک فاختہ اُس تیر کو جو اُسکے کلیجہ کے پار ہو چکا ہو دبائے بیٹھی رہتی ہے اور اپنی تکلیف کی داستان کسیکو نہیں سناتی۔ اسی طرح ایک پاکباز عورت اپنے درد جگر کو پوشیدہ رکھتی ہے۔ اُسکے زخم خوردہ دل کی حکایت کا پتہ کسیکو نہیں چلتا۔ وہ اپنے روحانی صدمہ کو خود جھیلتی ہے۔

(۲)

دریا خاموشی سے بہ رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی موجیں بنتی ہے اور فنا ہو جاتی ہیں چاروں طرف سبزہ زار میں خوشنما پھول ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ہوا بند ہے۔ ہر طرف سناٹا چھا یا ہوا ہے سامنے والی کوٹھی میں ایک چھوٹا سا کمرہ خوب سجا ہوا ہے۔ ایک مسہری پر مہ جبیں حسینہ لیٹی ہوئی کروٹیں بدل رہی ہے۔ چہرہ تمتما رہا ہے اور ہونٹ خود بخود حرکت کر رہے ہیں ایک کاغذ سامنے

رکھا ہے جسکو بار بار اٹھاتی ہے پڑھتی ہے اور پھر رکھ دیتی ہے۔ پھر پڑھتی ہے اور پھر میز پر رکھ دیتی ہے
ضیائے شمع ابدی۔ میں ایک جاپان کے سوداگر سے چند تجارتی معاملات پر گفتگو کرکے شام تک تمہارے
پاس پہونچ جاؤنگا تم سے ملنے کے لئے دل بیتاب ہے تمہارا جان

یہ چند فقرے ہیں جنکو ہیلن بہت غور سے بار بار پڑھتی تھی سارا دن ہیلن نے انتظار کی تکلیف
میں کاٹا شام ہوئی۔ کمرہ میں ایک کنیز آئی اور شمع جلاکر چلی گئی۔

تاریکی نے دنیا پر قبضہ کرلیا ہے اور رات خاصی گذر گئی ہے لیکن ہیلن کے انتظار کی گھڑیاں ختم
نہیں ہونے پاتیں اسکے دل میں کسی کا خیال چٹکیاں لے رہا ہے اور کسی کی خیالی تصویر اُس کے
اضطراب کو بڑھا رہی ہے۔ خفیف سی آہٹ سے اسکا دل دھڑکنے لگتا ہے اور رگوں کے خون
میں تلاطم ہوجاتا ہے۔ لیکن! نہیں۔ نہیں۔ جسکا اسے اسقدر انتظار ہے وہ بیوفا شاید
آج نہ آسکے گا۔

رات کا زیادہ حصہ گذر گیا ہے۔ تمام کائنات عالم سکوت میں ہے
ہیلن بستر پر تھک کر لیٹ گئی نیند اُچاٹ ہوچکی تھی۔ ایک روح فرسا خیال اسکو مضطرب
کررہا تھا۔ صبح ہونے کے قریب اسکی آنکھ لگ گئی آفتاب کے طلوع ہوتے ہی ہیلن گھبراکر اٹھی آئینہ
اٹھاکر اپنا چہرہ دیکھا۔ چہرہ زرد تھا! دونوں آنکھوں کے چاروں طرف حلقے پڑے ہوئے تھے ہونٹ
خشک اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔ بے اختیار اسکے منھ سے آہ نکلی اور وہ رونے لگی۔

(۳)

رات کے نو بجے ہونگے جان تیزی کے ساتھ گلی سے گذر کر سڑک تک پہونچ گیا اور ایک کرایہ کی
گاڑی میں سوار ہوکر تھیٹر کو روانہ ہوگیا۔ وہائٹ ہوس کے دروازہ پر ایک دوشیزہ لیڈی اسکا انتظار
کررہی تھی۔

جان۔ کیا ابھی کھیل نہیں شروع ہوا؟
لیڈی۔ دس منٹ کے بعد شروع ہوگا۔
جان۔ آپ سے ملنے کے شوق نے مجھے دن بھر بےچین رکھا۔
لیڈی۔ اسی لئے میں جلد یہاں پہونچ گئی۔
جان۔ آج کا موسم کسقدر خوشگوار ہے آسمان پر ستارے عجب لطف دے رہے ہیں۔
لیڈی۔ ہیلن سے آپ کب ملے تھے۔

جان (اضطراب کے ساتھ) ہیلن سے میں نے تو اُدھر کا رخ بھی نہیں کیا جانا تو دوسری بات ہے۔
کچھ دیر بعد تماشہ شروع ہوا۔ دونوں نے نہایت دلچسپی سے تماشہ دیکھا۔ ایکٹروں کی ایکٹنگ سے خوب لطف اُٹھایا۔ لیڈی بار بار جان کو دیکھتی اور خوش ہوتی تھی۔ مکار جان نے بھی خوب روپ بدلا۔ لیڈی سے اسقدر محبت سے باتیں کیں کہ گویا وہ اُسکا عاشق زار ہے لیڈی کو اپنے جذبہ کی کامیابی پر بے انتہا مسرت تھی۔ اُسکو یقین تھا کہ کوئی دنیاوی طاقت جان کو اس سے علیحدہ نہیں کرسکتی۔ اور کوئی انقلاب آپس میں شکر رنجی نہیں پیدا کرسکتا۔ لیڈی کا خون رگوں میں تیزی سے دوڑنے لگا۔ اُسکی ہر جنبش سے خوشی کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ اُسکی دلفریب آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

یہ وہی جان ہے جسکے فراق میں مہ جبیں ہیلن بستر مرگ پر دم توڑ رہی ہے۔ یہ وہی مکار جان ہے جسکی سرد مہری ہیلن کو شمع کے مانند جلا رہی ہے یہ وہی عہد شکن جان ہے جسکے انتظار میں مہ جبیں ہیلن کی آنکھیں سفید ہوگئی ہیں۔ یہ وہی عہد فراموش جان ہے جسکے تصنع آمیز اظہار الفت نے ہیلن کو راتوں بے چین رکھا ہے ہر چند کہ اسوقت لیڈی اپنی قسمت پر ناز کر رہی ہے اور اپنے نصیبہ کو مبارکباد کہہ رہی ہے لیکن اُسے خبر نہیں کہ آیندہ کیا ہوگا۔ ؎

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

جان کا ضمیر اُسکو پریشان کر رہا ہے اُسکو کسی خیال نے مضطرب کر دیا ہے تاہم وہ جذبات بیوفائی کو چھپا رہا ہے اور اپنی محبت بھری نظروں سے لیڈی کو دیکھ رہا ہے۔ لیڈی بھی شوق اور محبت کی نگاہوں سے اس انداز کا جواب دے رہی ہے۔

(۴)

ڈھائی برس گذر گئے دنیا کو انقلاب نے کچھ کا کچھ کر دیا ہے شہر پیرس دیکھنے کی چیز ہے بازاروں کی رونق اور حسینان یورپ کی چہل پہل پیرس کو جنت ارضی بنائے ہوئے ہے۔ لیکن افسوس!!
مہ جبیں ہیلن پیوند خاک ہو چکی ہے۔ جان کی محبت نے اسکا خاتمہ کر دیا۔ دلنواز لیڈی بھی اسکی سرد مہری کو برداشت کرتے کرتے اپنی صحت سے ہاتھ دھو چکی۔ اُسکا وہ چندے آفتاب چندے مہتاب حسن اور ناز و ادا انقلاب کی نذر ہو گئی جان کی مکاریوں نے دنیا کا معمور تو نکو صفحہ دہر سے فنا کر دیا۔ دنیا کی نیرنگیوں سے نہیں معلوم کتنی مہ جبینوں کی اپنی دلچسپیوں مشغولیوں اور راحتوں سے محروم ہونیکا موقعہ دیا ہے اور کتنی زندگیاں رشک و غیرت سے ہوا کی نذر ہو گئی و بربادی کی ہیں لیکن آہ میں تو تاثر کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے کہ مہ جبیں ہیلن اور دلنواز لیڈی بھی دونوں ...

فطرت و تربیت

دنیا کی ہر ذی روح ہستی کے دماغ میں فطری خصوصیات تا دم مرگ جلوہ نما رہتی ہیں اور نسیم تربیت کے جھونکے ان جواہر ریزوں کی درخشانی کو گل نہیں کر سکتے۔ مچھلیوں کے نوزائیدہ بچوں کو فطرت ہی غواص بنا کر بھیجتی ہے چڑیوں کے انڈوں پر مناظر قدرت کی دلفریب رنگینیاں نقاش ازل ہی کرتا ہے۔ شتر کے بچے کے دماغی ذرات صحرائے لق و دق کی وسعت رکھتے ہیں اور شیر کے بچے کا دماغ گوشت و خون کی ہولناک تصاویر کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان کا وجود رازہائے سربستہ کی ایک بولتی تصویر ہے اسکے قوائے دماغی کا شمار اور ہر ایک قوت کی ماہیت پر عبور کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکنات سے ہے۔ لہذا انسان کے بچہ کے دماغی ذرات میں بیشمار فطری قنادیل پرتو فگن رہتے ہیں جنکا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ والدین کے متعدی امراض کا اثر بچہ پر مرتب ہوتا ہے نطفے کی تولید خون سے ہوتی ہے اور امراض کی سمیت کو خون قبول کرتا ہے یا یوں کہیے کہ خون کی سمیت امراض کی شکل میں آشکارا ہو جایا کرتی ہے شراب یا وہ مرکبات جنمیں الکحل کا جز شامل ہے یقیناً سمیت سے خالی نہیں اور وہ لوگ جو بادہ نوشی کے عادی ہوتے ہیں اپنی اولاد پر اسکا مہلک اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ جنون۔ مالیخولیا، اور اس قسم کے اکثر امراض کا خاص سبب یہی ہوتا ہے جو نسلاً بعد نسل عود کرتے رہتے ہیں۔ بچہ خاندانی افراد میں اضافہ کرتا ہے۔ خاندان کے مجموعہ کا نام نسل ہے اور نسلوں کی مجموعی قوتوں کو قوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا ایک بچہ کی ولادت سے قوم کا مستقبل تقویت پذیر ہو کر درخشاں ہو جاتا ہے اور اسی طرح اسکے مرگ ناگہاں سے قوم کو نقصان پہونچتا ہے اس سے قبل کہ ہم دوسرے عوامل بحیثیت مجموعی کسی قوم کے اعلی و ادنی مدارج دریافت کرنیکا صحیح معیار قایم کریں ہم بچوں کی تعداد ولادت اور اموات کے اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں متمدن دنیا کو فروغ علم کی برکات نے جو در پردہ نقصانات پہونچائے ہیں ان سب میں قابل الذکر نقصان یہ ہے کہ تہذیب و معاشرت کے انقلاب اور خود عملی مشاغل کے انہماک نے فضلائے روزگار کو تخلیقی نکتہ خیال سے معاشرت کی طرف رغبت دلائی ہے۔ اسکے متعلق ہر ملک نے

---

۱ ڈاکٹر ناظم پاگل خانہ انگلستان نے دماغی امراض کی تحقیقات کرتے ہوئے ایک موقع پر ظاہر کیا ہے کہ تین ہزار مریضوں میں سات سو پچاس مریض وہ تھے جنکی آپس میں قرابت تھی۔

ڈاکٹر ہیرن نے والدین اور اولاد کے اس تناسب کا اندازہ ۰ء۵۰ اور ۰ء۵۵ لگایا ہے۔

نئے اسباب پیدا کئے ہیں مگر ان سب کا نتیجہ فقدان نسل ہی ہے "فرانس" نے تصر محبت کے اس زندگی حقیقی ستونوں کو مسمار کر دیا جسکی بنا رشتہ شادی مستحکم و استوار کئے ہوئے تھا اُسنے اس آفتاب الفت کی طلائی شعاعوں کو زنجیر آتشیں گرفتہ تصور کیا اور اُسکی ظاہری قیود سے آزاد ہو کر عیاشی کی بنا ڈالی جسمیں بجز خاصہ حیوانی سکون دل، فلاح ذاتی اور قومی تقویت کا کوئی پہلو ہی نہیں نکلتا۔ امریکہ کے باشندوں کا رجحان اگرچہ رہبانیت کی جانب نہیں مگر جہانتک مسئلہ تخلیق کا تعلق ہے انکار دیا اسکے مخالف بھی نہیں ہے۔ بعض مقامات پر تناسب ذکور و اناث ٹھیک نہیں اور اسوجہ سے مسئلہ تخلیق میں قدرتی اسباب حائل ہیں۔ مثلاً آئرلینڈ میں تعداد ذکور اناث پر حاوی ہے اور انگلستان میں اس کے برعکس۔ افراد قوم کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے (۱) اعلےٰ (۲) متوسط (۳) ادنےٰ۔

انسانی طبقوں کے صحیح مدارج قایم کرنے میں صرف اس طبقے کے افراد کی تعداد ہی مد نظر نہیں ہوتی بلکہ ان افراد کی مجموعی قابلیت کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے بچہ کیا ہے؟ اپنی موجودہ قوم کے مستقبل کی ایک بولتی تصویر ہے۔ اس سے آپکو بچہ کی چھوٹی سی ہستی کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا بس یہی ضروری نہیں کہ قوم اپنے بچوں کو مرگ ناگہاں سے بچائے اور اسکی درازی عمر کے اسباب پر غور کرے بلکہ افراد قوم انکی تربیت پر کافی غور و خوض کریں اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ خود خصائل حسنہ پیدا کر کے اپنی آنیوالی نسلوں کو فطری طور پر انکا وارث دھقدار بنا ئیں۔ عام طور پر ولادت کی تعداد ادنےٰ طبقے میں زیادہ ہوتی ہے متوسط میں اس سے کم اور اعلیٰ طبقے میں سب سے کم۔ ادنیٰ طبقے کے افراد چونکہ حفظان صحت کا کما حقہ احساس نہیں رکھتے اور بوجہ افلاس ایسا کرنے پر مجبور بھی ہوتے ہیں لہذا انمیں نسبتاً تعداد اموات بھی زیادہ ہوتی ہے متوسط طبقہ حتی المقدور غذا اور ہالکف کا خیال رکھتا ہے مگر تربیت اور فطرت سے آشنا نہیں ہوتا پس اسکی نسلیں اعلےٰ طبقے پر غالب نہیں آسکتیں بلکہ اکثر انکا میلان طبع ادنےٰ طبقے ہی کی جانب ہوتا ہے۔ اگرچہ اعلےٰ طبقے میں اموات کم ہوتی ہیں مگر چونکہ تعداد ولادت بھی نسبتاً قلیل ہی رہتی ہے لہذا کوئی بین فرق مرتب نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل اسباب انسان کو عمر طبعی تک پہونچانے کے معاون ہیں۔

(۱) حفظان صحت۔ (۲) رہایش (۳) غذا (۴) ورزش جسمانی۔

جن ممالک نے مندرجہ بالا امور کی باقاعدہ پابندی کی ہے انمیں اموات کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے اور حادثات کے علاوہ وہاں کے باشندے اکثر عمر طبعی تک پہونچتے ہیں اب ہم نفس مضمون کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ عام طور پر تربیت کا زمانہ تاریخ ولادت کے بعد شمار کیا جاتا ہے حالانکہ یہ ایک

صریح غلطی ہو زمانہ تربیت آغاز حمل سے شروع ہوتا ہو اور جس زمانہ سے عموماً تربیت کی ابتدا شروع کی جاتی ہو وہ ابتدائی تربیت کے اختتام کا زمانہ ہوتا ہے۔ مثلاً عورت کی جذباتی کیفیات کا اثر یقیناً بچے کے جسم و دماغ پر مرتب ہوتا ہو اور وہ اپنے وجود کے ساتھ ان کیفیات کو عالم شہود مین لیکر آتا ہو نپولین بونپارٹ کو شہ اسواری اور محاربات سے بالطبع جو محض اس لئے تھی کہ زمانہ حمل میں اسکی ماں کو جلا وطنی کے سبب سپاہیانہ زندگی بسر کرنا پڑی تھی۔ تاریخ عالم کے زریں اوراق اس قسم کے نظائر سے مزین ہیں۔

بچے کی تربیت کا بہترین زمانہ قبل از ولادت ہی ہو کیونکہ وہی دماغی قویٰ کی ساخت کا وقت ہوتا ہے اور اسی زمانے میں جذباتی کیفیات کی فضا ویر دماغی ذرات میں منعکس ہوکر نقش کالحجر ہو جاتی ہیں۔ ولادت کے بعد بھی بچے پر تربیت نہایت موثر ثابت ہوتی ہو۔ تربیت و فطرت لازم و ملزوم ہیں صرف فرق اتنا ہو کہ فطرت مقدم اور تربیت موخر ہو۔ علی العموم بچے کی آنکھ کا رنگ باپ کی آنکھ کے رنگ سے مشابہ ہوا کرتا ہے۔ ظاہری اعضائے کی ساخت میں بھی مناسبت پائی جاتی ہو اور اسیطرح باطنی قوتوں میں بھی ہمرنگی ہوا کرتی ہو۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ محض علم ہی انسان کو اعلیٰ مدارج پر پہونچا سکتا ہو۔ علم فطری نقوش یا جبلی خصوصیات کو نمایاں کر دیتا ہو۔ امریکے کے جرائم پیشہ لوگوں کی اولاد حکمت و فلسفہ سے استفادہ حاصل کرکے انکے بیجا مصرف پر کربستہ ہو۔ یورپ کے قزاقوں نے وہ آلات ایجاد کئے ہیں جن سے وہ آن واحد میں فولادی صندوقچوں کو پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔ انکی حیرت انگیز عیاریاں عقل انسانی کو ششدر کر دیتی ہیں۔

بہرکیف اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم اور تربیت اچھی چیزیں ہیں۔ مانا کہ آہن پر ملمع کرنے سے سونے کے اوصاف نہیں پیدا ہو سکتے تاہم بظاہر اسکی قدر و منزلت ضرور بڑھ جاتی ہو اگر ان بچوں کو مناسب تربیت دیجائے جنہیں وراثۃً چند فطری عیوب موجود ہیں تو کم از کم انکی آیندہ نسل لامحالہ ان عیوب سے پاک ہو سکتی ہے

تعجب ہے کہ انسان کارآمد جانوروں کی نسل کو بے عیب رکھنا چاہتا ہو مگر اپنی نسل کی بہبودی کا اسکو مطلق احساس نہیں۔ گھوڑے اور کبوتر وغیرہ کی نسلوں کی حفاظت کیجاتی ہے انکے جوڑے ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ ملائے جاتے ہیں کہ انکے بچوں میں اعضا کا تناسب قایم رہے پھر کیوں انسان کی شادی اس لحاظ سے نہ کی جائے؟ اس موقع پر حسٹ کیم

سقراط کی اس تقریر[1] کا اقتباس بے محل نہوگا جو اس موضوع پر اسنے غلاقین سے کی تھی۔

سقراط - شادیاں کسطرح مفید ثابت ہوسکتی ہیں - میں تم سے یہ بات اسلئے دریافت کرتا ہوں کہ تم خوبصورت پرندے، شکاری کتے اور نایاب جانور اکثر پالتے ہو۔ ہاں مجھے یہ بتاؤ کہ تم انکو کیسے پالتے ہو اور انکے جوڑ کسطرح ملایا کرتے ہو؟

غلاقین - کن صورتوں میں؟

سقراط - صورتیں کیا معنی۔ مانا کہ وہ سب اچھے ہیں - مگر ایک کو دوسرے سے فوقیت نہیں دیسکتے۔

غلاقین - بیشک فوقیت دیجاتی ہے

سقراط - پھر کیا تم سب جانوروں سے یکساں نسل لینے کی کوشش کرتے ہو یا صرف اُن سے جو سب سے بہتر ہو

غلاقین - اِن جانوروں سے جو اپنی نوع میں سب سے بہتر ہوں۔

سقراط - تم اس کام کے لیے بچے منتخب کرتے ہو یا بڈھے یا صرف وہی جانور جو جوان ہوں؟

غلاقین - میں صرف جوانوں ہی میں سے منتخب کرتا ہوں۔

سقراط - اگر نسل لینے میں احتیاط نہ رکھی جائے تو تمھارے جانوروں کی نسلیں خراب ہوجائیں؟

غلاقین - لامحالہ۔

سقراط - اگر گھوڑے اور دوسری ذی روح ہستیوں پر بھی اسی اصول کی پابندی کی جائے تو کیا لازم آتا ہے؟

غلاقین - یہ نہیں - بلکہ نہایت مناسب۔

حکیم سقراط کی تقریر نہایت معقول اور معنی خیز ہے - جرائم پیشہ - زانی و بدکار لوگوں کو شادی کرنے کا کیا حق ہے کیا اُنکی شادیاں اسلئے کی جاتی ہیں کہ وہ اپنی اولاد کو ان عادات شنیعہ کا وارث بناکر ہمیشہ کے لئے دنیا کو نمونہ دوزخ بنائیں ؎

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ باآدمی بزرگ شود

خوش قسمت ہیں وہ افراد جو اپنی قوم میں اُن ناپاک ہستیوں کی نسل کے دشمن نہیں - پھر قوم کے ان افراد کو جو متعدی عوارض میں مبتلا ہیں اسوقت تک شادی کرنے کا کیا حق حاصل ہو جبتک

---

[1] دیکھو "سقراط" مؤلفہ مسٹر جیوٹ جلد سوم ترجمہ۔

اُنکو شفائے کلی نہ ہو جاسکے۔ بعض مہلک امراض ایسے ہیں جو خاندانوں میں نسلاً بعد نسلٍ عود کرتے رہتے ہیں اور انکے وجہ سے قوم کو بہ حیثیت مجموعی سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالتوں میں "مہر" کا انتخاب دوسرے خاندانوں سے کیا جا سکتا ہے تاکہ ان متعدی عوارض کا انسداد ہو سکے۔ امراض بکثرت ہیں اور ہر مرض کے دفعیہ کے لئے انتخاب کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔ قوم کے بدصورت، قلیل القامت اور نحیف افراد، خوبصورت طویل القامت، اور قوی الجثہ خاندانوں میں شادیاں کریں تاکہ آئندہ نسلوں کے رنگ صاف ہو جائیں اور انمیں اعضا کا تناسب قائم ہو۔ اگر فطرت و تربیت کے ساتھ ان اصول کی بھی پابندی کی جائے تو قوم کی سیرت و صورت میں پاکیزگی اور شرافت کے آثار جھلکنے لگیں اور صحت جسمانی و روحانی سے مستفید ہو کر قوم کے افراد کا کثیر حصہ دینی و دنیوی ترقی کی خوشگوار منازل طے کرتا ہوا عمر طبیعی کے پر سکون ساحل تک پہونچ جائے۔ علم التولید اقوام عالم کے مستقبل کو درخشاں بنانے کا ایک مفید ذریعہ تھا۔ اہل ہنود ایک زمانے میں اس علم میں کافی دستگاہ حاصل کر چکے تھے مگر افسوس زمانے کے ناقدردان ہاتھوں نے اسکو ذلیل ترین علم بنا دیا۔ شاید تخریب اخلاق کی جو تکلیف اس نے پیدا کی ہے وہ کسی اور علم میں نہ ملسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب علم التولید پر علم کا اطلاق بھی مشکل ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی اقوام نے اپنی اولاد کی تربیت پر کافی غور نہ کیا لہذا انکی خصائل کا رجحان رذالت کی طرف ہونے لگا حتیٰ کہ والدین کے خصائل ذمیمہ اولاد کی فطرت میں داخل ہو گئے۔

(محمود اسرائیلی)

تعلیمی گزٹ امرتسر

ملک کے مشہور اخبار نویس مسٹر رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی کے صاحبزادہ مسٹر ہر چند ہیرو چاند نے تعلیمی گزٹ نام سے ایک رسالہ جاری کیا ہے جسمیں علمی، ادبی، اخلاقی اور تعلیمی مضامین ہوتے ہیں۔ رسالہ قابل قدر ہے علمی و ادبی مضامین بلند پایہ معلومات سے لبریز اور دلچسپ اور تعلیمی مضامین عموماً عمدہ اور قابل قدر ہوتے ہیں ملک کو اس قسم کے رسائل کی سخت ضرورت ہے جو تعلیم کے اصول و فروع پر بحث کریں اور تعلیمی تجربات سے فائدہ اٹھانیکا موقع بہم پہونچائیں رسالہ کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے امید لگائی جاسکتی ہے کہ یہ رسالہ ترقی کریگا اور ناظرین میں قبولیت عام حاصل کریگا۔ سالانہ چندہ عہ ہے جو موجودہ گرانی اور سامان مطبوعات کی گرانی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ کاغذ سفید عمدہ لگایا جاتا ہے اور لکھائی چھپائی بھی بہتر ہوتی ہے۔

اطمینان قلب

آہ اطمینان قلب آجا دلِ ناشاد میں　　رو رہا ہوں اشک خوں مدت سے تیری یاد میں
ہائے کیوں آتا نہیں اس مضطرب آباد میں　　ہاں اثر باقی نہیں شاید مری فریاد میں

اے خوشا وقتیکہ تو رونق دہ کاشانہ تھا
محفل دل میں مثال ساقی خمخانہ تھا

باعث شادی نہیں سامانِ عیش افزا مجھے　　اور مسرت ہائے لایعنی کی حاجت کیا مجھے
احتیاج قوت و طاقت نہیں اصلا مجھے　　جسقدر چاہے تھکا دے وسعت صحرا مجھے

پر یہ لازم ہے کہ میری سعی کا حاصل ملے
یعنی اے لیلائے اطمیناں ترا محمل ملے

حرص جس دل میں ہو تو اس دلمیں آسکتا نہیں　　حکمرانی کا تخیل تجھکو پا سکتا نہیں
اور طلسم عیش تجھپر غالب آسکتا نہیں　　مختصر یہ، تیرا عقدہ کھولا جا سکتا نہیں

لطفہائے زندگی تیرے تبسم پر نثار
اسقدر للہ نہ رکھ زحمت کش صد انتظار

مرغزار شبنمی ہے تیری جائے دلنشیں　　نغمہ پیرا ہے جہاں ندی کی موج یاسمیں
آ نہیں سکتا تیری محفل میں کوئی دل حزیں　　ہاں یہی بزم طرب ہے تیری فردوس آفریں

تیرے ہم صحبت بہت خوش باش ہیں دلشاد ہیں
رنج سے غم سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہیں

واہ کیا عشرت فزا ہے یہ مقام پر بہار　　جس سا ہیں جسکے دامن پہ بہت سے آبشار
حاشیہ آرائی جسکی کر رہا ہے سبزہ زار　　ہو رہی ہے شام پر جسکی فدا صبح بہار

تیرے ملنے کی ہوس تھی اور تو مجھکو ملا
ماسوا جو کچھ تھا سب تجھپر نچھاور کر دیا

ہے دعا تجھکو نہ دیکھوں اب جدا ہوتا ہوا　　بیکسی میں تو دکھائی دے نہ خوں روتا ہوا
دشت حرماں میں نہ آوارہ ہو غم سہتا ہوا　　نرغۂ حسرت سے نظر آئے نہ تو گستا ہوا

رخصت اے دلسوز اے یار طریقت الوداع
الفراق اے ہمدم اے کانِ مروت الوداع

محمد یحییٰ۔ اشہر

زبان حال

طرز خاموشی نوا سنج اور پھر خاموش ہوں
پردۂ مینا میں گویا بادۂ سرجوش ہوں

فردہ اے ننگ ہوس کا دی کہ پاس وضع ہے
رخصت اے ناموس خود داری کہ میں بیہوش ہوں

یاد ساقی کیا ہو بزم افروز عیشِ بیخودی
کشمکش افسردۂ کلفت سرائے ہوش ہوں

دل مستغل کو مبارک لذت مستی کہ میں
محو ذوق نیش ہوں ناآشنائے نوش ہوں

سعی بیداری عبث اے انقلاب روزگار
غافل صبح ازل وقف خمار دوش ہوں

دولت باقی ہو شوق دید میں کسب فنا
حلقۂ چشم ہما بینے تیرا آغوش ہوں

نالہ کرتے کرتے اشک آنکھوں میں بھر کر بہ گیا
کیا فراغت ہر کرا لذت گیر تاب ورزش ہوں

سحر کاری اے رنگ آمیزی فطرت نیرنجہ
خار زار عبرت ہستی ہوں اور گلپوش ہوں

کچھ تو ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ آنکھیں کھل گئیں
کچھ تو ان کانوں سے سنتا ہوں کہ یوں خاموش ہوں

اک طلسم بند و بست دل ہی نیرنگ مجاز
کھل نہیں سکتی حقیقت کیا حقیقت گوش ہوں

حال عبرت زا ہوں اور ناکام چشم اعتبار
آہ درد آلود ہوں اور نارسا ئے گوش ہوں

تو اگر ہے بے نیاز شکوہ بیداد ناز
میں بھی ضبط درد کا اک پیکر خاموش ہوں

حضرت عباس آج رنگ دور صہبا دیکھئے
کہہ رہی ہے چشم ساقی ساغر سرجوش ہوں

ابو المصور عباس قریشی انصاری

خواب مدینہ

باغ میں کس گل رعنا کی سواری آئی
غل ہوا چار طرف فصل بہاری آئی

بلبل و قمری کی آواز وہ پیاری آئی
غنچے دل کھل گئے کھلنے کی باری آئی

پھول پھولے ہوئے شاداب نظر آتے ہیں
موتیا کیا دُرِ خوش آب نظر آتے ہیں

بوئے گل ساتھ لئے اپنے ہوا چلتی ہے　　آج اٹھلاتی ہوئی باد صبا چلتی ہے
محتسب کی نہ یہاں پیش ذرا چلتی ہے　　ساتھ مے نوشوں کے ہر وقت گھٹا چلتی ہے
حکم ہے یہ کوئی ہشیار نہ رہنے پائے
حال اس بزم کا اوروں سے نہ کہنے پائے

ساقیا بادہ گلفام پلا دے مجھکو　　بارہ دریائے سخاوت کی دکھا دے مجھکو
تیرے قربان سیہ مست بنا دے مجھکو　　مئے جو باقی نہو تلچھٹ ہی ذرا دے مجھکو
وہ چڑھے نشہ کہ آنکھیں مری مینا ہو جائیں
محو نظارۂ حسنِ شہ مینا ہو جائیں

یارو اگر مری قسمت کی رسائی دیکھو　　در جاناں پہ مری ناصیہ سائی دیکھو
فیضِ ساقی نے نئی شکل دکھائی دیکھو　　بڑے دربار میں قسمت مجھے لائی دیکھو
کیا کہوں اپنی ان آنکھوں سے ہو کیا کیا دیکھا
جو کسی نے نہیں دیکھا تھا وہ جلوا دیکھا

نور کا سارا بدن نور کا ٹکا چہرا　　خوش نما صانع قدرت نے بنایا چہرا
واہ دیکھا نہ سُنا آجتک ایسا چہرا　　کھپ گیا دل میں مرے چاند سا پیارا چہرا
اُس شہ حسن کا حوریں جو سراپا دیکھیں
وہ قدم چھوڑ کے پھر منھ نہ کسیکا دیکھیں

جلوہ گر حلقۂ اصحاب میں شاہ دیں جاہ　　چار سو نور فشاں جیسے ستاروں میں ہو ماہ
سر جھکائے ہوئے صف بستہ فرشتوں کی سپاہ　　بزم وہ نور سے معمور کہ سبحان اللہ
مرحبا صلِ علےٰ حسن جمال حضرت
مجھ گنہگار کا منھ اور وصال حضرت

پوچھا کیا عرش الٰہی ہے؟ کہا نگینا ہے یہی　　بے شگفتہ چمن خلد قرینا ہے یہی
بولا رضواں کہ مودب ماہ[1] مدینا ہے یہی　　بحر عصیاں سے جو گذرے سفینا ہے یہی

[1] کنایہ شاہ ولا ... امیر مینا ... [illegible]

بعد الحمد در رحمت رحماں اینجا ست
کوثر اینجا چمن روضۂ رضواں اینجا ست

میکشوں پر مرا انداز نہ کھلنے پائے   سوز معلوم ہو ساز نہ کھلنے پائے
دل کے اندر ہی رہے راز نہ کھلنے پائے   طائر فکر کی پرواز نہ کھلنے پائے

جاگ اٹھا بخت جو امید بر آئی میری
اے رسا ہو گئی طیبہ میں رسائی میری

سید شاہ محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی

خودی

(تعمیر ذات)

جسد ہے نیام اور خنجر خودی ہے   اگر تیغ ہے یہ تو جوہر خودی ہے
صدف بحر ہستی کا گر اسکو کہیے   تو اس میں نہاں ہے جو گوہر خودی ہے
چلن جسکا بازار ہستی میں دیکھا   گرانقدر وہ سکۂ زر خودی ہے
خودی ہی تو ہے کیمیائے سعادت   کہیں جسکو گوگرد احمر خودی ہے
مقاصد کے اصنام ہیں جسکے مشغول   وہ بت گر خودی ہے وہ آزر خودی ہے
ہمائے سعادت کو ہے ناز جس پر   وہ بازو خودی ہے وہ شہپر خودی ہے
کہیں خضر جس کو رہ ارتقا کا   وہ ہادی کامل وہ رہبر خودی ہے
اشارہ ہے جسکی طرف من عرفنا[۱] میں   وہی چیز اے بندہ پرور خودی ہے

امیں تو بلا خوف تردید کہدے
حقیقت میں بخت سکندر خودی ہے

امین حزیں

---

[۱] من عرف نفسہ عرف ربہ۔

غزلیات

حضرت محشر لکھنوی

چھیڑ نے حسن و عشق کی دل کو عجب مزا دیا
ہمنے اُسے ہنسا دیا اُسنے ہمیں رُلا دیا

جور فلک سے اتنے ہم ایسے شکستہ دل ہوئے
پاس گئے جسکو مہرباں قصۂ غم سنا دیا

زور نظر سے خود بخود بند نقاب کھل گئے
جوش تبسم شوق کا ہم نے انھیں دکھا دیا

حسن کے رمز باطنی کس سے ہیں یہ دم کہ پوچھ لے
شعلۂ برق ناز نے طور کو کیوں جلا دیا

تیرے شہید ناز کا رہ نہ سکا مزار بھی
نقش قدم کی شکل سے رہروں نے مٹا دیا

اہل نظر کے جذب سے جبکہ قیامت آ چکی
پردہ حریم ناز کا یار نے خود اُٹھا دیا

مشق خرام ناز میں بیخود و مست یوں ہوئے
قبر شہید عشق کا نام و نشاں مٹا دیا

اٹھ کے آہ کی اگر منھ پہ اُڑیں ہوائیاں
طاقت دل تھی جب کبھی درد نے بھی مزا دیا

نقش جہاں کی ہست و بود نقش بر آب کیوں نہو
اپنی خوشی بنا دیا اپنی خوشی مٹا دیا

پرسش جور ناروا ہو کے رہیگی ایک دن
ناز نہ تھا تو جان جان ہمنے تمھیں جتا دیا

آپکی ہوگئی خوشی خوں ہوا ہمارا دل
پر بھی ہے دل لگی کوئی بات کی اور رلا دیا

حسن کے معجزات کا لاؤں گا دل سے اعتقاد
سوئے ہوئے نصیب کو تم نے اگر جگا دیا

لے لیا نام ہجر کا جاؤ خدا بھلا کرے
بیٹھے بٹھائے خون کے آنسوؤں سے رلا دیا

لی ہیں بہت جمائیاں بارہ فرد شعر کے حضور
محشر ادھر بھی اک نظر حسن طلب نے کیا دیا

ریویوز

سلسلہ حالات نظربندان اسلام - انجمن اعانت نظربندان اسلام دہلی نے نظربندان اسلام کے حالات کی اشاعت کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے اسوقت تک اس سلسلے کے تین نمبر شائع ہو چکے ہیں جنمیں سے مسٹر محمد علی و شوکت علی کی والدہ محترمہ کے خطوط اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کی مختصر سوانح اور حالات اسیری ہمارے پاس بغرض ریویو پہنچے ہیں۔ ان رسائل کے متعلق کسی طویل رائے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ رسائل ان بندگان دیانت شعاران اسلام کے حالات اسیری پر مشتمل ہیں جن کی نظربندی سے دنیائے اسلام نہ صرف غمگین بلکہ مضطرب و بےچین ہے۔

انجمن اعانت نظربندان اسلام کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلۂ اشاعت سے نہ صرف یہ کہ مسلمانان ہند اپنے نظربندوں کے حالات سے واقف ہونگے ایک بڑا فائدہ یہ بھی حاصل ہوگا کہ نظربندان اسلام کی ہمدردی و اعانت کا جذبہ قلوب میں بڑھیگا اور قومیت کے احساس میں مفید اضافہ ہوگا۔

حالات نظربندان اسلام کا پہلا نمبر ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مسٹر محمد علی و شوکت علی کی والدہ محترمہ نے اپنے بیٹوں کی نظربندی کے متعلق مسٹر سبرامنی [illegible] مسز اینی بیسنٹ اور مسٹر [illegible] کے نام لکھے ہیں ایک خط مسٹر گاندھی کا مسز بیسنٹ کے نام اور وہ بیان ہے جو آبادی بانو بیگم صاحبہ والدہ محترمہ مسٹر محمد علی و شوکت علی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں پڑھا تھا اور وہ بیان جو سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر کی ان شرائط پر آبادی بانو بیگم صاحبہ نے دیا تھا جو گورنمنٹ نے مسٹر محمد علی و شوکت علی کی آزادی کے متعلق پیش کی تھیں۔ یہ مجموعہ ہر طرح قابل قدر ہے اور ہر ایک مسلمان کے مطالعہ کے قابل شروع میں مسٹر محمد علی و شوکت علی کی تصاویر عمدہ آرٹ پیپر پر دیگئی ہیں قیمت صرف ۳ ہے جو آجکل سامان مطبوعات کی گرانی میں لاگت سے بہت کم ہے۔ تیسرا نمبر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کی سوانح اور حالات پر مشتمل ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مولانا کی زندگی بالکل مذہبی زندگی ہے اور سیاسیات سے مولانا کی زندگی کو ذرہ بھر تعلق نہیں۔

اس رسالہ میں مولانا کی نظربندی کے وہ وجوہ و اسباب بھی بتلائے ہیں جنکی بناء پر گورنمنٹ نے انکو نظربند کیا ہے۔ مولانا مدظلہ العالی جیسے فرشتہ خصلت اور صاحب باطن بزرگ کی نظربندی کے اصل حالات بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں اور طرح طرح کی افواہیں اس خصوص میں پھیلی ہوئی ہیں اہل اس رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مولانا کی نظربندی کے وجوہ اور اسباب کیا ہیں رسالہ میں

مولانا کا مالٹے سے آیا ہوا ایک خط بھی نقل کیا گیا ہے جس سے مولانا کی موجودہ حالت کا اندازہ ہوگا اس رسالہ کی قیمت ۴ر ہے۔

یہ کام نظربندانِ اسلام کی امداد و اعانت ہے اسلئے ہر ایک مسلمان کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ نظربندانِ اسلام کے حالات کو پڑھے اور انکی مالی امداد میں بقدرِ وسعت حصہ لے۔

یہ رسائل مسٹر تاج الدین سپرنٹنڈنٹ صدر دفتر انجمن اعانت نظربندانِ اسلام کھیڑی دہلی سے ملینگے

دیوان حسرت موہانی۔ دو سال سے زیادہ ہوئے کہ حسرت موہانی نظربند کئے گئے اور پھر بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے دو سال کی سزائے قید میں مبتلا ہیں۔ اس عرصہ میں انکی بیگم بھی طرح طرح کی آفات میں مبتلا ہوئیں۔ گذشتہ ششماہی میں حسرت موہانی کی سودیشی اشیاء کی دوکان میں چوری ہوئی اور کئی ہزار روپیہ کا مال نامعلوم چور نکال لیگئے اسپر بھی بیگم حسرت نے شکر کیا اور کبھی کسی سے اُن کی غیور طبیعت نے امداد کی خواہش نہیں کی اور نہ صرف یہ بلکہ لوگوں کی امداد و اعانت کو اُنھوں نے قبول نہیں کیا"

خدا کا شکر ہے کہ چھ ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد بیگم صاحبہ اب اسپر رضی ہوئی ہیں کہ قوم حسرت موہانی کا وہ قرضہ ادا کرے جو مال کی چوری سے اُن پر واجب ہوگیا ہے اور اس کے معاوضہ میں اُنھوں نے حسرت موہانی کے چوتھے دیوان کا حق تصنیف انجمن اعانت نظربندانِ اسلام کے نذر کیا ہے۔ حسرت موہانی کے ذمہ تین ہزار روپیہ کا قرضہ ہے جسکی ادائگی کی یہ صورت قرار دیگئی ہے کہ ہمدردانِ اسلام حسرت موہانی کا چوتھا دیوان تین روپیہ ادا کر کے حاصل کریں اور اس طرح دیوان کی ایک ہزار کاپیاں فروخت کر کے قرضہ ادا کر دیا جائے۔

ہم تمدن کے خریداروں سے عموماً اور مسلمانانِ ہند سے خصوصاً نہایت پر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس کارِ خیر میں حصہ لیں اور تین روپیہ بذریعہ منی آرڈر انجمن اعانت نظربندانِ اسلام دہلی کی خزانچی مسٹر عبدالعزیز بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ وکیل دہلی کے نام بھیجکر حسرت کا دیوان خرید لیں اس کام میں جسقدر عجلت ممکن ہو کرنی چاہیئے معلوم ہوا ہے کہ حسرت موہانی نے جو اب قید سے آزاد ہو کر کھٹوہ ضلع میرٹھ میں مقیم ہیں یہ اطلاع دی ہے کہ جو صاحب انکا دیوان چہارم بطور امداد تین روپیہ میں خرید فرمائینگے وہ اپنی دوسری تصنیف کردہ کتابیں بھی اُن کی نذر کرینگے جو ایام قید میں اُنھوں نے لکھی ہیں اس صورت میں دیوان کی خریداری میں کوئی مالی نقصان بھی نہیں رہے گا اور اعانت کا ثواب علیحدہ ملیگا۔

حکیم عبد القوی صاحب لکھنوی

کی مجرب دوائیں جو صرف دواخانہ مخزن الادویہ ہی سے مل سکتی ہیں۔ ان کے استعمال سے سیکڑوں آدمیوں کو فائدہ ہو چکا

معجون نشاط سستی اور کاہلی کو دور کر کے چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے اور فرحت دیتی ہے فی تولہ ۸ر خوراک ۲ ماشہ پاؤ بھر یا کم بیش گائے کے دودھ کے ساتھ بہت جلد فائدہ محسوس ہوگا۔

سفوف سوزاک کہنہ پرانے سوزاک کے لئے بشرطیکہ مجاری بول میں بدگوشت نہ پیدا ہو گیا ہو نہایت فائدہ مند ثابت ہوا ہے فی تولہ ۴ر خوراک ۲ ماشہ پاؤ بھر گائے کے دودھ میں پاؤ بھر پانی ملا کر اوپر سے پی لیا جائے۔

سفوف درد معدہ و قولنج ریاحی اور بلغمی درد معدہ و قولنج کو جو دورہ سے ہوا کرتا ہے یا ناگہانی طور پر یکایک ہو جائے فوراً زائل کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے فی تولہ ۴ر خوراک ۲ ماشہ درد کے وقت تھوڑے سے پانی میں یا سونف کے عرق کے ساتھ فہرست دواخانہ مفت طلب کیجئے۔

تمام جلدی بیماریوں کھجلی، پھوڑا، پھنسی، گلٹی، داد، آتشک کے زخم وغیرہ کے لئے بے مثل دوا ہے

سنبر مرہم لگانے سے چوٹ اور چھینٹے وغیرہ کی تکلیف کو بہت جلد رفع کرتا ہے فی ڈبیہ [illegible]

مخزن الادویہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ

رینالڈس کے بہترین ناول

مسٹریز آف لنڈن

کا اردو ترجمہ آٹھ جلدوں میں قیمت صرف سات روپیہ علاوہ محصول

عجیب ... عبرت بخش

رانوں کی ... داستان

لال ... پبلشر و ... الہ آباد

اشتہار کتب قابل دید

دیوان غالب مع شرح دیباچہ و مقدمہ از حسرت موہانی ۱۲ر

انتخاب اردوئے معلیٰ یعنی رسالہ اردوئے معلیٰ کے دس جلدوں کے بہترین مضامین کا انتخاب مجلد قابل دید قیمت ۱۲ر

منتخب امیر مینائی یعنی امیر احمد مینائی مرحوم کے کلام کا انتخاب مع دیباچہ مقدمہ و تصویر و حالات ... ۱۲ر

دیوان حسرت موہانی (۱) حصہ اول ... (۲) حصہ دوم ... (۳) حصہ سوم ... کلام جدید (۴) کلیات ... بالکل نیا چھپا ہے ...

ملنے کا پتہ: منیجر حسرت موہانی دفتر اردوئے معلیٰ علیگڈھ

تمدن جلد ۹ نمبر ۱ ۵۔۳۰ مئی ۱۹۱۸ء

تمدن جلد ۹ نمبر ۱